سہ ماہی

علمی و تحقیقی مجلّہ

27

نورِ معرفت

☆اداریہ
☆عشق کی سلطنت
☆وجوہِ اعجازِ قرآن اور نظریۂ صرفہ
☆والدین کے ساتھ نیکی، روح کی پرواز
☆پاکستان میں دہشت گردی کے محرکات
☆حروف مقطعات مختلف آراء کا تجزیاتی مطالعہ
☆قرآن کی نظر میں دینی ثقافت کا مقام اور اہمیت
☆اسلام کا عادلانہ نظام یا معاشرتی عدل انصاف
☆نہج البلاغہ میں اصول احادیث اور احادیث رسولؐ
☆اسلامی اور مغربی تعلیم و تربیت کے فلسفی مبانی
☆قرآن وسنت میں اضطراب سے مقابلے کے طریقے

لازوال نصائح

مَنْ أَصْبَحَ عَلَى الدُّنْيَا حَزِيناً فَقَدْ أَصْبَحَ لِقَضَاءِ اللهِ سَاخِطاً وَ مَنْ أَصْبَحَ يَشْكُو مُصِيبَةً نَزَلَتْ بِهِ فَإِنَّمَا يَشْكُو رَبَّهُ وَ مَنْ أَتَى غَنِيّاً فَتَوَاضَعَ لَهُ لِغِنَاهُ ذَهَبَ ثُلُثَا دِينِهِ وَ مَنْ قَرَأَ الْقُرْآنَ فَمَاتَ فَدَخَلَ النَّارَ فَهُوَ كَانَ مِمَّنْ يَتَّخِذُ آيَاتِ اللهِ هُزُواً وَ مَنْ لَهِجَ قَلْبُهُ بِحُبِّ الدُّنْيَا الْتَاطَ قَلْبُهُ مِنْهَا بِثَلَاثٍ هَمٍّ لَا يُغِبُّهُ وَ حِرْصٍ لَا يَتْرُكُهُ وَ أَمَلٍ لَا يُدْرِكُهُ۔

یعنی: ”جو دنیا کے لیے اندوہناک ہو وہ قضا و قدر الٰہی سے ناراض ہے اور جو اس مصیبت پر کہ جس میں مبتلا ہے شکوہ کرے تو وہ اپنے پروردگار کا شاکی ہے اور جو کسی دولت مند کے پاس پہنچ کر اس کی دولتمندی کی وجہ سے جھکے تو اس کا دو تہائی دین جاتا رہتا ہے اور جو شخص قرآن کی تلاوت کرے اس کے باوجود مرنے کے بعد دوزخ میں داخل ہو تو اس کا شمار اُن لوگوں میں ہوگا، جو اللہ کی آیتوں کا مذاق اڑاتے ہیں اور جس کا دل دنیا کی محبت میں وارفتہ ہو جائے تو اس کے دل میں دنیا کی یہ تین چیزیں پیوست ہو جاتی ہیں؛ ایسا غم کہ جو اس سے جدا نہیں ہوتا اور ایسی حرص کہ جو اس کا پیچھا نہیں چھوڑتی اور ایسی آرزو کہ جو بر نہیں آتی۔“

(نہج البلاغہ، کلمات قصار ۲۲۸)

بسم الله الرحمن الرحيم

اہل قلم سے اپیل

سہ ماہی "نور معرفت" ایک علمی و تحقیقی جریدہ ہے۔ یہ جریدہ ملک کے اعلی تعلیم یافتہ طبقہ کی علمی پیاس بجھانے کے لئے شائع کیا جارہا ہے۔ یہ جریدہ یونی ورسٹیوں اور دینی مدارس کے اساتذہ اور طلاب کا اپنا جریدہ ہے۔ جہاں اس جریدے کا ہدف عامۃ الناس کو علم کی ضیاء پاشیوں سے منور کرنا ہے، وہاں اس کا ایک اہم ہدف، دینی مدارس اور یونی ورسٹیوں کے اساتذہ اور طلاب کے درمیان علمی و تحقیقی شوق و جستجو پیدا کرنا اور ان کے زور قلم کو مزید نکھارنا بھی ہے۔ اس حوالے سے یہ جریدہ ہر دین دار عالم و دانشور کے علمی اور قلمی تعاون اور ان کے قیمتی مشوروں کا محتاج ہے۔ اس جریدے میں علوم قرآن و حدیث، فقہ و اصول فقہ، کلام و فلسفہ؛ اسلامی تاریخ، تقابل ادیان، تعلیم و تدریس، ادبیات، معاشیات، عمرانیات، سیاسیات، اقبالیات، ثقافت و تمدن، قانون و اصول قانون وغیرہ پر اسلامی نقطہ نظر سے مقالات کے علاوہ علمی کتابوں پر تبصرے شایع کئے جاتے ہیں۔ لہٰذا ہماری اپیل ہے کہ اپنی گرانقدر علمی آراء، تحقیقات اور نگارشات اس جریدہ کو ارسال کریں۔

چند ضروری ہدایات

- مقالہ نگار حضرات سے درخواست ہے کہ اپنے تحقیقی مقالات مدیر نور معرفت کے نام ارسال کریں۔
- بہتر ہے کہ مضمون کمپوز شدہ ہوں اور ان کی ضخامت بیس /پچیس صفحات سے زائد نہ ہو۔ ممکن ہو تو مضمون کی سافٹ کاپی بھی ارسال کریں یا مدیر کے ای۔ میل پر ارسال کی جائے۔
- ترجیحی بنیادوں پر ایسے موضوعات پر تحقیق کی جائے جو ادارہ دے۔
- حواشی اور حوالہ جات کے لئے اصلی مآخذ اختیار کریں اور مضمون کے آخر میں اس ترتیب سے لکھے جائیں: **کتاب کا نام؛ مصنف کا نام؛ پبلشر کا نام؛ سن طباعت؛ جلد؛ صفحہ نمبر۔**
- نور معرفت میں شائع شدہ مقالات کسی اور جگہ طبع کرانے کی صورت میں مجلّہ ہذا کا حوالہ دینا ضروری ہے۔
- مجلّہ، مقالات کی ادبی، فنّی اور ظاہری آرائش اور عبارتوں کی تہذیب کا حق رکھتا ہے۔
- ادارے کا مقالہ نگار کی تمام آراء سے متفق ہونا ضروری نہیں؛ لہٰذا مجلّہ ارسال شدہ مقالات کی علمی آرائش اور تہذیب کا حق بھی رکھتا ہے۔

Declaration No: 7334
ISSN 2221-1659

سہ ماہی

علمی و تحقیقی

نور معرفت

جلد: ۶
صفر المظفر
تا
ربیع الثانی
۱۴۳۶ھ
بمطابق
جنوری تا مارچ
2015
شمارہ: ۱

مدیر اعلی
سید حسنین عباس گردیزی

مدیر
سید رمیز الحسن موسوی

مجلس ادارت

- ڈاکٹر شیخ محمد حسنین
- ڈاکٹر ساجد علی سبحانی
- ڈاکٹر سید راشد عباس
- ڈاکٹر کرم حسین ودھو
- ڈاکٹر علی رضا طاہر
- سید علی مرتضیٰ زیدی
- سید ثمر علی نقوی
- روشن علی

کمپوزنگ و ڈیزائننگ: بابر عباس

پرنٹر: پکٹوریل پریس، آبپارہ، اسلام آباد

قیمت فی شارہ 130 روپے
زرِسالانہ 500 روپے
زرِسالانہ 150 ڈالر امریکہ، کینیڈا، یورپ
زرِسالانہ 070 ڈالر مڈل ایسٹ

نور الہدیٰ مرکز تحقیقات، نور الہدیٰ ٹرسٹ، محلہ سادات، بارہ کہو اسلام آباد
www.nmt.org.pk | www.nht.org.pk
E-MAIL: NOOR.MARFAT@GMAIL.COM

نوٹ: ادارے کا مقالہ نگار کی تمام آراء سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

فہرست

نمبر شمار	موضوع	مؤلف	صفحہ
۱	اداریہ	مدیر	۵
۲	وجوہ اعجاز قرآن اور نظریۂ صرفہ	سید محمد علی موسوی	۹
۳	حروف مقطعات (۳) مختلف آراء کا تجزیاتی مطالعہ	ثاقب اکبر	۱۷
۴	قرآن کی نظر میں دینی ثقافت کا مقام اور اہمیت	سید رمیز الحسن موسوی	۲۷
۵	اسلام کا عادلانہ نظام یا معاشرتی عدل وانصاف	سید حسنین عباس گردیزی	۵۱
۶	نہج البلاغہ میں اصول احادیث اور احادیث رسول ﷺ	روشن علی	۷۱
۷	(قرآن وحدیث کی روشنی میں) اضطراب سے مقابلے کے طریقے (۱)	سید عقیل حیدر زیدی	۸۹
۸	اسلامی اور مغربی تعلیم وتربیت کے فلسفی مبانی	سید علی جواد ہمدانی	۱۱۳
۹	والدین کے ساتھ نیکی، روح کی پرواز	سید فہیم عباس	۱۴۳
۱۰	پاکستان میں دہشت گردی کے محرکات اور ذرائع ابلاغ کا تنزویراتی کردار	محمد ریاض	۱۵۵
۱۱	عشق کی سلطنت	ڈاکٹر شیخ محمد حسنین	۱۷۷

اداریہ

الحمد للہ ! نور معرفت کی باقاعدہ اشاعت کا پانچواں سال مکمل ہو چکا ہے اور چھٹے سال کا پہلا شمارہ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے۔ نور معرفت کے وجود میں آنے کا سب سے اہم مقصد اردو زبان کے تحقیقی اور علمی حلقوں میں قرآن اور اہل بیت اطہار علیہم السلام کی تعلیمات کو پیش کرنا ہے۔ مکتب اہل بیت اطہار علیہم السلام کی علمی ترجمانی کرنا نور معرفت کی ٹیم اپنی سب سے بڑی ذمہ داری سمجھتی ہے۔ گذشتہ چند سالوں کے دوران ہماری ٹیم اس ذمہ داری کو نبھانے میں کتنی کامیاب ہوئی ہے، اس کا بہتر فیصلہ علمی ذوق رکھنے والے ہمارے قارئین ہی کر سکتے ہیں۔

آج جن حالات سے عالم اسلام گذر رہا ہے ان میں اسلام کے دشمن، مسلمانوں کے درمیان ہم آہنگی اور یکجہتی کو ختم کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ ایک عرصے سے علمی اختلاف رائے کو عامۃ المسلمین کے درمیان جنگ وجدال کا وسیلہ بنایا جاتا رہا ہے، جس کے نتیجے میں لاکھوں فرزندان توحید کی جانیں قربان ہو چکی ہیں اور مزید جانیں جانے کا قوی اندیشہ موجود ہے۔ اس وقت انہی فرعی اختلاف کی بنیاد پر داعش جیسے خونخوار گروہوں کو وجود میں لایا گیا ہے۔ ہمارا عزیز وطن پاکستان بھی عالمی دہشت گردی کا شکار ہے اور پوری قوم کا سکون و چین ختم ہو چکا ہے۔ ان حالات میں ہماری نظر میں بین المسالک ہم آہنگی اور یکجہتی پیدا کرنے کا سب سے اہم راستہ علمی گفتگو اور تحقیقی طریقہ کار ہے۔ لہٰذا معارف کی دنیا میں تعصب اور عناد کی عینک لگائے بغیر قدم رکھنا اور نئی نسل کو دلیل و برہان کے ساتھ اسلام کی تعلیمات سے آگاہ کرنا ہمارا سب سے بڑا مقصد ہے۔

بد قسمتی سے اسلام کے نام پر اسلام کا اس قدر استحصال کیا گیا ہے کہ تکفیری دہشت گردوں کے حامی بھی بغلیں جھانکتے ہوئے نظر آرہے ہیں۔ اگرچہ پشاور آرمی سکول کے مظلوم بچوں کے خون نے پوری قوم میں دہشت گردی کے خلاف ہم آہنگی اور یکجہتی کی فضا قائم کی ہے اور وقتی طور پر حکمران بھی اس فضا سے متاثر ہوئے ہیں۔ جس کے نتیجے میں دہشت گردی کے خلاف اقدامات کو حتمی شکل دینے کے لئے فوج کو اپنا کردار کرنے کا قانونی حق دیا گیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود ملک میں موجود دہشت گردوں کے نظریاتی

ہمدرد اس عمل میں روڑے اٹکانے کی سعی کر رہے ہیں۔ جس کی وجہ سے دہشت گردی کے خلاف ملکی سطح پر آپریشن کا عمل متاثر ہوا ہے اور سزا یافتہ دہشت گردوں کی پھانسیوں کو ترجیح دینے کے بجائے عام ملزموں کو سزائیں دی جارہی ہیں۔ نتیجہ یہ کہ دہشت گرد عناصر ایک بار پھر متحرک ہو کر شکار پور، پشاور، اسلام آباد اور لاہور کی مساجد، امام بارگاہوں اور گرجا گھروں میں خون خرابہ کر چکے ہیں۔

پاکستان میں پچھلی پینتیس سالہ سیاسی غلطیوں کی وجہ سے دہشت گردی کی جو جڑیں پھیلی تھیں اور جنہیں اُکھاڑنے کے لئے فوجی آپریشن کرنے اور عدالتیں قائم کرنے کی تگ ودو کی جارہی ہے۔ اب ایک بار پھر اُسی جیسی ایک اور غلطی کیے جانے کا ماحول پیدا ہو چکا ہے۔ یمن پر آل سعود کی مسلط کردہ جنگ اور اس جنگ میں کودنے کی ہماری حکومت کی تڑپ، ماضی کی غلطیوں سے کہیں زیادہ سنگین غلطی ثابت ہو گی۔ دنیا جانتی ہے کہ شام میں امریکی واسرائیلی مفادات کی تکمیل کی خاطر دہشت گردانہ جنگ میں آل سعود کے منافقانہ کردار کے فاش ہونے اور شکست کھانے کے بعد اب یمن میں دہشت گردی کے لئے آل سعود کو براہ راست کردار سونپا گیا ہے۔ مشرق وسطی کو ناامن بنانے کے اس پلان میں چند دوسری عرب حکومتوں کی طرح آل سعود بھی خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ وہ اپنی جارحیت کے ذریعے یمنیوں کو رام کرلیں گے اور علاقے میں سامراج مخالف تحریک کو دبا کر چند سال مزید بادشاہت کے مزے لے سکیں گے۔ لیکن ایسا ہوتا دکھائی نہیں دیتا کیونکہ اس بار حوثی قبائل برسوں کی نظریاتی اور عسکری تربیت کے ساتھ انصار اللہ کے نام سے جلوہ گر ہوئے ہیں اور انہیں رام کرنا آسان نہ ہوگا۔

خلاصہ یہ کہ اس جنگ کے سلسلے میں پاکستانی حکومت کی آزمائش خاصی بصیرت وسیاسی تدبر کی متقاضی ہے۔ لیکن بدقسمتی سے پاکستانیوں کی روایتی جذباتیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس بار بھی سیاسی وتاریخی مغالطات کے ذریعے آل سعود کی جارحیت کو جواز بخشنے کے لئے رائے عامہ ہموار کرنے کی سعی کی جارہی ہے اور یمنی عوام کے خلاف آل سعود کی جارحیت کو تقدس کا رنگ دینے کے لئے سب سے پہلے اس جنگ کو حرمین شریفین کے تحفظ کی جنگ قرار دیا جارہا ہے۔ حالانکہ اس جنگ کا اصل محرک امریکہ اور اسرائیل ہیں اور یہ جنگ یہودیوں کے مفادات کی جنگ ہے اور اس جنگ میں پاکستان کی شمولیت یقیناً سیاسی وعسکری خودکشی کے مترادف ہے۔ شاید ہم افغانستان کی جنگ میں امریکہ کی حمایت کے گناہ کا ازالہ دہشت گردی کے خلاف

جاری موجودہ آپریشن سے کرلیں، لیکن یمنی مسلمانوں کے بے گناہ خون کا حساب نہ دے سکیں۔ لہٰذا ہمارا موٴقف یہ ہے کہ ہمارے ملک کے سیاستدان دانش مندی سے کام لیں اور اپنے آپ کو یمن کی جنگ میں اُلجھانے کی بجائے پوری توجہ ملک سے دہشت گردی کے جراثیم ختم کرنے پر مبذول کریں۔

ہمارا خیال ہے کہ پاکستان میں دہشت گردی کو ختم کرنے کے لئے فوجی آپریشن اور سزاوں پر عمل درآمد بھی ہونا چاہیے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ نظریاتی اور فکری سطح پر اسلام کی غلط تصویر پیش کرنے والے عناصر کی حوصلہ شکنی بھی ضروری ہے، جس کے لئے اسلام کی حقیقی اور درست تصویر پیش کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ البتہ یہ سنگین ذمہ داری علمائے دین، اسلامی تعلیمات سے آگاہ دانشوروں اور اہل قلم پر عائد ہوتی ہے۔ اگر اہل قلم اور علمائے دین اسلام کی قرآن وسنت سے ماخوذ حقیقی تعلیمات پیش کرنے کا اور اسلام کے چہرے سے دہشت ووحشت کی گردوغبار کو صاف کرنے کا عہد کرلیں تو بہت کم عرصے میں اسلام کا چہرہ اور حقیقی تصور سامنے آسکتا ہے۔

نور معرفت اسی عزم کے ساتھ چھٹے سال میں قدم رکھ رہا ہے۔ ہمارے نزدیک پاکستانی معاشرے میں قرآن اور سنت رسول ﷺ ہی کے ذریعے امن وسلامتی کو واپس لوٹایا جاسکتا ہے۔ نور معرفت آئندہ سالوں میں بھی پوری امت کے سامنے قرآن واہل بیت اطہار کی تعلیمات پیش کرتا رہے گا۔ ہمارے اس عزم کو آپ قارئین کے تعاون کی اشد ضرورت ہے۔ یہ تعاون آپ نور معرفت کے مطالعے کے ساتھ ساتھ دوسروں تک اس کو پہنچانے کے ذریعے بھی کرسکتے ہیں۔ نور معرفت کے مطالعہ کا دائرہ وسیع کرتے ہوئے اب ہم نے اسے انٹرنیٹ پر بھی باقاعدہ پیش کرنا شروع کردیا ہے اور ہر نیا شمارہ پرنٹ سے پہلے انٹرنیٹ پر آپ کو نظر آئے گا۔ ہم آخر میں ان تمام احباب کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں جنہوں نے اس شمارہ کی تیاری میں کسی بھی طرح کا تعاون فراہم فرمایا ہے۔ اللہ تعالی ہمیں مزید توفیق عطا فرمائے! (آمین!)

☆☆☆☆☆☆

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

" وَ لقد کان فِی رَسُولِ اللّٰہِ (صلّی اللہ علیہ و آلہ) کافٍ لَکَ فِی الْاُسْوَۃِ وَدَلِیل لَکَ عَلٰی ذَمِّ الدُّنیا وعَیبِھَا وکَثْرَۃِ مَخَازِیھَا، و مَسَاوِیھَا، اِذ قُبِضَتْ عَنْہُ اَطْرافُھَا وَوُطِّئَتْ لِغَیرِہ اَکْنَا فُھَا وَ فُطِمَ عَنْ رَضَاعِھَا وَ زُوِیَ عَنْ زخارِفِھَا"

" یقینا رسول اکرمﷺ کی زندگی تمہارے لیے بہترین نمونہ ہے آپﷺ کی ذات دنیا کے عیوب اور اس کی ذلت و رسوائیوں کی کثرت کو دکھانے کے لیے راہنما ہے ،اس لیے کہ آپﷺ سے دنیا کے دامنوں کو سمیٹ لیا گیا اوردوسروں کے لیے اس کی وُسعتیں ہموار کر دی گئیں آپﷺ کو اس کے منافع سے الگ رکھا گیاہے اور اس کی آرائشوں سے کنارہ کش کر دیا گیا ہے۔"

(اقتباس از نہج البلاغہ خطبہ نمبر ۱۵۸)

وجوہ اعجاز قرآن اور نظریۂ صرفہ

سید محمد علی موسوی *
musavi1087@gmail.com

کلیدی کلمات: معجزہ، ضرورت، حقیقت، وجوہ اعجاز قرآن، نظریۂ صرف، تحریف قرآن۔

خلاصہ

اسلام، ایک فطری دین کی حیثیت سے انسانی عقل کو اپنی دعوت کی بنیاد قرار دیتا ہے۔ یہ اپنی دعوت کو عقل کی بنیاد پر استوار کرتا ہے اور اپنی دعوت میں انسان کی ہدایت کے لئے تمام ممکنہ وسائل بروئے کار لاتا ہے تاکہ انسان اپنے فطری مقاصد کی طرف گامزن رہے۔ لہٰذا انبیاء علیہم السلام وہ لائحہ عمل لے کر آتے ہیں جس پر عمل کرنے میں انسانیت کی سعادت پوشیدہ ہوتی ہے۔ لیکن یہ کیسے معلوم ہو کہ کس کے ہاتھوں میں انسان کی سعادت کی تحریر ہے اور کون نبی اور اللہ تعالی کا فرستادہ ہے؟

اسی ضرورت کے تحت معجزہ کی ضرورت پیش آتی ہے۔ یعنی معجزہ وہ چیز ہے جس کے ذریعے انسان کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ کون نبی ہے اور کون نہیں ہے۔ قرآن مجید سرکار انبیاء ﷺ کا دائمی معجزہ ہے۔ لیکن یہاں ایک بحث یہ ہے کہ قرآن کے اعجاز کا راز کیا ہے اور قرآن کس لحاظ سے معجزہ ہے؟ زیر نظر مقالہ میں قرآن کے اعجاز کے حوالے سے سید مرتضی علم الہدی نے ایک خاص نظریہ (نظریۂ صرفہ) پیش کیا ہے۔ زیر نظر مقالہ میں اس نظریہ کا بیان اور اس کا تنقیدی جائزہ شامل کیا گیا ہے۔

*۔ محقق موسّسہ پرتوی ثقلین، حوزہ علمیہ قم، ایران۔

معجزے کی حقیقت

عوام ہر غیر معمولی (Abnormal) چیز کو معجزہ قرار دیتے ہیں جس کی وجہ سے جادو، معجزہ، ارہاص اور کرامت میں فرق ڈالنا مشکل ہو جاتا ہے۔ کیونکہ یہ تینوں غیر معمولی ہوتے ہیں۔ لیکن یہ دیکھنا ضروری ہے کہ قرآن مجید کس لحاظ سے معجزہ ہے اور اس کے اعجاز کی حقیقت کیا ہے؟ اس کے تشکیلی اجزاء اور اس کی جنس و فصل کیا ہیں؟ اس حوالے سے مشہور متکلم خواجہ نصیر الدین طوسیؒ ارشاد فرماتے ہیں:

و ظهور معجزة القرآن وغيره مع اقتران دعوة نبينا... معناه متواترا من المعجزات يعضده۔ (1)

ترجمہ: "اور ہمارے نبی محمد ﷺ کی دعوت کا قرآن اور دوسرے معجزات کے ہمراہ ہونا، آپ کی نبوت کی دلیل ہے۔ اور چیلنج اور قرآن سے مقابلے کے تمام انگیزوں کے باوجود ناکام ہونا، قرآن کے معجزہ ہونے کی دلیل ہے۔ اور دوسرے معجزات جو تواتر معنوی سے نقل ہوئے ہیں اس کی تصدیق کرتے ہیں۔"

اسی طرح سید مرتضیٰ علم الہدی نبوت کے باب میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ: متى علم الله سبحانه أن لنا في بعض الافعال مصالح وألطافا... وجب بعثة الرسول لتعريفه، ولا سبيل إلى تصديقه الا بالمعجز۔ (2)

یعنی: "باب (نبوت کے بارے میں جو عقیدہ رکھنا ضروری ہے) جب اللہ تعالی جانتا ہے کہ ہمارے بعض افعال میں ہمارے لئے مفادات اور الطاف پائے جاتے ہیں اور بعض میں ہمارے دینی مفاسد اور نقصانات پائے ہیں اور دوسری طرف ہماری عقل ہماری مصلحت اور نقصان کو سمجھنے سے قاصر ہے تو ضروری ہے کہ اللہ تعالی رسول بھیجے جو ہمیں ہمارے مصالح اور مفاسد سے آگاہ کریں اور نبی کی تصدیق کے لئے معجزہ کے علاوہ کوئی اور راستہ موجود نہیں ہے۔"

آگے چل کر آپ معجزے کی حقیقت کے بارے میں لکھتے ہیں: أن يكون خارقا للعادة، ومطابقا ... فلابد من دلالته على المصدق والا كان قبيحا (3) یعنی: "معجزہ کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ خارق عادت، نبی کے دعویٰ کے مطابق، اسی دعوی سے مربوط، اور اپنی مخصوص جنس یا خصوصیت کے ساتھ اُس کی مانند پیش کرنے سے لوگ عاجز ہوں اور یہ خدا کا فعل ہو یا خدا کی فعل کی مانند ہو؛ اور اگر معجزہ تصدیق کے مقام پر دکھایا جائے تو اسے ضرور معجزہ دکھانے والے کی صداقت پر دلالت کرنا چاہیے وگرنہ معجزہ کا واقع ہونا قبیح ہوگا۔"

معجزہ کی تعریف میں ابن تیمیہ کا کہنا ہے کہ: وَهِيَ فِي الشَّرْعِ: مَاخَرَقَ الْعَادَةَ مِنْ قَوْلٍ أَوْ فِعْلٍ... وَلَا عَلَى مِثْلِهَا وَلَا عَلَى مَا يُقَارِبُهَا(4) یعنی: "شریعت میں معجزہ: وہ قول یا فعل ہے جو خارق عادت (غیر معمولی) ہو، رسالت کے دعوی سے موافقت رکھتا ہو، اور اس کے ساتھ اور اس کے مطابق ہو، ابتداء میں چیلنج کے طور پر اس طرح پیش کیا جائے کہ کوئی دوسرا ویسا کر دکھانے پر یا اُس کے مثل یا اس کے مشابہ کر دکھانے پر قادر نہ ہو۔"

متکلمین کے ان الفاظ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ معجزہ نبوت کی دلیل ہے۔ ہر نبی معجزے کے ذریعے ہی اپنے دعوے کی تصدیق کراتا رہا۔ لہٰذا معجزہ میں مندرجہ ذیل خصوصیات کا ہونا ضروری ہے:

1. خارق عادت ہو۔ خارق یعنی عادت اور معمول کے خلاف ہو۔ خواہ وہ ایک عادی چیز کے واقع ہونے سے روکنے کی صورت میں ہی کیوں نہ ہو تب بھی معجزہ شمار ہوتا ہے۔
2. یہ خارق عادت اور غیر معمولی کام نبوت کا مدعی اپنے دعویٰ کے ثبوت کے طور پر پیش کرے۔
3. یہ غیر معمولی کام نبوت کے دعویدار کے دعویٰ کے مطابق ہو۔
4. اگر یہ نبوت کی دلیل نہ ہو تو یہ قبیح ہے۔

معجزے کے لئے ان تمام خصوصیات کا بیک وقت موجود ہونا ضروری ہے۔ ورنہ معجزہ نہیں ہے۔ اور ایسا معجزہ نبوت کی دلیل بن سکتا ہے جو ان تمام خصوصیات کا مجموعہ ہو۔ البتہ معجزہ اس وقت تک نبوت کی دلیل نہیں بن سکتا جب تک اس کے ساتھ نبوت کا دعوا اور خداوند متعال کی قدرت مطلقہ کا ضمیمہ ہمراہ نہ ہو۔ اس دلیل کو ایک منطقی قیاس کی شکل میں یوں پیش کیا جاسکتا ہے:

اگر معجزے کا دکھانے والا نبی نہ ہوتا تو اللہ تعالی اپنی قدرت سے اسے اس خارق عادت چیز سے روکتا۔ لیکن اللہ تعالی نے نہیں روکا۔ نتیجہ یہ کہ: "نبوت کا مدعی، نبی ہے اور سچا ہے۔" اس قیاس کو ایک اور صورت میں بھی بیان کیا جاسکتا ہے اور وہ یہ کہ: معجزہ ایک خارق العادہ کام ہوتا ہے اور اللہ تعالی کا اس نبوت کے جھوٹے دعویدار کو خارق عادت کام دکھانے سے نہ روکنے پر قادر ہونے کے باوجود نہ روکنا قبیح ہے۔ اور قبیح کا اللہ تعالی سے سرزد ہونا محال ہے۔ پس اللہ تعالی کا کسی شخص کو ایک خارق عادت چیز سے

نہ روکنا، اس کے سچے ہونے اور نبی ہونے کی دلیل ہے۔ لہٰذا جو خارق عادت (غیر معمولی) چیز نبوت کے دعوے کے ساتھ پیش کی جائے وہ نبوت کی دلیل ہوتی ہے۔

دوسرے الفاظ میں قادر مطلق ہونے کی وجہ سے ہر فعل اللہ تعالی کی ذات سے منسوب ہے۔ کائنات میں کوئی تصرف اس کی چاہت کے بغیر ممکن نہیں۔ اس لئے اس خارق عادت چیز کا سرزد ہونا بھی اسی کے ارادے اور مرضی سے ہے۔ اب اگر کسی مدعی نبوت سے خارق عادت کا سرزد ہونا بھی اس کی مرضی سے ہے اور مدعی نبوت سے یہ سرزد ہوتا ہے تو اگر وہ مدعی جھوٹا ہو اور انسان کو دھوکہ ہو اور کسی کو غلطی سے نبی سمجھے تو یہ بھی خدا کی مرضی سے ہوگا جو کہ قبیح ہے۔

وجوہ اعجاز قرآن اور سید مرتضی کا نظریۂ صرفہ

یہاں سوال یہ ہے کہ جب قرآن مجید نبی اکرم ﷺ کا معجزہ ہے تو اس کے اعجاز کی جہت کیا ہے؟ آیا قرآن مجید اس لئے معجزہ ہے کہ یہ کلام بھی بالکل اسی طرح ایک خارق عادت (غیر معمولی) کام ہے؛ جیسے شق القمر ایک خارق عادت چیز ہے؟ یا قرآن کے اعجاز کا رمز و راز کچھ اور ہے؟ مفسرین نے قرآن کریم کے اعجاز کے کئی اسباب و وجوہات بیان کی ہیں لیکن یہ سب اس لئے مخدوش ہیں کیونکہ ان سے زیادہ سے زیادہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ قرآن مجید خارق عادت ہے۔ لیکن معجزے کے باقی اجزاء اور شرائط ان سے ثابت نہیں ہوتے۔ مثال کے طور پر وجوہ اعجاز میں محققین نے اب تک جن وجوہات کا ذکر کیا ہے ان میں آنحضرتؐ کی شخصیت ،فصاحت اور بلاغت ،اعجاز معانی ،عدم وجود اختلاف، غیب کی خبریں، دقیق سائنسی معلومات، فنّی تخلیقات اور عددی اعجاز وغیرہ شامل ہیں۔

لیکن قرآن مجید میں ان تمام وجوہات کے موجود ہونے کے باوجود بھی اگر قرآن کو اعجاز کو محض خارق عادت ہونے میں منحصر کر لیا جائے تو اس کا نظیر لانا ممکن ہوگا۔ کیونکہ خارق العادہ ہونا نبوت کی دلیل کا ایک حصّہ اور قیاس کا ایک مقدمہ ہے۔ جب تک اس کے ساتھ دیگر مقدمات ضمیمہ نہ ہوں اس وقت تک یہ نبوت کی دلیل نہیں بن سکتی اور اسے معجزہ قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اثبات نبوت کی دلیل میں اسی کمی کو سامنے رکھتے ہوئے سید مرتضیٰؒ نے اعجاز قرآن کی وجوہ میں "نظریۂ صرفہ" پیش کیا۔ ان کے مطابق:

إن العرب اذا تأملوا فصاحة القرآن وبلاغته ، ووجدوا ما يتمكنون منه في عاداتهم من الكلام الفصيح ... علموا أن الله تعالى خرق عاداتهم ، بأن صرفهم عن المعارضة التي كانت لولا الصرف متأتية . (5)

یعنی: "جب عرب قرآن مجید کی فصاحت اور بلاغت میں غور کیا تو دیکھا کہ اس میں ان کے عادی فصیح کلام جیسی خصوصیات پائی جاتی ہیں جن پر وہ قادر ہیں اور یہ امر قرآن کو اس کے خارق عادت ہونے سے نکال دیتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود عربوں نے احساس کیا کہ وہ اس کلام کے مقابلے سے عاجز ہیں، حالانکہ ان کے اندر اس مقابلہ کی شدید خواہش اور انگیزہ بھی پایا جاتا تھا۔ اس سے عرب جان گئے کہ اللہ تعالی نے ان کی عادات کو توڑا ہے کچھ اس طرح کہ ان کو قرآن کے مقابلے سے روکا ہے کہ اگر یہ (الہی) رکاوٹ نہ ہوتی تو ان کے لئے اس کلام کا معارضہ ممکن تھا۔ "

سید مرتضیؒ کی مراد یہ ہے کہ قرآن کی فصاحت اور بلاغت اس کے معجزہ ہونے کے لئے کافی نہیں۔ جب تک اس کے ساتھ اللہ تعالی کا یہ ارادہ کہ اس کا کوئی مقابلہ نہ کر سکے، ضمیمہ نہ ہو۔ کیونکہ معجزے کے لئے ضروری ہے کہ اس کا مقابلہ کرنا محال ہو۔ جبکہ کلام جتنا بھی فصیح ہو اس کا مقابلہ ممکن ہے اور اس کی نظیر لائی جا سکتی ہے۔ کیونکہ ہو سکتا ہے اب تک کوئی اس کی نظیر نہ لا سکا ہو لیکن آئندہ لے آئے۔ جبکہ معجزہ کا نظیر لایا جانا آئندہ بھی محال ہے۔ اس طرح ہر خلاف عادت اور غیر معمولی چیز کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ جب تک اس کو کسی نبی کی نبوت پر دلیل کے طور پر پیش نہ کیا جائے وہ معجزہ نہیں ہے۔

نظریۂ صرفہ کا تنقیدی جائزہ

اگر سید مرتضی کے اعجاز قرآن کے باب میں اس نظریہ کا دیگر محققین کے نظریات سے مقایسہ کیا جائے تو ہم دیکھتے ہیں کہ کئی محققین کے برخلاف، محقق طوسیؒ نے نہ تنہا اس نظریہ کا انکار نہیں کیا بلکہ اس کی ضمنی تصدیق بھی فرمائی ہے۔ آپ فرماتے ہیں: وإعجاز القرآن قيل لفصاحته، وقيل لأسلوبه وفصاحته، وقيل للصرفة، والكل محتمل. (6) یعنی: "قرآن کا اعجاز کچھ نے اس کی فصاحت کو قرار دیا ہے۔ کچھ نے اس کے اسلوب اور فصاحت دونوں کو اور کچھ نے صرفہ کو وجہ اعجاز قرار دیا ہے۔ اور ان سب اقوال کی صحت کا احتمال پایا جاتا ہے۔ "

اگرچہ محقق طوسی اس نظریہ کو رد نہیں کیا تاہم انہوں نے قرآن کے اعجاز میں تینوں مذکورہ اقوال کو مساوی احتمالات قرار دیا ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے کیونکہ "صرفہ" معجزے کے استدلال میں بنیادی رکن کی حیثیت رکھتا ہے۔ کیونکہ معجزے میں صرفہ کا ہونا ضروری ہے جو اللہ تعالی کی تکوینی مشیّت کی طرف اشارہ ہے، جس کے بغیر معجزہ، معجزہ نہیں ہو سکتا۔

باقلانی کا شمار بھی ان لوگوں میں ہوتا ہے جو نظریۂ صرفہ کے منکر ہیں۔ باقلانی کا کہنا ہے کہ: و مما یبطل ما ذکروہ من القول بالصرفة أنه لو کانت المعارضة ممکنة، و إنما منع منها الصرفة لم یکن الکلام معجزا. (7) یعنی: "قول صرفہ کے باطل ہونے کی ایک وجہ یہ ہے کہ اگر قرآن کا معارضہ ممکن ہو تو یہ کلام معجزہ نہیں رہے گا۔" لیکن باقلانی کے اس اشکال کا جواب گذشتہ مطالب سے واضح ہے۔ کیونکہ کوئی معجزہ اللہ تعالی کے ارادے سے قطع نظر، معجزہ نہیں ہو سکتا، خواہ اس میں کتنی ہی امتیازی خصوصیات کیوں نہ پائی جاتی ہوں اور اس میں قرآن کریم اور دیگر معجزات میں کوئی فرق نہیں پایا جاتا۔

لہٰذا متکلمین نے اعجاز قرآن کی جتنی وجوہ بیان کی ہیں، جب تک ان میں صرفہ کا رکن نہ ڈالا جائے اعجاز قرآن کی وجوہ نہیں بن سکتی۔ البتہ اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ جن وجوہات کو ذکر کیا ہے ان کی ضرورت ہی نہ ہو۔ کیونکہ اگر عام کلام سے کچھ فرق ہی نہ ہو تو پھر چیلنج ممکن نہیں۔ لہٰذا ان وجوہات میں سے ایک ہی کافی ہے کہ قرآن مجید سے نبوت کے منکرین کو چیلنج کیا جاسکے۔

آیۃ اللہ العظمی خوئیؒ کا شمار بھی ان محققین میں ہوتا ہے جنہوں نے نظریۂ صرفہ پر اعتراضات کیے ہیں۔ آپ کا پہلا اعتراض یہ ہے کہ: ... لان الصرفة التی یقولون بها ... فهو معنی صحیح، ولکنه لا یختص بالقرآن، بل هو جار فی جمیع المعجزات۔ (8) یعنی: "یہ نظریہ بہت ہی کمزور ہے: سب سے پہلے تو اس لئے کہ: صرفہ کے جس نظریہ کے لوگ قائل ہیں اگر ان کی مراد یہ ہے کہ اللہ تعالی لوگوں کو قرآن کی مثل لانے کی طاقت دینے کے بعد انہیں اس طاقت کے استعمال سے منصرف کر دے تو یہ بات اگرچہ (فی نفسہ) صحیح ہے، لیکن یہ بات قرآن مجید سے مخصوص نہیں، بلکہ تمام معجزات میں پائی جاتی ہے۔"

لیکن آقا خوئی کا یہ اشکال اس لئے وارد نہیں ہے کیونکہ واضح ہے کہ نظریہ صرفہ کا قائل بھی یہی کہتا ہے کہ قرآن مجید اگرچہ خارق عادت ہے لیکن اللہ تعالی کے لوگوں کو اس کی مثل لانے سے منصرف کرنے کا

معاملہ نہ ہو تو اس کی نظیر لانا ممکن ہے۔ اسی طرح قرآن اور باقی معجزات میں اس حوالے سے کوئی فرق نہیں۔ نظریہ صرفہ پر آقا خوئی کا دوسرا اشکال یہ ہے کہ: لانه لو كان إعجاز القرآن بالصرفة لوجد في كلام العرب... كشف ذلك عن كون القرآن بنفسه إعجازا إلهيا، خارجا عن طاقة البشر. (9)

یعنی: "دوسرا اعتراض یہ ہے کہ: اگر قرآن مجید کے اعجاز کا سبب "صرفہ" ہوتا تو نبی اکرمؐ کے چیلنج اور آپ کے عربوں سے قرآن کی مانند کلام پیش کرنے کے مطالبے سے قبل سابقہ عربوں کے کلام میں قرآن کی نظیر کلام پایا جاتا۔ اور اگر ایسا کلام پایا جاتا تو یقینا یہ کلام نقل ہوتا اور تواتر سے معلوم ہوتا۔ کیونکہ اس کے نقل کرنے کے انگیزے بکثرت موجود تھے۔ لیکن چونکہ ایسا کلام عربوں کے ہاں پایا نہیں گیا اور نہ نقل ہوا ہے تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خود قرآن الہی معجزہ ہے اور انسان کی طاقت سے باہر ہے۔"

لیکن آقا خوئی کے اس اعتراض کا جواب بھی واضح ہے۔ کیونکہ اگر ماضی میں قرآن کی نظیر کلام نہ تھا یا نہ لایا جا سکا تو اس سے صرفہ کا نظریہ باطل نہیں ثابت ہوتا۔ کیونکہ اس سے زیادہ سے زیادہ قرآن کریم کا خارق عادت ہونا ثابت ہوتا ہے، نہ کہ اعجاز۔

نظریۂ صرفہ اور تحریف قرآن

اگر قرآن مجید کے اعجاز کے باب میں صرفہ کے نظریہ کو مان لیا جائے تو اس نظریے کا لازمہ قرآن کی تحریف کا محال ہونا ہے۔ کیونکہ قرآن معجزہ ہے اور اللہ تعالی کا تکوینی فعل ہے۔ اس لئے اس میں کمی یا بیشی ممکن نہیں۔ کیونکہ اگر قرآن میں کمی یا بیشی ممکن ہو تو لازم آتا ہے کہ قرآن معجزہ نہ ہو۔ حالانکہ قرآن مجید معجزہ ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالی ہے:

وَإِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِمَّا نَزَّلْنا عَلى عَبْدِنا فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِنْ مِثْلِهِ وَادْعُوا شُهَداءَكُمْ مِنْ دُونِ اللهِ إِنْ كُنْتُمْ صادِقِينَ فَإِنْ لَمْ تَفْعَلُوا وَلَنْ تَفْعَلُوا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ

یعنی: "اگر تمہیں اس کلام کے بارے میں کوئی شک ہے جسے ہم نے اپنے بندے پر نازل کیا ہے تو اس کا جیسا ایک ہی سورہ لے آؤ اور اللہ کے علاوہ جتنے تمہارے مددگار ہیں سب کو بلالو۔ اگر تم

اپنے دعوے اور خیال میں سچے ہو۔ اگر تم ایسا نہ کرسکے اور یقینا نہ کر سکو گے تو اس آگ سے ڈرو جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں اور جسے کافروں کے لئے مہیا کیا گیا ہے۔" (10)

اسی طرح ارشاد باری تعالی ہے:

أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ قُلْ فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِثْلِهِ وَ ادْعُوا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِنْ دُونِ اللهِ إِنْ كُنْتُمْ صادِقِينَ (11)

یعنی: " کیا یہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ اسے پیغمبر نے گھڑ لیا ہے تو کہہ دیجئے کہ تم اس کے جیسا ایک سورہ لے آؤ اور خدا کے علاوہ جسے چاہو اپنی مدد کے لئے بلالو اگر تم اپنے الزام میں سچے ہو۔"

خلاصہ یہ کہ اس نظریہ کی رو سے تحریف قرآن کے بارے موجود شیعہ اور سنّی روایات کا جواب واضح ہو جاتا ہے کہ یہ روایات یقیناً جعلی ہیں۔ کیونکہ ان روایات کو تسلیم کرنے کی صورت میں قرآن میں تحریف کا امکان لازم آتا ہے، حالانکہ نظریۂ صرفہ کی روشنی میں قرآن مجید کا اعجاز اسی میں ہے کہ اس میں تحریف سے بھی اللہ تعالی ہر بشر کو منصرف کر دیتا ہے۔

حوالہ جات

1۔علامۃ حلی: کشف المراد فی شرح تجرید الاعتقاد ص۴۸۰

2۔شریف مرتضی: رسائل المرتضیٰ مجلد ۳ ص۱۸۔

3۔شریف مرتضی: رسائل المرتضی مجلد ۳ ص۱۸-۱۹

4۔احمد بن عبدالحلیم بن تیمیہ الحرانی ابوالعباس: الفرقانُ بینَ اولیاءِ الرَّحمٰنِ واولیاءِ الشَّیطانِ ص۶ محقّق: علی بن نایف الشحود

5 ۔شریف مرتضی: رسائل المرتضی مجلد 1 ص348ط: مطبعۃ سید الشہداء – قم ط: 1405ق۔

6 ۔علامۃ حلی: کشف المراد فی شرح تجرید الاعتقاد ص484

7 ۔باقلانی(403ق): إعجاز القرآن ص 26 ناشر: دار الکتب العلمیۃ بیروت 1421ق

8 ۔سید ابو القاسم الخوئی: البیان فی تفسیر القرآن ص83ط: دار الزہراء بیروت – لبنان 1395 ق

9 ۔ایضا۔

10 ۔سورہ بقرۃ آیت 23-24

11 ۔سورہ یونس آیت 38

حروف مقطعات (۳)
مختلف آراء کا تجزیاتی مطالعہ

ثاقب اکبر*

ukhuwat@gmail.com

کلیدی کلمات: اسمائے نبوی، اعداد، قرآنی قَسمیں، حی بن اخطب

خلاصہ

حروف مقطعات کے بارے میں عربی اور فارسی میں کافی کام ہوا ہے جس میں فلاسفہ اور عرفاء کے نظریات بہت اہم ہیں۔ جبکہ اُردو میں اس موضوع پر بہت کم کام ہوا ہے۔ بعض نے تو ان حروف کے بارے میں غور و فکر کرنے کو بھی وقت کا ضیاع قرار دیا ہے۔ حالانکہ یہ حروف قرآن مجید کی بہت سی سورتوں کے شروع میں آئے ہیں اور ان میں حیرت انگیز معانی و مطالب ملتے ہیں۔ ایسے میں ان کے بارے میں سنجیدہ مطالعے اور غور و فکر کے بجائے دوسروں کو بھی ان پر گہری نظر ڈالنے سے روکنے کے لیے کہا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے اس موضوع پر اصحاب دانش و بصیرت کی توجہ مبذول کرنے کے لیے چند مطالب مرتب کرکے پیش کرنے کی ایک کمزور سی کوشش کی ہے۔ اس سلسلے میں قبل ازیں دو اقساط میں بارہ آراء و نظریات پیش کیے گئے ہیں اور اب کچھ مزید مطالب پیش کیے جارہے ہیں۔ تیرہواں نظریہ یہ ہے کہ حروف مقطعہ آنحضرتؐ کے اسماء ہیں۔ اس کے بعد چودھواں نظریئے میں ان حروف کو بطور قسموں کے متعارف کرایا گیا ہے۔ یعنی یہ حروف قسمیں ہیں جو اللہ تعالیٰ نے کھائی ہیں۔ گویا اللہ تعالیٰ ان حروف کے ذریعے قسم کھاتا ہے کہ قرآن اس کا کلام ہے۔ پندرہویں رائے یہ ہے کہ یہ حروف اُمتوں اور قوموں کی مدت عمر کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اسی بنیاد پر بعض حساب لگانے والوں کی رائے ہے کہ امت اسلامیہ آخری زمانے تک باقی رہے گی اور قیامت تک ختم نہ ہوگی۔ لیکن بعض محققین نے اس رائے کو بہت ہی کمزور قرار دیا ہے۔

*۔ صدر نشین، البصیرہ، اسلام آباد

مقدمہ

حروف مقطعات کے بارے میں عربی اور فارسی زبانوں میں مفسرین اور اسلامی دانشوروں نے نسبتاً زیادہ کام کیا ہے۔ اس سلسلے میں حکماء اور عرفاء کے نظریات بھی خاصے کی چیز ہیں۔ بعض علماء اور عرفاء نے ایسے ایسے مطالب ان حروف کے حوالے سے بیان کیے ہیں کہ انسان کی فکر و نظر کو جذب کر لیتے ہیں اور انسان کو مجبور کر لیتے ہیں کہ وہ ان پر گہری نظر ڈالیں۔ ہمارے ہاں ان حروف کے بارے میں بہت کم کام ہوا ہے اور بیشتر مفسرین سطحی نظر ڈال کر گزر گئے ہیں۔ یہاں تک کہ بعض نے صاف کہہ دیا ہے کہ ان حروف کا تعلق ہم سے ہے ہی نہیں لہٰذا ان پر غور و فکر کرنا وقت ضائع کرنے کے مترادف ہے۔

حیرت ہے قرآن حکیم کی کئی سورتوں کے آغاز میں صدیوں سے یہ حروف موجود چلے آرہے ہیں اور انھوں نے ایک دنیا کو ورطۂ حیرت میں ڈال رکھا ہے اور ان کے بارے میں نئے نئے مطالب جہان علم و دانش میں سامنے آرہے ہیں۔ ایسے میں ان کے بارے میں سنجیدہ مطالعے اور غور و فکر کے بجائے دوسروں کو بھی ان پر گہری نظر ڈالنے سے روکنے کے لئے کہا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے اس موضوع پر اصحاب دانش و بصیرت کی توجہ مبذول کرنے کے لئے چند مطالب مرتب کرکے پیش کرنے کی ایک کمزور سی کوشش کی ہے۔ اس سلسلے میں قبل ازیں دو اقساط میں کچھ مطالب قارئین کی خدمت میں پیش کیے جا چکے ہیں اور اب کچھ مزید مطالب پیش کیے جا رہے ہیں۔ گذشتہ مقالات میں مندرجہ ذیل موضوعات پر کچھ آرا پیش کی گئی ہیں:

۱۔ یہ حروف متشابہات میں سے ہیں۔

۲۔ حروف مقطعہ سورتوں کے نام ہیں۔

۳۔ یہ حروف پورے قرآن کے نام ہیں۔

۴۔ یہ حروف فکر و عقل کے اول مخلوق ہونے کی طرف اشارہ ہیں۔

۵۔ حروف مقطعہ پیغمبر اکرمؐ کو متوجہ کرنے کے لئے ہیں۔

۶۔ یہ حروف تحدی کی حیثیت رکھتے ہیں۔

۷۔ صحابہؓ کو ان حروف کا معنی معلوم تھا۔

۸۔ حروف مقطعہ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کے مابین رمز ہیں

۹۔ حروف مقطعہ اللہ تعالیٰ کے اسماء ہیں

۱۰۔ حروف مقطعہ : سامان فکر انگیزی

۱۱۔ حروف مقطعہ معانی اور اشیاء پر دلالت کرتے ہیں

۱۲۔ یہ حروف کفار کو خاموش کرنے کے لئے نازل ہوئے

اب کچھ مزید مطالب پیش خدمت ہیں :

۱۳۔ حروف مقطعہ آنحضرتؐ کے اسماء ہیں

حروف مقطعہ کے بارے میں ایک نظریہ بھی پایا جاتا ہے کہ یہ آنحضرتؐ کے اسماء ہیں یا آنحضرتؐ کو خطاب کرنے کے لئے استعمال کیے گئے ہیں۔اس کی ایک وجہ بعض ایسی آیات ہیں جو حروف مقطعہ کے فوراً بعد آئی ہیں جن میں واضح طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خطاب کیا گیا ہے۔ مثلاً سورہ طٰہٰ کا آغاز یوں ہوتا ہے :

"طٰہٰ O مَآ اَنۡزَلۡنَا عَلَيۡكَ الۡقُرۡاٰنَ لِتَشۡقٰٓى"

ترجمہ : "طٰہٰ، ہم نے آپ پر قرآن اس لئے نازل نہیں کیا کہ آپ اپنے آپ کو زحمت میں ڈال دیں۔"

اس میں کوئی شک نہیں کہ دوسری آیت میں "ک" کی ضمیر آنحضرتؐ سے خطاب کے لئے ہے۔

اسی طرح سے سورہ یٰسٓ کا آغاز یوں ہوتا ہے :

"يٰسٓ O وَ الۡقُرۡاٰنِ الۡحَكِيۡمِ O اِنَّكَ لَمِنَ الۡمُرۡسَلِيۡنَ O عَلٰى صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ"

ترجمہ : "یٰسٓ، قرآن حکیم کی قسم ہے کہ آپ مرسلین میں سے ہیں اور آپ سیدھے راستے پر ہیں۔"

یہاں بھی "ک" کی ضمیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خطاب کے لئے آئی ہے۔

یہ نظریہ تمام حروف مقطعہ کے لئے تو قابل قبول معلوم نہیں ہوتا لیکن بعض مقامات پر درست دکھائی دیتا ہے۔

اس سلسلے میں بعض روایات بھی اسی امر کی نشاندہی کرتی ہیں۔ چنانچہ آیت اللہ مکارم شیرازی لکھتے ہیں :

"این موضوع نیز جالب توجه است که در حدیثی از ـــ واز حضرت مهدی(ع) در دعای ندبه "یابن طه" تعبیر شده است۔ (1)

"یہ امر بھی اپنی طرف توجہ مبذول کرتا ہے کہ ایک حدیث جو امام صادقؑ سے منقول ہے، میں ہم پڑھتے ہیں کہ "طٰہٰ" پیغمبر اکرم ﷺ کے ناموں میں سے ایک نام ہے اور اس کا معنی ہے یا طالب الحق، الهادی الیه یعنی اے حق کے طالب اور حق کی طرف راہنمائی کرنے والے۔ اس حدیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ "طٰہٰ" دو لفظوں کے مرکب کے لئے بطور رمز آیا ہے۔ "طا" طالب

الحق، کی طرف اشارہ کرتا ہے اور ''ھا'' ھادی الیہ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ حروف رمز اور مختصر علامت کے طور پر استفادہ کرنے کا طریقہ ماضی میں بھی رہا ہے اور آج بھی بہت پایا جاتا ہے۔ خاص طور پر ہمارے زمانے میں اس سے بہت زیادہ استفادہ کیا جاتا ہے۔

اس مسئلے میں آخری بات یہ ہے کہ کلمہ ''طہ'' کلمہ ''یٰسٓ'' کی طرح وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تدریجاً رسول اسلامؐ کے لئے ''اسم خاص'' کی شکل اختیار کر گیا ہے۔ یہاں تک کہ آلؑ رسولؐ کو آل طہ کہا جاتا ہے اور دعائے ندبہ میں حضرت مہدی علیہ السلام کو ''یابن طہ'' (اے طہ کے بیٹے کہا گیا ہے۔)''

اردو میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ ان حروف کو آنحضرتؐ کے لئے اسم خاص کے طور پر استعمال کیا گیا ہے چنانچہ علامہ اقبال کا معروف شعر ہے:

نگاہِ عشق و مستی میں وہی اوّل وہی آخر وہی قرآں وہی فرقاں وہی یٰسیں وہی طاہا (2)

۱۴۔ یہ حروف قسمیں ہیں

یہ حروف قسمیں ہیں جو اللہ تعالیٰ نے کھائی ہیں۔ گویا اللہ تعالیٰ ان حروف کے ذریعے قسم کھاتا ہے کہ قرآن اس کا کلام ہے۔ ابن جریر طبری (م ۳۱۰) نے جامع البیان عن تاویل آی القرآن میں الم کی تفسیر کرتے ہوئے حروف مقطعہ کے بارے میں مختلف اقوال میں سے ایک قول یہ بھی ذکر کیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

وقال بعضهم: هوقسم أقسم الله به وهي من أسمائه۔۔۔ قال: ''الم'' قسم۔ (3)

ترجمہ: ''بعض کا کہنا ہے کہ یہ قسم ہے اللہ نے اس کے ذریعے سے قسم کھائی ہے اور یہ اس کے اسماء میں سے ہے جس کی یہ رائے ہے اس نے ذکر کیا ہے۔ مجھ سے روایت کیا ہے یحییٰ بن عثمان بن صالح السہمی نے اس کا کہنا ہے کہ ہم سے عبداللہ بن صالح نے روایت کیا ہے اس کا کہنا ہے کہ مجھ سے معاویہ بن صالح نے روایت کیا ہے اور اس نے علی بن ابی طلحہ سے اور اس نے ابی بن عباس سے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ قسم ہے اللہ نے اس کے ذریعے سے قسم کھائی ہے اور یہ اللہ کے اسماء میں سے ہے۔ ہم سے روایت کیا ہے یعقوب بن ابراہیم نے اس کا کہنا ہے کہ ہم سے ابن

علیہ نے روایت کیا ہے اس کا کہنا ہے کہ ہم سے خالد الحذا نے روایت کیا ہے کہ عکرمہ کا کہنا ہے کہ "الم" قسم ہے۔"

علامہ طبرسی نے بھی حروف مقطعہ کے بارے میں مختلف اقوال بیان کرتے ہوئے ایک قول یہ بھی پیش کیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"انها أقسام أقسم الله تعالىٰ بها وهي من أسمائه عن ابن عباس و عكرمة قال الأخفش وانما أقسم الله تعالى بالحروف المعجمة لشرفها وفضلها ولأنها مباني كتبه المنزلة بالألسنة المختلفة وأسمائه الحسنى وصفاته العليا۔۔۔" (4)

یعنی: "حروف مقطعہ قسمیں ہیں اللہ نے ان کے ذریعے سے قسمیں کھائی ہیں اور یہ اللہ کے اسماء میں سے ہیں۔ یہ ابن عباس اور عکرمہ کا قول ہے۔ اخفش کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حروف معجمہ کے ذریعے سے ان کے شرف اور فضل کی وجہ سے قسم کھائی ہے۔ اس لئے کہ مختلف زبانوں میں نازل ہونے والی کتب، اللہ کے اسمائے حسنہ، اس کی بلند مرتبہ صفات کی بنیاد یہی حروف ہیں۔۔۔"

علامہ جوادی آملی نے اس رائے پر تنقید کی ہے ان کا کہنا ہے:

"این احتمال نیز گرچه استحالهٔ عقلی ندارد۔۔۔ سوگندها هستند به معنای آنها راه ندارند۔" (5)

یعنی: "یہ احتمال بھی اگرچہ عقلی طور پر محال نہیں ہے لیکن ایک طرف تو اس کے لئے کوئی معتبر دلیل ایسی نہیں ہے جو اس کی تائید کرتی ہو اور دوسری طرف مذکورہ احتمال کو حروف مقطعہ کی تفسیر قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اگر ہم یہ قبول کرلیں کہ یٰسٓ کی قسم معنی میں ہے تو پھر بھی یہ سوال باقی رہے گا کہ اس مُقْسَمٌ بِہ (جس کے ذریعے سے قسم کھائی جارہی ہو) سے مراد کیا ہے؟ اور جسے سرّ کے طور پر ذکر کیا گیا ہے وہ 14 حروف سے کوئی اختصاص نہیں رکھتا۔

قرآن حکیم میں جن کی قسمیں کھائی گئی ہیں ان میں جمادات بھی شامل ہیں مثلاً سورج اور چاند اور اسی طرح اللہ کے اسمائے حسنیٰ بھی شامل ہیں کہ جن کے معنی واضح ہیں لیکن حروف مقطعہ کے معنی واضح نہیں ہیں لہٰذا اس نظریے میں دو ابہام پائے جاتے ہیں ایک اصل حروف مقطعہ کے قسم ہونے میں اور دوسرا جس کی قسم کھائی جارہی ہے اس کے معنی میں۔

قسم کے مخاطبین کے علم میں یہ بات ہونا چاہیے کہ جس لفظ کے ذریعے قسم کھائی جارہی ہے اس کا معنی کیا ہے۔ قسم اس کے لئے ہے کہ جو مدعی کے دعویٰ کی درستی میں شک رکھتا ہو اور کہنے والا قسم کے ذریعے سے اس کا شک دور کرنا چاہتا ہو رسول اکرم ﷺ اور دیگر معصومین علیہم السلام جو ان حروف کے راز اور رمز سے آگاہ ہیں انھیں چونکہ اللہ کے دعوے کی درستی میں کوئی شک نہیں اس لئے انھیں قسم کی ضرورت نہیں اور دوسرے جو شک کی وجہ سے قسم کے نیاز مند ہیں انھیں ان کے معانی کا علم نہیں۔"

۱۵۔ یہ حروف امتوں اور قوموں کی مدت عمر کی طرف اشارہ کرتے ہیں

ایک نظریہ یہ ہے کہ یہ حروف امتوں اور قوموں کی مدت عمر کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اسی بنیاد پر بعض حساب لگانے والوں کی رائے ہے کہ امت اسلامیہ آخری زمانے تک باقی رہے گی اور قیامت تک ختم نہ ہوگی۔ اس نظریے کی بنیاد عربی زبان کے ہر حرف کے لئے مقرر کیے جانے والے عدد کو بنایا گیا ہے۔ نزول قرآن سے قبل اہل کتاب کے ہاں یہ نظریہ رائج رہا ہے اور بعد ازاں مسلمانوں کے ایک طبقے نے بھی اس نظریے کو اختیار کر لیا اور آج بھی بعض گروہوں میں یہ نظریہ رائج ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے لئے ۷۸۶ کا عدد اسی نظریے کی بنا پر رائج ہوا ہے۔ اسی طرح آنحضرتؐ کے نام محمدؐ کے لئے ۱۱۰ اور حضرت علیؑ کے نام کے لئے ۹۲ کا عدد اسی نظریے کے پیش نظر اختیار کیا گیا ہے۔ تاہم یہ کہ قرآن حکیم میں حروف مقطعات کسی خاص عدد یا کسی قوم کی مدت عمر کی طرف اشارہ کرتے ہیں اس کی بنیاد ایک روایت ہے جسے عام طور پر محققین نے ضعیف قرار دیا ہے۔ اس سلسلے میں ابن کثیر لکھتے ہیں:

"واما من زعم أنها دالة على معرفة المدد وأنه ۔۔۔ فقالوا لقد تشابه علينا أمره۔" (6)

"بعض لوگوں کا نظریہ ہے کہ یہ حروف مدت پر دلالت کرتے ہیں اور ان کے ذریعے سے حادثات، فتنوں اور جنگوں کے اوقات اخذ کیے گئے ہیں اور ان کے بارے میں ایسا دعویٰ کیا گیا ہے جس کے لئے یہ حروف نہیں آئے۔ اس سلسلے میں ایک ضعیف حدیث بھی وارد ہوئی ہے اس حدیث سے نہ فقط یہ کہ یہ نظریہ ثابت نہیں ہوتا بلکہ الٹا اگر یہ صحیح ہو تو اس قول کا بطلان ثابت ہوتا ہے۔

حدیث یوں ہے: اسے محمد بن اسحاق بن یسارؒ جو "المغازی" کے مصنف ہیں، نے نقل کیا ہے۔ اس میں ہے کہ مجھ سے کلبی نے ابو صالح سے، انھوں نے ابن عباسؓ سے اور انھوں نے جابر بن عبداللہ بن زیاد سے روایت کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ ایک روز ابو یاسر بن اخطب چند دیگر

یہودیوں کے ساتھ رسول اللہؐ کے پاس سے گزرا۔آپ سورہ بقرہ کی ابتدائی آیات کی تلاوت فرما رہے تھے "الٓمّٓ O ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ" اس نے یہ سنا تو اپنے بھائی حی بن اخطب کے پاس دیگر یہودی افراد کے ہمراہ آیا اور کہنے لگا کیا تم جانتے ہو، اللہ کی قسم میں نے محمدؐ کو تلاوت کرتے ہوئے سنا کہ اللہ تعالیٰ نے اس پر یہ نازل کیا ہے "الٓمّٓ O ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ" تو حی کہنے لگا: کیا تم نے خود سنا ہے تو اس نے کہا: ہاں۔

راوی کہتا ہے کہ حی بن اخطب ان یہودی افراد کے ہمراہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا پس انھوں نے کہا اے محمد ﷺ! کیا آپؐ نے یہ تلاوت کیا ہے کہ اللہ نے آپؐ پر یہ نازل فرمایا ہے "الٓمّٓ O ذٰلِكَ الْكِتٰبُ "؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہاں۔ پھر وہ کہنے لگے: کیا یہ جبریل اللہ کی طرف سے آپؐ کے پاس لے کر آئے ہیں تو آپؐ نے فرمایا: ہاں۔اس نے کہا: آپؐ سے پہلے جتنے نبی آئے کسی کو بھی نہیں بتایا گیا تھا کہ اس کے دین اور حکومت کی مدت کتنی رہے گی لیکن آپ کو بتا دیا گیا ہے۔ پھر حی بن اخطب کھڑا ہوا اور اپنا رخ اپنے ساتھیوں کی طرف کرکے کہنے لگا: الف سے ایک، لام سے تیس اور میم سے چالیس، پس یہ کل اکہتر سال ہوئے۔ کیا تم ایسے نبی کے دین میں داخل ہوگے کہ جس کی حکومت کی مدت اور امت کی عمر اکہتر برس ہو؟

پھر اس نے رسول اللہ ﷺ کی طرف منہ کیا اور کہنے لگا :اے محمد ﷺ! کیا اس کے علاوہ بھی کچھ ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ہاں۔اس نے پوچھا: وہ کیا ہے؟آپؐ نے فرمایا "المص" وہ کہنے لگا یہ تو گراں تر اور طویل تر ہے۔ الف سے ایک، لام سے تیس، میم سے چالیس اور ص سے نوے ہوتے ہیں تو یہ کل مدت ایک سو اکتیس برس ہو گئی۔ اے محمد ﷺ! اس کے علاوہ بھی کچھ اور ہے؟آپؐ نے فرمایا: ہاں۔ کہنے لگا: وہ کیا ہے؟آپؐ نے فرمایا "الر" وہ کہنے لگا یہ تو ثقیل تر اور طویل تر ہے، الف سے ایک، لام تیس اور را سے دو سو، یہ تو کل مدت دو سو اکتیس برس بن گئی۔ اے محمد ﷺ! کیا اس کے علاوہ بھی کچھ ہے؟

آپؐ نے فرمایا: ہاں۔ کہنے لگا: وہ کیا ہے؟فرمایا: "المر" وہ کہنے لگا: یہ تو گراں تر اور طویل تر ہو گیا ہے۔ الف سے ایک، لام سے تیس، میم سے چالیس، را سے دو سو پس یہ دو سو اکہتر ہو گئے۔ پھر کہنے لگا: اے محمد ﷺ! تمھارا معاملہ ہم پر خلط ملط ہو گیا۔ ہمیں تو کچھ پتہ نہیں کہ تمھیں قلیل عطا ہوا ہے یا کثیر۔

پھر وہ اپنے ساتھیوں سے کہنے لگا: چلو ان کے پاس سے چلتے ہیں۔ اس کے بعد ابو یاسر نے اپنے بھائی حی بن اخطب اور جو اس کے ساتھ دیگر یہودی علماء تھے سے کہا: تمھیں کیا پتہ کہ شاید محمد ﷺ کو ان سب کا مجموعہ عطا ہوا ہو، اکہتر بھی، ایک سو اکتیس بھی، دو سو اکتیس بھی اور دو سو اکہتر بھی تو یہ کل سات سو چار سال بن گئے، تو وہ کہنے لگے: ہم پر تو محمد ﷺ کا معاملہ مشتبہ ہو گیا ہے۔''

سید باقر الحکیمؒ نے حروف مقطعات کے بارے میں مختلف اقوال نقل کرتے ہوئے یہ قول بھی نقل کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''أنها حروف من حساب الجمل، لان طريقة الحساب الابجدى المعروفة الآن كانت متداولة بين أهل الكتاب آنذاك، فهذه الحروف تعبر عن آجال اقوام معينين۔'' (7)

''ایک قول یہ ہے کہ یہ حروف جملوں کے حساب میں سے ہیں کیونکہ حروف ابجد کے حساب کا طریقہ جو آج معروف ہے اہل کتاب کے مابین اس زمانے میں رائج تھا پس یہ حروف قوموں کی معین عمروں کو بیان کرنے کے لئے ہیں۔''

یہ قول نقل کرنے کے بعد انھوں نے ابن کثیر اور سید رشید رضا کے اقوال نقل کیے ہیں جن میں اس نظریے کو رد کیا گیا ہے۔ سید رشید رضا لکھتے ہیں:

''ان اضعف ما قيل فى هذه الحروف و اسخفه ان المراد بها الاشارة باعداها فى حساب الجمل الى مدة هذه الامة أو مايشابه ذلك۔'' (8)

یعنی: ''ان سب اقوال میں سب سے کمزور اور احمقانہ قول یہ ہے کہ یہ حروف جملوں کے حساب سے اس امت کی مدت بتانے کے لئے ہیں یا پھر ایسی ہی کوئی اور بات۔''

جس حدیث کی طرف ابن کثیر نے اشارہ کیا ہے شاید وہی بنیاد بنی ہے کہ قدیم ترین مفسرین نے بھی مختلف آراء کو نقل کرتے ہوئے اس رائے کو بھی بیان کیا ہے اور بعض علماء و مفسرین نے اس پر کسی قسم کی تنقید بھی نہیں کی۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ بہت سے مفسرین مذکورہ روایت کے پیش نظر رائج حروف کے اعداد کو سامنے رکھتے ہوئے امت مرحومہ کی مدت عمر کی جمع تفریق میں مشغول رہے، جیسا کہ علامہ طبرسیؒ کی عبارت سے ظاہر ہوتا ہے۔ وہ بھی ایک قول یوں نقل کرتے ہیں۔

''ان المراد بها مدة بقاء هذه الأمة۔۔۔ الأمر هذه اقوال أهل التفسير۔'' (9)

یعنی: ''ایک قول یہ ہے کہ حروف مقطعہ سے مراد اس امت کی بقا کی مدت ہے۔ مقاتل بن سلیمان سے روایت ہے، مقاتل کہتا ہے کہ ہم نے سورتوں کے شروع میں آنے والے ان حروف کا مکررات حذف کرکے حساب کیا تو ۷۴۰ سال بنا اور یہ اس امت کی باقی مدت ہے۔ علی بن فضال مجاشعی نحوی کا کہنا ہے کہ مقاتل نے جن حروف کا ذکر کیا اس کا میں نے حساب کیا تو وہ تین ہزار پانچ سو ساٹھ بنتا ہے اور جب مکررات کو حذف کیا تو وہ چھ سو ترانوے بنتا ہے اور اللہ بہتر جانتا ہے کہ اس کی حقیقت کیا ہے اور میں یہ کہتا ہوں کہ میں نے بھی اس کا حساب کیا ہے اور میں نے بھی ایسا ہی پایا ہے نیز روایت کیا گیا ہے کہ جب یہودیوں نے ''الم'' سنا تو وہ کہنے لگے کہ محمد ﷺ کی حکومت کی مدت بہت کم ہے اور یہ اکہتر سال بنتی ہے اور جب الر، المر، المص اور کھیعص نازل ہوئے تو امر ان پر بہت گراں گزرا۔ یہ ہیں اس سلسلے میں اہل تفسیر کے اقوال۔''

استاد جوادی آملی نے بھی اس نظریے کو بے دلیل قرار دیا ہے۔ اس قول کے بارے میں ان کی رائے ملاحظہ فرمایئے۔

''روایاتی که مؤید این قول است۔۔۔ که ظاهراً مدعایی بی دلیل است۔'' (10)

یعنی: ''اس قول کی تائید کرنے والی روایات کا معتبر ہونا معلوم نہیں۔ اگرچہ علم حروف اور ہر حرف کے خواص کا علم مثلاً علم اعداد اور ہر عدد کے خاص اثرات کا علم اس کے مدعیوں کے نزدیک قابل قبول ہے اور ان کے بطلان پر کوئی دلیل بھی نہیں تاہم جو بات یہاں پیش نظر ہے وہ یہ ہے کہ کیا حروف مقطعہ بعض اقوام کی مدت عمر یا بعض قوموں کے زوال اور خاتمے کی طرف اشارہ ہیں تو ظاہراً یہ دعویٰ بے دلیل ہے۔''

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔جاری ہے

حوالہ جات

1 ۔ شیرازی، ناصر مکارم: تفسیر نمونہ (تہران، دارالکتب الاسلامیہ، ط ۱۳۶۸، ۵ھ ش) ج ۱۳، ص، ۱۵۸، ۱۵۷

2 ۔ اقبال، کلید کلیات اردو، (لاہور، ط اول، ۲۰۰۵) ص ۳۶۳

3۔ طبری، ابی جعفر محمد بن جریر (م ۳۱۰ھ): جامع البیان عن تاویل آی القرآن (لبنان، بیروت، دارالفکر، ۱۹۸۸ء) ج ۱، ص ۸۷ و ۸۸

4۔ طبرسی، فضل بن حسن: مجمع البیان فی تفسیر القرآن (بیروت، دارالمعرفۃ، ۱۹۸۶ء) ج ۱، ص ۱۱۲ و ۱۱۳

5۔ جوادی آملی، تسنیم، تفسیر قرآن کریم (قم، مرکز نشر اسراء، ۱۳۷۸ھ ش، ط اول) ج ۲، ص ۸۴

6۔ اسماعیل بن ابن کثیر، دمشقی (م ۷۷۴ھ) تفسیر القرآن العظیم (بیروت، دارالقلم، ط دوم) ج اول، ص ۳۷

7۔ الحکیم، سید محمد باقر، علوم القرآن (قم، مجمع الفکر الاسلامی، ط ثالث، ۱۴۱۷ھ) ص ۴۴۴

8۔ رشید رضا: تفسیر المنار (قاہرہ، دارالمنار، ط ثانی، ۱۹۴۷ء) ج ۱، ص ۱۲۲

9۔ طبرسی، فضل بن حسن: مجمع البیان فی تفسیر القرآن (بیروت، دارالمعرفۃ، ۱۹۸۶ء) ج ۱، ص ۱۱۳

10 ۔ جوادی آملی، تسنیم، تفسیر قرآن کریم (قم، مرکز نشر اسراء، ۱۳۷۸ھ ش، ط اول) ج ۲، ص ۸۵

قرآن کی نظر میں
دینی ثقافت کا مقام اوراہمیت

سید رمیز الحسن موسوی*
Srhm2000@yahoo.com

کلیدی کلمات: ثقافت، تہذیب، اعتقادات، اقدار، عرب معاشرہ، تعلیم وتربیت

خلاصہ

انسانی زندگی کا ثقافتی پہلو بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اگرانسان کی ثقافت گم ہو جائے تو زندگی کے دوسرے پہلو بھی متاثر ہوتے ہیں۔ ثقافت سے ہی اجتماعی زندگی میں انسان کی شناخت ہوتی ہے۔ دانشوروں کے مطابق "ثقافت اکتسابی یا ارادی یا شعوری طرز عمل کا نام ہے"۔ البتہ آج تک ثقافت یا کلچر کی کوئی جامع تعریف نہیں ہو سکی۔ ثقافت کو تشکیل دینے والے عناصر میں سب سے اہم عنصر عقائد و نظریات ہیں۔ مختلف اقوام میں گہری تبدیلیاں، عقائد و نظریات کی تبدیلی کے ساتھ ہی رونما ہوتی ہیں۔ جیسا کہ پیغمبر اکرم ﷺ کے مبعوث ہونے سے عربوں کے عقائد بدلے ہیں اور عقائد بدلنے سے اُن کی ثقافت میں بھی تبدیلی آئی ہے۔ ثقافت اور رسوم وآداب جیسے کلمات کے ساتھ اسلام کے لاحقے سے مراد یہ ہے کہ یہ سب چیزیں اسلام سے اخذ کی گئی ہیں۔ جب کسی معاشرے پر دینی وقرآنی اعتقادات کی حاکمیت ہو تو ایسا معاشرہ قرآنی واسلامی ثقافت کے تابع ہوگا اور اس کا کوئی بھی ثقافتی فعل قرآنی تعلیمات کے منافی نہیں ہوگا۔

قرآن کی نظر میں خدا کے برگزیدہ بندے ہی انسانی ثقافت کے سرپرست قرار پاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے معاشروں کے ثقافتی امور کی ذمہ داری قبول کرنے والوں کو برتری عطا فرمائی ہے۔ قرآن کی نظر میں حقیقی انسانی، معنوی اور پاکیزہ زندگی صحیح اور الٰہی ثقافت ہی کے زیر سایہ میسر آسکتی ہے۔ قرآن کی نظر میں اللہ تعالیٰ پر ایمان اور دین پر عمل ہی سے انسانوں کی مادی اور دنیوی زندگی میں رونقیں برقرار ہو سکتی ہیں۔ قرآن کے مطابق دینی ثقافت کی ترویج الٰہی فریضہ ہے۔ دینی ثقافت کے ماہرین کا سب سے بڑا جہاد قرآنی علوم ومعارف کی ترویج ہے۔

---

* ۔مدیر مجلّہ سہ ماہی "نور معرفت" نور الہدیٰ مرکز تحقیقات (نمت)، بھارہ کہو، اسلام آباد۔

تمہید

انسانی زندگی کے چار پہلو بہت اہمیت رکھتے ہیں ، جنہیں سیاسی ، معاشی ، اجتماعی اور ثقافتی پہلو کہتے ہیں ۔ انسانی زندگی کے ان سب پہلوؤں میں انسان کے ثقافتی پہلو کی بہت زیادہ اہمیت ہے ۔ اگر انسان اپنی ثقافت کو گم کر دے تو اس کی زندگی کے دوسرے تمام پہلو بھی متاثر ہونے لگتے ہیں اور وہ سیاسی ، معاشی ، اجتماعی لحاظ سے بھی گم ہو جاتا ہے ۔ انسان کی زندگی میں ہر بنیادی تبدیلی اُس کی ثقافت کے تابع ہو تی ہے ۔ دوسرے الفاظ میں انسانی زندگی کے تمام پہلو ایک دوسرے سے تعلق رکھتے ہیں اور ایک دوسرے سے متاثر ہوتے ہیں ۔ لیکن انسان کے مذکورہ تینوں پہلو اس کی ثقافت سے زیادہ تعلق رکھتے ہیں ۔ انسان کی زندگی میں ثقافت کی حیثیت ، انسانی بدن میں دوسرے اعضا کے مقابلے میں مغز و اعصاب جیسی ہے ۔ اگر انسان کا دماغ اور اعصاب کام کرنا چھوڑ دیں تو تمام بدن بیکار ہو جاتا ہے ۔ اس سے پہلے کہ ہم ثقافت کے انسانی زندگی پر اثرات کو قرآنی آیات کی روشنی میں دیکھیں ، خود ثقافت کا مفہوم اور معنیٰ ذکر کرتے ہیں ۔

ثقافت

ثقافت عربی زبان کا لفظ ہے جس سے مراد کسی قوم یا طبقے کی تہذیب ہے ۔ علماء نے اس کی یہ تعریف کی ہے : ''ثقافت اکتسابی یا ارادی یا شعوری طرز عمل کا نام ہے'' ۔ اکتسابی طرز عمل میں ہماری وہ تمام عادات ، افعال ، خیالات اور رسوم اور اقدار شامل ہیں جن کو ہم ایک منظّم معاشرے یا خاندان کے رکن کی حیثیت سے عزیز رکھتے ہیں یا ان پر عمل کرتے ہیں یا ان پر عمل کرنے کی خواہش رکھتے ہیں ۔ ایک انگریز ماہر نفسیات کے مطابق '' علم ، دانش ، ہنر ، افکار ، عقائد ، قوانین ، مقررات ، آداب ، رسوم اور دستورات کے مجموعہ کا نام ثقافت ہے'' خلاصہ یہ کہ وہ تمام تعلیمات و عادات جو ایک انسان اپنے معاشرہ کا عضو ہونے کے عنوان سے حاصل کرتا ہے انہیں ثقافت کہا جاتا ہے ۔

انگلش زبان میں ثقافت کے مترادف جو کلمہ استعمال ہوتا ہے وہ کلچر ہے ۔ تاہم آج تک ثقافت یا کلچر کی کوئی جامع و مانع تعریف نہیں ہو سکی ۔ لفظ ثقافت کے استعمال سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کلمہ کی بعض تعریفیں عام مفہوم اور بعض خاص مفہوم کی جانب اشارہ کرتی ہیں ۔ (1) اردو میں ثقافت کے مترادف ایک اور لفظ استعمال ہوتا ہے وہ '' تہذیب '' ہے ۔ اس سلسلے میں فیض احمد فیض کہتے ہیں : ''کلچر کے لئے ہمارے ہاں کوئی لفظ موجود نہیں ہے ہمارے ہاں پرانا لفظ تہذیب ہے جسے ہم "سی وی لیزیشن" اور " کلچر " دونوں کے لئے استعمال کرتے ہیں'' ۔ (2)

ثقافت سے ہی اجتماعی زندگی میں انسان کی شناخت ہوتی ہے اور یہی چیز ایک قوم وملت کی سب سے بڑی میراث سمجھی جاتی ہے۔ بعض لوگوں کے نزدیک کسی قوم کی میراث اس کے قدیم سکے، برتن، زیورات، لباس اور دیگر آثار قدیمہ ہیں، لیکن دیکھا جائے تو کسی قوم کی میراث فقط یہی چیزیں نہیں ہیں، بلکہ اُس قوم وملت کی رسوم وآداب، قومی وملی اقدار اور اعتقادات اس کی سب سے اہم میراث ہیں جن سے اُس کی ثقافت تشکیل پاتی ہے۔

اس سے واضح ہوا کہ انسان کی ثقافت جن عناصر سے تشکیل پاتی ہے اُن میں سب سے اہم عنصر اُس کے عقائد اور نظریات ہیں۔ جیسا کی تاریخ سے بھی ثابت ہے کہ مختلف اقوام وملل کے درمیان پیدا ہونے والی گہری سیاسی واجتماعی تبدیلیاں، اُن کے اعتقادات کی تبدیلی کے ساتھ رونما ہوئی ہیں اور دین کے سلسلے میں بھی سب سے اہم چیز اُصول دین ہیں کہ جنہیں اعتقادات کہا جاتا ہے۔

مثلاً پیغمبر اکرم ﷺ کی بعثت کی برکت سے عرب معاشرے میں جو تبدیلی اور انقلاب برپا ہوا ہے، اس کا سب سے بڑا سبب وہ اعتقادات تھے، جو پیغمبر اکرم ﷺ کی وجہ سے اس معاشرے میں پیدا ہوئے تھے۔ اس کی تائید قرآن مجید سے بھی ہوتی ہے کہ عرب معاشرہ حضرت محمد ﷺ کی بعثت سے پہلے انتہائی پستی میں مبتلا تھا۔ بت پرستی، جہالت، قتل وغارت اور وحشیانہ طرز زندگی، قساوت قلب اور فقر وفاقہ اس معاشرے کی نمایاں خصوصیت تھیں۔ (3)

لیکن رسول خدا ﷺ نے انتہائی کم عرصے میں اس معاشرے میں انقلاب برپا کر دیا تھا۔ آپ ﷺ نے لوگوں کو خداوند یکتا کی طرف دعوت سے اپنے کام کا آغاز کیا اور مشرکین عرب کو قیامت کے عذاب سے ڈرایا۔ جب لوگوں نے پروردگار عالم اور روز معاد کی حقانیت کو قبول کر لیا تو ان کے طرز زندگی اور معاشرت میں نمایاں تبدیلی رونما ہونے لگی، اُن کے رہن سہن کا انداز بدل گیا اور اُنہوں نے قتل وغارت کو چھوڑ کر بھائی چارے اور ایثار وفداکاری کو اپنا لیا۔ عداوت اور دشمنی برادری اور اُخوت میں تبدیل ہو گئی اور جہالت ونادانی کی جگہ علم ودانش نے لے لی۔ اس طرح مسلمان آہستہ آہستہ اسلام کے پیغام کو پوری دنیا تک پہنچانے میں کامیاب ہو گئے۔ اور بڑی بڑی بادشاہتیں دین اسلام کے سامنے ہیچ نظر آنے لگیں اور مسلمان دین اسلام کے تابع ایک عظیم تمدن تشکیل دینے میں کامیاب ہو گئے۔ قرآن کریم مسلمانوں کو اسی نعمت کی یاددہانی کراتے ہوئے فرماتا ہے:

" وَاعْتَصِمُواْ بِحَبْلِ اللّهِ جَمِيعًا وَلاَ تَفَرَّقُواْ وَاذْكُرُواْ نِعْمَتَ اللّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُم بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا وَكُنتُمْ عَلَى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَأَنقَذَكُم مِّنْهَا كَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللّهُ لَكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ۔ "(4)

ترجمہ: "اور تم سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو اور تفرقہ مت ڈالو، اور اپنے اوپر اللہ کی اس نعمت کو یاد کرو جب تم (ایک دوسرے کے) دشمن تھے تو اس نے تمہارے دلوں میں الفت پیدا کر دی اور تم اس کی نعمت کے باعث آپس میں بھائی بھائی ہو گئے، اور تم (دوزخ کی) آگ کے گڑھے کے کنارے پر (پہنچ چکے) تھے پھر اس نے تمہیں اس گڑھے سے بچا لیا، یوں ہی اللہ تمہارے لئے اپنی نشانیاں کھول کر بیان فرماتا ہے تاکہ تم ہدایت پا جاؤ۔"

پیغمبر اکرم ﷺ نے اس عظیم انقلاب کا آغاز انسانوں کے کائنات کے بارے میں تصور اور عقائد کو تبدیل کرنے سے کیا تھا۔ جب اعتقادات ،الٰہی بن گئے تو اقدار اور نظریات بھی تبدیل ہو گئے۔ جس کے نتیجے میں انسانوں کے کردار اور رفتار میں بھی انقلاب برپا ہو گیا تھا۔ مفسرین نے سورۂ زلزال کے ذیل میں ایک قصہ نقل کیا ہے جس میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ ایک شخص نے پیغمبر اکرم ﷺ کی خدمت میں آکر عرض کی: " جو کچھ خدا نے آپ کو تعلیم دی ہے اس میں سے مجھے بھی تعلیم دیجئے۔ " پیغمبر اکرم ﷺ نے اسے اپنے اصحاب میں سے ایک کے سپرد کر دیا تاکہ وہ اسے قرآن کی تعلیم دے۔ اور اس نے اسے سورہ "اذا زلزلت الارض" کی آخر تک تعلیم دی۔ وہ شخص اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور کہا: میرے لئے تو یہی کافی ہے۔ (ایک دوسری روایت میں آیا ہے کہ اس نے کہا: "تکفینی ھٰذہ الاٰیۃ " یہی ایک آیت میرے لئے کافی ہے)۔ پیغمبر اکرم ﷺ نے فرما یا اسے اس کے حال پر چھوڑ دو کہ وہ ایک مرد فقیہ ہو گیا ہے۔ (اور ایک روایت کے مطابق آپؐ نے فرمایا: "رجع فقیھا" وہ فقیہ ہو کر لوٹا ہے) اس کی وجہ بھی واضح ہے، کیونکہ جو شخص یہ جانتا ہو کہ ہمارے اعمال، چاہے ایک ذرہ کے برابر ہوں، یا رائی کے ایک دانہ کے برابر، ان کا حساب لیا جائے گا، تو وہ آج ہی سے اپنے حساب و کتاب میں مشغول ہو جائے گا اور اس کا اس کی تربیت پر سب سے زیادہ اثر ہوگا۔ (5)

انسانی ثقافت اور سیاسی و اجتماعی تبدیلیوں پر اعتقادات کے اثر انداز ہونے کی ایک اور مثال معاصر مغربی معاشرہ ہے۔ صنعتی انقلاب خصوصاً معاصر جدید سائنسی پیشرفت کی وجہ سے جو تبدیلیاں مغربی معاشروں میں رونما

ہوئی ہیں ان کی بازگشت چند بنیادی فلسفیانہ اعتقادات کی طرف ہوتی ہے۔ جن میں سیکولرازم، پلورازم اور لبرل ازم وغیرہ جیسے نظریات ہیں۔ان فلسفی نظریات نے مغربی معاشرے کو مکمل طور پر تبدیل کر دیا ہے اور دین اور ماورائے طبیعت مسائل ثانوی حیثیت اختیار کر چکے ہیں اور انسان خدا کی جگہ لے چکا ہے۔

اسی لئے اس معاشرے پر دنیا پرستی ،لذت پرستی اور انفرادیت پسندی حاکم ہو چکی ہیں۔ بلا شک وشبہ مغربی معاشرے کی یہ تبدیلی اس کے اعتقادات اور نظریات میں تبدیلی کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے اور ان جدید مادہ پرستانہ نظریات نے اس علاقے کے کلچر کو بھی مکمل طور پر تبدیل کر دیا ہے۔اب دنیا کے جس علاقے میں بھی یہ نظریات پھیل رہے ہیں یا پھیلائے جا رہے ہیں، وہاں کی ثقافت بھی تبدیل ہو رہی ہے۔ حتیٰ گزشتہ صدی میں مسلمان معاشروں میں بھی دینی اعتقادات کی بنیادیں کمزور ہونے کی وجہ سے مغربی ثقافت پھیلتی چلی گئی۔

اس تمہید کا خلاصہ یہ ہے کہ انسانی معاشروں کے اعتقادات ، نظریات ،اقدار اور آداب ورسوم کا نام ثقافت ہے اور ان چیزوں کے بدلنے سے انسان کی ثقافت بھی بدل جاتی ہے۔اس لئے ثقافت کی اہمیت اور مقام انسان زندگی میں بہت زیادہ ہے کیونکہ اس کا تعلق اس کے زندگی کے تمام پہلوؤں سے ہے۔اس کے تبدیل ہونے سے اس کے دوسرے پہلو بھی تبدیل ہونے لگتے ہیں۔اس سلسلے میں امام خمینیؒ لکھتے ہیں: " ثقافت کسی قوم وملت کی بنیاد ہے، اس ملت کی قومیت اور ایک قوم ہونے کی علامت ہے اور کسی ملت کے استقلال کی مضبوط بنیادوں کی نشانی ہے۔ لہٰذا دشمن نے کوشش کی ہے کہ ہماری ثقافت کو استعماری بنا دے اور ان کی جدوجہد صرف اس بات کیلئے تھی کہ ہمارے ملک میں صحیح معنی میں کوئی انسان پیدا نہ ہو۔ "(6)

اسلامی ثقافت

لغت میں اسلام سے مراد اطاعت ،فرمانبرداری، سر جھکانا ہے اور اصطلاح میں اُن تمام الٰہی اور آسمانی عقائد اور احکام کے مجموعے کو اسلام کہا جاتا ہے جو خاتم النبیّین حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ اللہ تعالیٰ کی جانب سے لے کر مبعوث ہوئے ہیں۔بنابریں ثقافت، اقدار، اعتقادات، رسوم وآداب کے ساتھ اسلام کے لاحقے سے مراد یہ ہے کہ یہ سب چیزیں اسلام سے اخذ کی گئی ہیں۔چونکہ تمام مسلمان دین اسلام پر اعتقاد رکھتے ہیں اور اسی کے احکام پر عمل پیرا ہیں لہٰذا ان کے رہن سہن اور آداب ورسوم کو اسلامی کہا جاتا ہے اور ان کی ثقافت بھی دین اسلام کے تابع ہوتی ہے۔ فیض احمد فیض اسلامی کلچر کے بارے میں کہتے ہیں: "اسلام چونکہ ایک عالمگیر مذہب ہے اس

لئے ہر مسلمان قوم کا کلچر اسلامی کلچر ہے، ہر مسلمان قوم کی تہذیب اسلامی تہذیب ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ ہر اسلامی ملک کی ایک قومی تہذیب بھی ہے ان دونوں باتوں میں کوئی تضاد نہیں۔" (7)

ایک اور مقام پر وہ کلچر اور تہذیب پر اسلام کے اثرانداز ہونے کے بارے میں کہتے ہیں: "تاریخی لحاظ سے ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام عرب کے خطے سے نکل کر جہاں بھی پہنچا، اس نے اسلامی تہذیب کو جامعیت سے جنم دیا۔ چنانچہ یہ کہنا سراسر غلط ہوگا کہ دین اسلام کا قومی تہذیبوں پر اثر نہیں ہوا۔ جہاں بھی ہمارا دین پہنچا ہے، اس نے وہاں کے معاشرے میں انقلاب پیدا کیا ہے اور اس انقلاب کی وجہ سے مختلف اسلامی ممالک کی قومی تہذیبوں میں ایک نہایت بنیادی فرق پیدا ہوا ہے اسی قسم کا بنیادی انقلاب اسلام آنے کے بعد ہندوستان کی تہذیب میں بھی پیدا ہوا ہے، جس کی وجہ سے یہاں کے وہ لوگ جو کہ مسلمان ہیں ان کی تہذیب یہاں کے ان لوگوں سے جو کہ غیر مسلم تھے، الگ ہو گئی اسی کی بنیاد پر ہم نے پاکستان کا مطالبہ کیا۔" (8)

خلاصہ یہ کہ جب کسی معاشرے پر دینی و قرآنی اعتقادات و اقدار کی حاکمیت ہو اور اس معاشرے کے تمام لوگ دینی قدروں پر اعتقاد رکھتے ہوں اور قرآن جیسی آسمانی کتاب کو اپنے لئے دستور حیات سمجھتے ہوں تو ایسا معاشرہ قرآنی و اسلامی ثقافت کے تابع ہوگا اور اس کا کوئی بھی ثقافتی فعل قرآنی تعلیمات کے منافی نہیں ہوگا اور اس پر حاکم تمام قدریں قرآن و اسلام ہی کے تابع ہوں گی، اُس کی معیشت سے لے کر سیاست تک قرآنی و دینی تعلیمات کی روشنی میں انجام پائے گی۔

قرآن کی نظر میں ثقافت کی اہمیت

قرآن کریم کی نظر میں انسان کی ثقافت خصوصاً اُس کے اعتقادات اور اقدار کی بہت زیادہ اہمیت ہے۔ اس مقالے میں دینی ثقافت کی اہمیت اور مقام و منزلت کو قرآن کی نظر میں پیش کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ قرآن مجید میں بہت سی ایسی آیات ملتی ہیں جن سے قرآن کی نظر میں ثقافت کی اہمیت اور مقام و منزلت نمایاں ہوتی ہے۔ ہم یہاں چند آیات کو بطور مثال ذکر کرتے ہیں:

معاشرتی ثقافت کے سرپرست

قرآن کی نظر میں خدا کے برگزیدہ بندے ہی انسانی ثقافت کے سرپرست قرار پاتے ہیں۔ قرآن انسانی ثقافت کو پسندیدہ اور الٰہی ثقافت میں تبدیل کرنے کے لئے اپنے برگزیدہ اور خالص بندوں کو انسانوں کی طرف مبعوث فرماتا ہے، جو انسانوں کی طاغوتی ثقافت سے الٰہی ثقافت کی طرف رہنمائی کرتے ہیں:

" وَلَقَد بَعَثْنَا فی کلّ أُمَّةٍ رَّسولاً أَنِ اعْبُدوا اللهَ وَ اجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ۔ "(9)

ترجمہ: " ہم نے ہر قوم اور اُمت میں کچھ رسول بھیجے ہیں تاکہ وہ خدائے یکتا کی عبادت کریں اور طاغوت سے اجتناب کریں۔"

پھر فرمایا:

" لَقَد مَنَّ اللهُ عَلی الْمُؤْمِنِینَ إِذْ بَعَثَ فِیهِمْ رَسولاً مِّنْ أَنفُسِهِمْ یَتْلُوا عَلَیهِمْ آیَاتِهِ وَ یُزَکِیهِمْ وَ یُعَلِّمُهُمُ الْکِتَاب وَ الْحِکمَةَ وَإِن کانُوا مِن قَبْلُ لَفِی ضلَالٍ مُّبِینٍ ۔ "(10)

ترجمہ: "خدا نے مؤمنین پر احسان کیا (کہ انہیں ایک عظیم نعمت بخشی) جبکہ ان میں انہی میں سے ایک رسول مبعوث کیا جو ان کے سامنے اس کی آیات پڑھتا ہے اور ان کا تزکیہ نفس کرتا ہے اور کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے اگرچہ وہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔"

اس آیت کے مطابق پیغمبر اکرم ﷺ نے تین پروگرام پیش کئے ہیں:

پہلا: پروردگار عالم کی آیات پڑھنا، تلاوت کرنا اور لوگوں کے کانوں اور افکار کو ان آیات سے آشنا کرنا۔ **دوسرا**: تعلیم یعنی ان حقائق کو ان کی روح تک پہنچانا۔ **تیسرا**: تزکیہ نفس کرنا، یعنی اخلاقی وانسانی ملکات کی تربیت اور نشوونما، چونکہ اصلی ہدف تربیت ہے۔ اور یہ تینوں کام انسانوں کے افکار واعتقادات، اقدار اور طرز معاشرت کو بدل دیتے ہیں۔ یعنی انسان کی ثقافت انہی تینوں کاموں کی وجہ سے تبدیل ہوجاتی ہے اور انبیائے کرام یہ تبدیلی لاتے ہیں۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے انبیائے کرام کو انسانی معاشروں کی ثقافت کی سرپرستی کی ذمہ داری سونپی ہے۔ اسی طرح بعض برگزیدہ انبیائے کرام کو برتری عطا کرنے کے بارے میں فرمایا:

" إِنَّ اللّهَ اصْطَفَی آدَمَ وَنُوحًا وَ آلَ إِبْرَاهِیمَ وَ آلَ عِمْرَانَ عَلَی الْعَالَمِینَ۔ "(11)

ترجمہ: " اللہ نے آدم، نوح، آل ابراہیم اور آل عمران کو سب جہانوں پر منتخب کرلیا۔"

پس ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فقط انسانوں کی تعلیم وتربیت کے لئے انبیائے کرام کو مبعوث فرمایا ہے اور کسی مقصد کے لئے انبیاء نہیں بھیجے، چونکہ تعلیم وتربیت ہی سے ثقافت بنتی ہے اور جب درست ثقافت بن جائے تو انسانی زندگی کے دیگر تمام امور بھی سنور جاتے ہیں۔

معاشرے میں ثقافتی امور کے ماہرین کا مقام

اللہ تعالیٰ نے ایسے علماء اور دانشوروں کو خصوصی اہمیت اور برتری عطا فرمائی ہے جو معاشروں کے ثقافتی امور کی ذمہ داری قبول کرتے ہیں اور ثقافتی میدان میں سرگرم عمل رہتے ہیں اور انسانی قدروں کی حفاظت کرتے ہیں۔ چنانچہ ایسے افراد کی منزلت ذکر کرتے ہوئے قرآن مجید فرماتا ہے:

"یَرْفَعِ اللّٰہُ الَّذِینَ آمَنُوا مِنکُمْ وَ الَّذِینَ أُوتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ وَ اللّٰہُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِیرٌ۔" (12)

ترجمہ: "تو اللہ ان لوگوں کو، جو تم میں سے ایمان لائے ہیں اور علم سے بہرہ ور ہیں، عظیم درجات بخشے گا اور اللہ اس سے جو تم کرتے ہو آگاہ ہے۔"

آیہ شریفہ کا معنیٰ یہ ہے کہ مؤمن اور غیر مؤمن کے درجات میں فرق ہے یقیناً مؤمن غیر مؤمن پر فضیلت رکھتا ہے لیکن عالم مؤمن کے درجات غیر عالم مؤمن سے بھی زیادہ ہیں۔ جیسا کہ پیغمبر اکرم ﷺ نے فرمایا: "إِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ بُغَاۃَ الْعِلْمِ۔" (13) یعنی: "اللہ تعالیٰ علم حاصل کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے۔" اسی طرح امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا: "عَالِمٌ یُنْتَفَعُ بِعِلْمِہِ أَفْضَلُ مِنْ سَبْعِینَ أَلْفَ عَابِدٍ۔" (14) یعنی: "جس عالم کے علم سے لوگ بہرہ مند ہوتے ہیں وہ ستر ہزار عبادت گزاروں سے بہتر ہے۔"

ایک اور نکتہ یہ کہ اسلام میں شہید کا مقام و مرتبہ بہت زیادہ ہے، لیکن امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ایک حدیث میں آیا ہے کہ علما کے قلم کی سیاہی خونِ شہداء سے افضل ہے: "إذا کان یوم القیامۃ جمع ا... عزو جل الناس فی صعید واحد و وضعت الموازین فتوزن دماء الشہداء مع مداد العلماء فیرجح مداد العلماء علی دماء الشہداء۔" (15)

یعنی: "جب قیامت کا دن ہوگا، اللہ تعالیٰ تمام لوگوں کو ایک ساتھ محشور فرمائے گا اور اس وقت میزان نصب کیئے جائیں گے، پس شہداء کے خون کو علما کے قلم کی سیاہی کے ساتھ وزن کیا جائے گا تو علما کے قلم کی سیاہی خون شہداء پر بھاری قرار دی جائے گی۔"

البتہ جس طرح شہداء کا مقام ایک جیسا نہیں اور اس کے درمیان بھی مراتب ہیں اسی طرح علما کے قلم بھی ایک جیسے نہیں ہوں گے، جو قلم شہید پرور ہوگا تو بلاشک وہی خون شہدا سے افضل قرار پائے گا۔

اسی طرح ایک اور حدیث میں نبی اکرم ﷺ سے منقول ہے:

" اللّٰھم ارحم خُلَفَائِ قَالُوا وَ مَا خُلَفَاؤُکَ قَالَ الَّذِینَ یُحْیُونَ سُنَّتِی وَ یُعَلِّمُونَھَا عِبَادَ اللّٰہِ وَ مَنْ یَحْضُرُہُ الْمَوْتُ وَ ھُوَیَطْلُبُ الْعِلْمَ لِیُحْیِیَ بِہِ الْإِسْلَامَ فَبَیْنَہُ وَ بَیْنَ الْأَنْبِیَاءِ دَرَجَۃٌ۔ " (16)

یعنی: "اے اللہ ! میرے خلفاپر رحم فرما! کہا گیا: آپؐ کے خلفا کون ہیں ؟فرمایا: وہ لوگ جو میری سنت کو زندہ کرتے ہیں اور اس کی تعلیم اللہ کے بندوں کو دیتے ہیں اور جس کی موت اس حالت میں آتی ہے کہ وہ حصول علم میں مشغول ہوتا ہے تاکہ اس کے ذریعے اسلام کو زندہ کرے اس کے اور انبیاء کے درمیان ایک درجہ کا فرق ہے۔"

ایک دوسری حدیث میں عابد پر عالم کی برتری کے بارے میں پیغمبر اکرم ﷺ سے منقول ہے کہ :

" فضل العالم علی العابد کفضل القمر لیلۃ البدر علی سائر الکواکب۔ " (17)

یعنی: "عابد پر عالم کو اسی طرح فضیلت حاصل ہے جیسے شب بدر کو تمام ستاروں پر فضیلت حاصل ہے۔"

ایک اور نکتہ یہ کہ قیامت کے دن مقام شفاعت ہر کسی کو حاصل نہیں ہوگا بلکہ یہ مقربین الٰہی کے ساتھ مختص ہوگا۔ لیکن ایک حدیث میں نبی اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ

" یشفع یوم القیامۃ ثلاثۃ الانبیاء ثم العلماء ثم الشھداء ۔" (18)

یعنی: " قیامت کے دن تین گروہ شفاعت کریں گے :انبیائے کرامؑ ،علماء اور شہداء۔"

ان آیات اور روایات سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ جو لوگ معاشرے کی ثقافت ،اخلاق اور اقدار کی سربلندی کے لئے سرگرم رہتے ہیں ،اُن کا مقام و مرتبہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہت بلند ہے خواہ زمین پر وہ گمنام ہی کیوں نہ ہوں لیکن آسمانوں پر اُن کا نام اور کام زندہ ہوتا ہے۔

صحیح ثقافت اور معاشرے کی معنوی زندگی

قرآن کی نظر میں حقیقی انسانی، معنوی اور پاکیزہ زندگی صحیح اور الٰہی ثقافت ہی کے زیر سایہ میسر آسکتی ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید کا فرمان ہے :

" یَاأَیھَا الَّذِینَ آمَنُوا استَجِیبُوا للّٰہِ وَ لِلرَّسولِ إِذَا دعَاکُمْ لِمَا یحْیِیکمْ وَ اعْلَمُوا أَنَّ اللّٰہَ یحُولُ بَینَ الْمَرْءِ وَ قَلْبِہِ وَ أَنَّہُ إِلَیْہِ تحْشرُونَ۔ " (19)

ترجمہ : "اے ایمان والو ! جب (بھی) رسول (ﷺ) تمہیں کسی کام کے لئے بلائیں جو تمہیں (جاودانی) زندگی عطا کرتا ہے تو اللہ اور رسول (ﷺ) کو فرمانبرداری کے ساتھ جواب دیتے

ہوئے (فوراً) حاضر ہو جایا کرو، اور جان لو کہ اللہ آدمی اور اس کے قلب کے درمیان (شانِ قربتِ خاصہ کے ساتھ) حائل ہوتا ہے اور یہ کہ تم سب (بالآخر) اسی کی طرف جمع کئے جاؤ گے۔"

اس آیہ مجیدہ سے واضح ہوتا ہے کہ حقیقی اور پاکیزہ زندگی خدا اور رسول ﷺ کی دعوت کو قبول کرنے سے ہی حاصل ہو سکتی ہے اور دین کے بغیر زندگی، محض حیوانی زندگی ہے۔اس مطلب کی مزید وضاحت یہ ہے کہ قرآن کی نظر میں زندگی کے کچھ مرتبے ہیں۔ کبھی تو ہم جڑی بوٹیوں اور پودوں کی زندگی دیکھتے ہیں جو کبھی سبز ہوتے ہیں اور کبھی زرد اور مرجھائے ہوئے۔قرآن ان کی جانب بھی زندگی کی نسبت دیتا ہے: اعْلَمُوا أَنَّ اللهَ يُحْيِي الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا" (20) یعنی: "جان لو! اللہ تعالیٰ زمین کو موت کے بعد زندگی عطا کرتا ہے۔" کبھی کسی حیوان کی زندگی کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: "إِنَّ الَّذِي أَحْيَاهَا لَمُحْيِي الْمَوْتَى۔ "(21) یعنی: "اللہ تعالیٰ کہ جس نے (زمین) کو زندہ کیا اور پھر مردوں کو بھی زندہ کرے گا۔" اور کبھی قرآن مجید انسانی، عقلی اور نظریاتی حیات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: أَوَ مَن كَانَ مَيْتًا فَأَحْيَيْنَاهُ۔" (22) یعنی: "جو مردہ اور گمراہ تھا اور اسے ہم نے ہدایت کی ہے۔"

کیا وہ بھی گمراہوں کی طرح ہے؟اور ایک مقام پر قرآن ابدی حیات اور اُخروی دنیا کے بارے میں فرماتا ہے: " يَا لَيْتَنِي قَدَّمْتُ لِحَيَاتِي "۔(23) یعنی: " کاش میں نے اپنی آج کی (قیامت اور روز آخرت) زندگی کے لئے کچھ چیز آگے بھیجی ہوتی" اور کبھی قرآن مجید میں حیات کا معنیٰ علم اور بے انتہاء توانائی اور قدرت کے معنیٰ میں آیا ہے جیسا کہ قرآن نے فرمایا: "وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِي لَا يَمُوتُ" (24) یعنی: " اور آپ ایسے ربّ پر توکل کیجئے کہ جس کے لئے موت ہے ہی نہیں" یعنی وہ لامحدود ہستی ہے جس کے لئے موت کا تصور تک نہیں کیا جاسکتا۔

حیات اور زندگی کے بارے میں جو کچھ ذکر کیا گیا ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ سورۂ انفال کی آیہ مجیدہ ۲۴ میں حیات سے مراد، معنوی اور عقلی حیات ہے بنابریں جو لوگ اللہ تعالیٰ پر اعتقاد نہیں رکھتے اور سیکولر زندگی گزارتے ہیں اگرچہ وہ مادی اور حیوانی زندگی رکھتے ہیں، لیکن قرآن کی نظر میں وہ انسانی اور عقلی زندگی سے محروم ہیں۔قرآن انسانوں کو انسانی اور عقلانی زندگی کی طرف دعوت دیتا ہے۔(25)

دینی ثقافت اور مادی زندگی کی رونقیں

قرآن کی نظر میں اللہ تعالیٰ پر ایمان اور اُس کے انبیائے کرامؑ کے ذریعے لائے ہوئے دین پر عمل ہی سے انسانوں کی مادی اور دنیوی زندگی میں رونقیں برقرار رہ سکتی ہیں۔ اگر لوگ ایک دوسرے سے جھوٹ نہ بولیں، خیانت نہ کریں، ظلم وستم سے پرہیز کریں دوسرے الفاظ میں ایک دوسرے کے حقوق کا خیال رکھیں تو یقیناً معاشروں میں اجتماعی اور معاشی سکون قائم ہو جائے گا اور انسان امن اور سکون کی زندگی گزار سکے گا، ایسے ہی معاشرے اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت کے مستحق قرار پاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں اسی حقیقت کی طرف متوجہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"وَ لَوْ أَنَّ أَهْلَ الْقُرَى آمَنُوا وَ اتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيهِم بَرَكَاتٍ مِّنَ السمَاءِ وَ الأَرْضِ وَ لَكِن كَذَّبُوا فَأَخَذْنَاهُم بِمَا كَانُوايَكْسِبُونَ ۔" (26)

ترجمہ: "اور اگر (ان) بستیوں کے باشندے ایمان لے آتے اور تقوی اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین سے برکتیں کھول دیتے، لیکن انہوں نے (حق کو) جھٹلایا، سو ہم نے انہیں ان اَعمالِ (بد) کے باعث جو وہ انجام دیتے تھے (عذاب کی) گرفت میں لے لیا۔"

ایک دوسری آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

"وَ لَوْ أَنَّهُمْ أَقَامُوا التَّوْرَاةَ وَ الانجِيلَ وَ مَا أُنزِلَ إِلَيهِم مِّن رَّبِهِمْ لأَكَلُوا مِن فَوْقِهِمْ وَ مِن تحْتِ أَرْجُلِهِم مِّنهُمْ أُمَّةٌ مُّقْتَصِدةٌ وَ كَثِيرٌ مِّنهُمْ ساءَ مَا يَعْمَلُونَ" (27)

ترجمہ: "اور اگر وہ لوگ تورات اور انجیل اور جو کچھ (مزید) ان کی طرف ان کے رب کی جانب سے نازل کیا گیا تھا (نافذ اور) قائم کر دیتے تو (انہیں مالی وسائل کی اس قدر وسعت عطا ہو جاتی کہ) وہ اپنے اوپر سے (بھی) اور اپنے پاؤں کے نیچے سے (بھی) کھاتے (مگر رزق ختم نہ ہوتا)۔ ان میں سے ایک گروہ میانہ رَو (یعنی اعتدال پسند ہے)، اور ان میں سے اکثر لوگ جو کچھ کر رہے ہیں نہایت ہی برا ہے۔"

اس آیہ مجیدہ سے پتا چلتا ہے کہ اجتماعی تقویٰ انسانی معاشروں کی معاشی اور اقتصادی حالت بدلنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے اور دینی ثقافت کے تابع اقتصادی نظام الٰہی نعمتوں کی فراوانی کا باعث بنتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی برکتیں نازل ہونے لگتی ہیں۔

ثقافتی اور معنوی مراکز کی حفاظت کے لئے جہاد

اللہ تعالیٰ، دینی ثقافتی اور عبادی مراکز کی حفاظت کی خاطر جہاد اور دفاع کو ضروری قرار دیتا ہے اور اسلامی جہاد کا فلسفہ ہی انہی مراکز کی حفاظت کو قرار دیتے ہوئے فرماتا ہے :

"الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ إِلَّا أَن يَقُولُوا رَبُّنَا اللهُ وَلَوْلَا دَفْعُ اللهِ النَّاسَ بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَصَلَوَاتٌ وَمَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ اللهِ كَثِيرًا وَلَيَنصُرَنَّ اللهُ مَن يَنصُرُهُ إِنَّ اللهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ۔" (28)

ترجمہ : "(یہ) وہ لوگ ہیں جو اپنے گھروں سے ناحق نکالے گئے صرف اس بنا پر کہ وہ کہتے تھے کہ ہمارا رب اللہ ہے (یعنی انہوں نے باطل کی فرمانروائی تسلیم کرنے سے انکار کیا تھا)، اور اگر اللہ انسانی طبقات میں سے بعض کو بعض کے ذریعہ (جہاد و انقلابی جد و جہد کی صورت میں) ہٹاتا نہ رہتا تو خانقاہیں اور گرجے اور کلیسے اور مسجدیں (یعنی تمام ادیان کے مذہبی مراکز اور عبادت گاہیں) مسمار اور ویران کر دی جاتیں جن میں کثرت سے اللہ کے نام کا ذکر کیا جاتا ہے، اور جو شخص اللہ (کے دین) کی مدد کرتا ہے یقیناً اللہ اس کی مدد فرماتا ہے۔ بیشک اللہ ضرور (بڑی) قوت والا (سب پر) غالب ہے۔"

گویا حق اور باطل کے تضاد و تصادم کے انقلابی عمل سے ہی حق کی بقا ممکن ہے۔ اگر ایماندار لوگ دینی غیرت سے عاری ہو جائیں اور ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائیں اور زمانے کے طاغوتوں، سامراجی قوتوں، مستکبروں اور لااُبالی اور سیکولر عناصر کی لوٹ مار اور تباہ کاریوں کا تماشا دیکھتے رہیں تو تھوڑی مدت میں عبادت خانے ویران ہو جائیں گے اور اُن کی جگہ فحاشی اور بدمعاشی کے مراکز کھل جائیں گے۔ کیونکہ عبادت گاہیں، انسانوں کو بیدار کرتی ہیں اور مسجد و محراب سے ظلم و ستم کے خلاف اعلان جنگ ہوتا ہے اور توحید کا پرچم بلند ہوتا ہے۔ مسجد ہر طاغوت اور مستکبر کے خلاف انسانی مورچے کی حیثیت رکھتی ہے جس سے درس حریت ملتا ہے اور انسان جذبہ توحید سے مالا مال ہوتا ہے۔

اسی لئے ہر زمانے کے طاغوت نے زندہ اور فعال مساجد کو ویران کرنے کی کوشش کی ہے اور اس کی معنوی قدر و قیمت کم کرنے اور معاشرے میں بے اثر کرنے کے لئے علمائے سو اور پیشہ ور اور دنیا پرست ائمہ جماعت سے استفادہ کیا ہے اور منبر سے لے کر محراب تک کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرنے کی سعی کی

ہے، لیکن جب منبر و محراب بیدار ہو جائے اور با تقویٰ علماء کے زیر سایہ ثقافتی، علمی و عبادی فعالیت شروع کر دے تو طاغوتی قوتوں کی نیندیں حرام ہو جاتی ہیں اور وہ اُن کے لئے قوانین سازی شروع کر دیتی ہیں۔

علامہ طباطبائی اس بارے میں لکھتے ہیں: " اللہ تعالیٰ، اپنے دین کی حفاظت کے لئے بعض لوگوں کا بعض دوسروں کے ذریعے دفاع کرتا ہے اور اگر فقط اس نے (اس آیت) میں عبادت گاہوں کا نام لیا ہے تو اس لئے کہ اگر یہ دفاع نہ ہوتا تو عبادت گاہیں تو دور کی بات ہے، اصل دین ہی باقی نہ رہتا اس لئے کہ عبادت گاہیں، دین کے مظاہر، شعائر اور علامتیں شمار ہوتی ہیں اور لوگ انہی کے ذریعے دین کی یاد میں رہتے ہیں اور ان میں بیٹھ کر دین کے احکام سیکھتے ہیں اور دین کا تصور اور نقشہ اُن کے اذہان میں محفوظ رہتا ہے۔" (29)

دینی ثقافت کی ترویج ایک الٰہی فریضہ

دینی عقائد، احکام اور اقدار اس قدر اہمیت رکھتی ہیں کہ جنگ کے زمانے میں بھی بعض لوگوں پر واجب ہے کہ وہ دینی احکام اور عقائد کی تعلیم جاری رکھیں تاکہ دینی تعلیم وتربیت کا سلسلہ رکنے نہ پائے اور دینی ثقافت متاثر نہ ہو۔ چونکہ دینی علوم کی ترویج کے بغیر دینی ثقافت نہ تو رائج ہو سکتی ہے اور نہ محفوظ رہ سکتی ہے۔ اس لئے مسلمان معاشرہ حالت جنگ میں بھی دینی ثقافت کی حفاظت کے لئے اس ثقافت کے مبلغین کی تعلیم وتربیت کو معطل کرنے کا مجاز نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ اس مسئلے کی اہمیت کے بارے میں فرمارہا ہے:

" وَ مَا كَانَ الْمُؤْمِنُونَ لِيَنفِرُوا كَافَّةً فَلَوْ لَا نَفَرَ مِن كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَ لِيُنذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ۔" (30)

ترجمہ: " مناسب نہیں کہ سب مؤمنین (میدان جہاد کی طرف) کوچ کریں، ہر گروہ میں سے ایک طائفہ کیوں کوچ نہیں کرتا (اور ایک حصہ باقی نہیں رہتا تاکہ دین اسلام کے معارف واحکام) سے آگاہی حاصل کریں اور اپنی قوم کی طرف بازگشت کے وقت انہیں ڈرائیں تاکہ وہ (حکم خدا کی مخالفت سے) ڈریں اور رک جائیں۔"

اس آیت کے شان نزول میں مرحوم طبرسی نے مجمع البیان میں ابن عباس سے روایت کی ہے کہ جس وقت پیغمبر اکرم ﷺ میدان جہاد کی طرف روانہ ہوتے تو سب مسلمان آپ کے ساتھ نکل پڑتے۔ پیچھے معذور افراد اور منافقین رہ جاتے، لیکن جب کچھ آیات منافقین کے بارے میں نازل ہوئیں اور خصوصاً جنگ تبوک سے منہ موڑنے والوں کو جس طرح سے وعید وملامت نے آگھیرا اس سے مومنین جہاد کے میدانوں میں شرکت کے لئے

اور زیادہ پختہ ہو گئے یہاں تک کہ وہ جنگیں جن میں پیغمبر ﷺ ذاتی طور پر شرکت نہیں کرتے تھے ان میں شرکت کے لئے بھی سب نکل پڑتے تھے اور رسول اللہ ﷺ کو تنہا چھوڑ دیتے تھے۔

اس صورت حال کے پیش نظر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی اور انھیں بتایا گیا کہ ضرورت کے علاوہ مناسب نہیں کہ سب مسلمان میدان جنگ کی طرف جائیں بلکہ ایک گروہ مدینہ کی طرف جائے اور مدینہ میں جانے والے افراد رسول اللہ ﷺ سے اسلامی معارف واحکام کی تعلیم حاصل کریں اور اپنے مجاہد دوستوں کو واپس آنے کے بعد تعلیم دیں۔

جہالت کے خلاف جہاد

زیر نظر آیت جہاد کے سلسلے میں گزشتہ آیات سے تعلق رکھتی ہے یہ ایک ایسے نکتے کی طرف اشارہ کرتی ہے جو مسلمان کے لئے حیات آفرین حیثیت رکھتا ہے اور وہ یہ کہ بلاشبہ جہاد بہت اہمیت رکھتا ہے اور اس سے پیچھے رہ جانا ننگ و عار اور گناہ ہے، لیکن بعض مواقع پر جہاں ضرورت تقاضا نہیں کرتی کہ تمام مسلمان میدانِ جہاد میں شرکت کریں خصوصاً ان مواقع پر جب پیغمبر ﷺ خود مدینہ میں رہ جائیں تو مناسب نہیں کہ سب جہاد کے لئے چل پڑیں بلکہ ضروری ہے کہ مسلمانوں کی ہر جماعت کے دو حصے ہوں۔ ایک حصہ فریضہ جہاد کو انجام دے اور دوسرا حصہ مدینہ میں رہ کر اسلام کے معارف کی تعلیم حاصل کرے۔اس سے اسلامی ثقافت کی ترویج کے لئے حصول علم کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔(31)

"تفقہ فی الدین" کا وسیع مفہوم

تفسیر نمونہ کے مؤلف لکھتے ہیں: اس میں شک نہیں کہ "تفقہ فی الدین" سے مراد تمام اسلامی معارف واحکام کا حصول ہے چاہے ان کا تعلق اصول دین سے ہو یا فروع دین سے، کیونکہ "تفقہ" کے مفہوم میں یہ تمام امور جمع ہیں لہٰذا مندرجہ بالا آیت اس بات پر واضح دلیل ہے کہ مسلمانوں میں سے ایک گروہ ہمیشہ واجب کفائی انجام دینے کے لئے تمام اسلامی مسائل میں تحصیل علم کرے اور فارغ التحصیل ہونے کے بعد اسلامی احکام کی تبلیغ کے لئے مختلف علاقوں کی طرف جائے، خصوصاً اپنی قوم اور جمعیت کی طرف آئے اور اسے اسلامی مسائل سے آشنا کرے۔ پس مندرجہ بالا آیت، اسلامی مسائل کی تعلیم و تعلم کے وجوب پر ایک واضح دلیل ہے دوسرے لفظوں میں تعلیم حاصل کرنا بھی واجب ہے اور تعلیم دینا بھی۔آج کی دنیا اگر جبری تعلیم پر فخر کرتی ہے تو قرآن نے چودہ سو سال پہلے اس سے بھی بڑھ کر معلّمین پر یہ کام فرض کیا ہے۔(32)

ثقافتی جہاد کی اہمیت

اس قرآنی آیت میں علمائے دین کہ جو درحقیقت دینی ثقافت کے ماہرین سمجھے جاتے ہیں، اُن کا سب سے بڑا جہاد قرآنی علوم و معارف کی ترویج ہے اور قرآن کے ذریعے کفار کو شکست دینا اور اسلام کی نظریاتی اور ثقافتی سرحدوں کی حفاظت کرنا ہے۔ لہٰذا قرآن مجید فرمارہا ہے: ''فَلا تُطِعِ الْکافِرِینَ وَ جاهِدْهُم بِهِ جِهَاداً کَبِیراً۔ ''(33) یعنی: '' کفار کی اطاعت نہ کرو اور اس (قرآن) کے ذریعے اُن کے ساتھ بڑا جہاد کرو۔''

قرآن کریم کی نظر میں ثقافتی جہاد ہی سب سے بڑا اور اہم جہاد ہے۔ اگر مسلمان معاشرہ جہاد کے اس محاذ پر کامیاب ہو جائے تو دوسرے تمام محاذ فتح کرلیتا ہے اور اگر ثقافتی محاذ پر ناکام ہو جائے تو دوسرے محاذوں میں کامیابی اس کے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ جیسا کہ اوپر سورۂ فرقان کی آیت نمبر ۵۲ میں گذر چکا ہے کہ قرآن کریم نے ثقافتی جہاد کی عظمت اور اہمیت کے پیش نظر اس جہاد کو جہاد کبیر کا نام دیا ہے۔ چونکہ قرآن مجید علمی، ثقافتی جہاد کا سب سے بڑا داعی ہے اور دشمنان اسلام کے ساتھ بحث و مباحثے کا سب سے مضبوط ذریعہ ہے۔ اگرچہ دشمنان اسلام نے شروع ہی سے ثقافتی یلغار کے ذریعے مسلمان معاشروں کو نقصان پہنچایا ہے اور اس سلسلے میں اُن کی کوششیں ابھی تک جاری ہیں اور عصر حاضر میں تو وہ جدید ترین ذرائع ابلاغ کے ذریعے مسلمان معاشروں پر ثقافتی یلغار کررہا ہے۔ لیکن قرآن مجید کے وسیلے سے اس یلغار کا جواب دیا جارہا ہے اور قرآن مسلمانوں کو اس یلغار کے خلاف دائمی جہاد کی تلقین کرتا ہے:

''جاهِدْهُم بِهِ ''یعنی اسی قرآن کے ذریعے اُن کے ساتھ جہاد کرو اور یہی جہاد کبیر ہے۔(34)

ثقافتی وسائل کی اہمیت کی ایک مثال

حدیث کے مطابق تمام صداؤں میں سے تین صدائیں بہت اہمیت رکھتی ہیں: ایک علماء کے قلم کی صدا، دوسری مجاہدین کے پاؤں کی صدا اور تیسری چرخے پر کاتنے کی آواز۔ اگر عصر حاضر میں ان تینوں صداؤں کی وضاحت کریں تو کہیں گے: چھاپخانے کی آواز، توپخانے کی آواز اور کارخانوں کی آواز یعنی ثقافتی، عسکری اور اقتصادی طاقت ہی سب سے اہم طاقت ہے۔ اسلام کی نظر میں ان تینوں صداؤں میں قلم کی صدا سب سے اہم ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ قلب پیغمبر ﷺ پر نازل ہونے والی سب سے پہلی آیات میں قلم کی اہمیت کو ہی بیان فرماتا ہے:

''اقْرَأْ بِاسمِ رَبِّكَ الَّذِی خَلَقَ O خَلَقَ الانسانَ مِنْ عَلَقٍ O اقْرَأْ وَ رَبُّكَ الأَكْرَمُ O الَّذِی عَلَّمَ بِالْقَلَمِ۔'' (35)

ترجمہ: ''پڑھ اپنے پروردگار کے نام سے جس نے جہان کو پیدا کیا۔ وہی جس نے انسان کو جمے ہوئے خون سے پیدا کیا۔ پڑھ کہ تیرا پروردگار سب سے زیادہ مکرم و باعزت ہے۔ وہی جس نے قلم کے ذریعے تعلیم دی۔ اور انسان کو وہ سب کو کچھ سکھا دیا جو وہ نہیں جانتا تھا۔''

تمام مفسرین کا اتفاق ہے کہ یہ آیات پیغمبر اکرم ﷺ پر سب سے پہلے نازل ہوئیں۔(36) پیغمبر اکرم ﷺ اُمی تھے یعنی کسی اُستاد سے درس پڑھے ہوئے نہیں تھے اور دوسری طرف پورے حجاز کا ماحول جہالت و نادانی کا ماحول تھا۔ قرآن میں سب سے پہلی آیات میں خلقت جیسی عظیم ترین نعمت کے ذکر کے بعد تعلیم و تعلم کے مسئلے کو پیش کیا گیا ہے۔ در حقیقت یہ آیات سب سے پہلے علقہ نام کی ایک ناچیز سی شئی سے انسانی جسم کی تکمیل کی خبر دیتی ہیں اور پھر تعلیم و تعلم بالخصوص قلم کے ذریعے روح کے تکامل کی بات کرتی ہیں۔

جس زمانے میں یہ آیات نازل ہو رہی تھیں اس وقت نہ فقط حجاز کا علاقہ جہالت و نادانی سے بھرا ہوا تھا بلکہ اس زمانے کی متمدن دنیا بھی قلم جیسے ثقافتی وسیلے کی اہمیت سے بے خبر تھی۔ لیکن عصر حاضر میں انسان کو نصیب ہونے والی تمام کامیابیاں خواہ وہ کسی بھی میدان میں ہوں، قلم ہی کی مرہون منت ہیں۔ دوسرے الفاظ میں تمام انسانی معاشروں کی تقدیر سب سے پہلے قلم ہی سے تعلق رکھتی ہے اور قلم ہی کے ذریعے قومیں عروج حاصل کرتی ہیں۔ انسانی معاشروں کی ترقی بھی ذمہ دار اور ایماندار قلم کے ذریعے انجام پاتی ہے اور ان کی تباہی اور بربادی بھی فاسد اور زہریلے قلموں کا نتیجہ ہے۔

اسی قلم سے انسانوں کو تباہ کرنے والی ثقافت رواج پاتی ہے اور اسی قلم کے ذریعے انسانیت کی تعمیر کرنے والی ثقافت کو پروان چڑھایا جاسکتا ہے۔ اسی لئے قرآن مجید نے قلم جیسے ثقافتی وسیلے کی قسم کھائی ہے اور فرمایا ہے: '' نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُونَ۔ '' (37) یعنی: (نون اور جو کچھ قلم سے لکھا جاتا ہے، اس کی قسم۔)(38)

ثقافت کو تباہ کرنے والے ہی سب سے بڑے ظالم ہیں

قرآن کریم کے مطابق جو افراد، لوگوں کی عزت و آبرو، جان و مال سے خیانت کرتے ہیں وہ ظالم ہیں، لیکن جو معاشرے کی ثقافت سے خیانت کرتے ہیں اور اسے تباہ کرتے ہیں قرآن کی منطق کے مطابق وہ سب سے بڑے ظالم ہیں:

''وَ مَنْ أَظْلَمُ مِمَّن مَّنَعَ مَسَاجِدَ اللهِ أَن يُذْكَرَ فِيهَا اسْمُهُ وَ سَعَى فِي خَرَابِهَا أُولَئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ أَن يَدْخُلُوهَا إِلا خَائِفِينَ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَ لَهُمْ فِي الآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ۔'' (39)

ترجمہ: ''اور اس شخص سے بڑھ کر کون ظالم ہوگا جو اللہ کی مسجدوں میں اس کے نام کا ذکر کیے جانے سے روک دے اور انہیں ویران کرنے کی کوشش کرے! انہیں ایسا کرنا مناسب نہ تھا کہ مسجدوں میں داخل ہوتے مگر ڈرتے ہوئے، ان کے لئے دنیا میں (بھی) ذلّت ہے اور ان کے لئے آخرت میں (بھی) بڑا عذاب ہے۔''

دین اسلام کا سب سے بڑا ثقافتی مرکز مسجد ہے اور جو مسجد سے روکتا ہے اور مسجد کو خراب کرتا ہے اور مسجد میں بیٹھنے والوں کو قتل کرتا ہے، اس سے بڑا ظالم کون ہو سکتا ہے؟

''وَ مَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَى عَلَى اللهِ كَذِباً أَوْ قَالَ أُوحِيَ إِلَيَّ وَ لَمْ يُوحَ إِلَيْهِ شَيْءٌ۔'' (40)

ترجمہ: ''اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹا بہتان باندھے یا (نبوت کا جھوٹا دعوی کرتے ہوئے یہ) کہے کہ میری طرف وحی کی گئی ہے حالانکہ اس کی طرف کچھ بھی وحی نہ کی گئی ہو۔''

'' فَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَى عَلَى اللهِ كَذِباً لِّيُضِلَّ النَّاسَ بِغَيْرِ عِلْمٍ إِنَّ اللهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ۔'' (41)

ترجمہ: ''پھر اس سے بڑھ کر ظالم کون ہو سکتا ہے جو اللہ پر جھوٹا بہتان باندھتا ہے تاکہ لوگوں کو بغیر جانے گمراہ کرتا پھرے۔ بیشک اللہ ظالم قوم کو ہدایت نہیں فرماتا۔''

پھر ایک اور مقام پر فرمایا:

'' وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَى عَلَى اللهِ الْكَذِبَ وَهُوَ يُدْعَى إِلَى الْإِسْلَامِ وَاللهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ۔'' (42)

ترجمہ: ''اور اس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہو سکتا ہے جو اللہ پر جھوٹا بہتان باندھے حالانکہ اسے اسلام کی طرف بلایا جارہا ہو، اور اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں فرماتا۔''

ان آیات سے واضح ہوتا ہے کہ دین میں تحریف، حق و باطل کو مخلوط کرنا، دین میں بدعت پیدا کرنا، خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اہل بیت اطہارؑ پر جھوٹ باندھنا اور دین سے پھر جانا (ارتداد) اور مسلمان معاشروں میں کفار ومشرکین کے نظام اور ثقافتوں کو رائج کرنا وغیرہ سب علمی وثقافتی خیانتیں ہیں۔ اور اس قسم کے خائن افراد کے بارے میں بہت سی آیات نازل ہوئی ہیں، جن کے مطابق ثقافتی خیانت سب سے بڑی خیانت ہے۔

دینی ثقافت کے بارے میں سہل انگاری کی ممانعت

قرآن کی نظر میں اسلامی و دینی ثقافت کی اہمیت اس قدر زیادہ ہے کہ قرآن مجید کسی شخص کو بھی اس کے بارے میں سہل انگاری، سستی اور سازش کرنے کی اجازت نہیں دیتا دوسرے الفاظ میں قرآن اسلامی ثقافت کو تباہ کرنے والوں یا تبدیل کرکے اس کی جگہ غیر دینی اور سیکولر ثقافت لانے والوں کی سخت مذمت کرتا ہے۔ اگر دینی ثقافت کی حفاظت کے لئے خون بھی بہانا پڑے اور اپنی جانیں بھی قربان کرنی پڑیں تو قرآن اس کی اجازت دیتا ہے۔

اس مطلب کی مزید وضاحت کچھ یوں کی جاسکتی ہے کہ اسلام کی تمام تعلیمات اور معارف خواہ وہ عقائد واحکام ہوں یا اخلاقیات، سب کے سب قطعی دلائل کے ساتھ دین کا جزء شمار ہوتے ہیں اور ان کے بارے میں کسی قسم کی اعتقادی اور عملی سہل انگاری قابل قبول نہیں ہے۔ اس سلسلے میں سہل انگاری سے مراد یہ ہے کہ دینی مسائل کے ذمہ دار یعنی علمائے دین اسلامی تعلیمات و معارف کے کسی ایسے حصے سے صرف نظر نہیں کرسکتے کہ جو کفار و مشرکین اور لادین عناصر کے اعتقاد اور ثقافت کے مخالف ہیں۔ یعنی وہ یہ سمجھیں کہ یہ معارف اور تعلیمات چونکہ اجتماعی اور بین الاقوامی نفرت اور اختلاف کا سبب بنتے ہیں لہٰذا ان سے صرف نظر کرلیا جائے۔ لہٰذا اگر کوئی دینی اصول اور حکم الٰہی دنیا پر حاکم سیکولر نظام کے ساتھ متعارض ہو جاتا ہے اور اکثریت کی تنقید کا نشانہ بنتا ہے تو ہمیں اپنے مادی مفاد کی خاطر اس کے بارے میں خاموشی اختیار نہیں کرنی چاہیے، بلکہ اس کی حفاظت کے لئے سعی و کوشش کرنی چاہیے اور دینی ثقافت کی خاطر اپنی جان و مال تک قربان کردینا چاہیے۔

اس کی سب سے بڑی دلیل انبیائے کرام علیہم السلام کی سیرت اور روش ہے کہ جنہوں نے مخالفین کی مخالفت کی پروا کئے بغیر اپنے عقائد حقہ کو منطق واستدلال کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اُنہوں نے کبھی بھی اپنے عقائد اور الٰہی معارف کو عوام الناس کے پسندیدہ عقائد اور خرافات کے مخالف ہونے کی وجہ سے اور اجتماعی نفرت و نزاع سے بچنے کے بہانے پوشیدہ نہیں رکھا۔ یہاں ہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مقدس تحریک کی مثال پیش کرسکتے ہیں جس میں آپؐ نے اپنے اعتقادات کو منطقی استدلال کے ساتھ لوگوں کے سامنے پیش کیا اور اپنے مخالفین کے خرافات پر مبنی غیر عقلی عقائد و نظریات کو بھی منطق و عقل کی روشنی میں باطل ثابت کیا اور انسانوں کی عمومی عقل کو مخاطب کرتے ہوئے اپنے الٰہی عقائد و معارف پیش کرتے ہوئے مشرکانہ معاشرے میں توحید کی بنیادیں مضبوط کیں۔ اللہ تعالیٰ نے مشرکین مکہ کی بڑی بڑی سازشوں کے مقابلے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو استقامت و صبر کے ساتھ اپنا مشن جاری رکھنے کی تاکید فرمائی اور مشرکین کے ساتھ ہر قسم کی نرمی و مصالحت سے منع فرمایا:

" فَلا تُطِعِ الْمُكَذِّبِينَ وَدُّوا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُونَ وَلا تُطِعْ كُلَّ حَلاَّفٍ مَهِينٍ۔ " (43)

ترجمہ: "سو آپ جھٹلانے والوں کی بات نہ مانیں، وہ تو چاہتے ہیں کہ (دین کے معاملے میں) آپ (بے جا) نرمی اِختیار کر لیں تو وہ بھی نرم پڑ جائیں گے اور آپ کسی ایسے شخص کی بات نہ مانیں جو بہت قسمیں کھانے والا اِنتہائی ذلیل ہے۔"

"فَلا تُطِعِ الْكافِرِينَ وَ جاهِدْهُمْ بِهِ جِهاداً كَبِيراً"۔(44)

ترجمہ: "ہر گز کفار کی اطاعت نہ کرو اور اس (اگر وہ قرآن اور دین حق کی مخالفت کریں تو) اُن کے ساتھ بڑا جہاد کرو۔"

پیغمبر اکرم ﷺ کو نہ فقط کفار و منافقین کے ساتھ نرمی اور مصالحت سے منع کیا گیا تھا بلکہ اُن سے دوری اختیار کرنے پر بھی مامور کیا گیا تھا۔آیت اللہ شہید مطہریؒ دین کے معاملے میں کفار کے ساتھ نرمی اور صلح جوئی کا رویہ اختیار کرنے کے بارے میں لکھتے ہیں:

"ایک مسئلہ کہ جس کی وضاحت ضروری ہے وہ سہل انگاری کا مسئلہ ہے۔۔۔کیا قرآن نے اس کام کی بطور کلی نفی کی ہے؟ یہاں دو باتیں ہیں: ایک قسم تو وہ جس کی قرآن نے بطور کلی نفی کی ہے اور پیغمبر اکرم ﷺ کو کسی بھی صورت اجازت نہیں دی چہ جائیکہ غیر پیغمبرؐ کو اجازت دے۔ اور وہ خود نظریہ اور فکر کی بنا پر صلح جوئی اور نرمی اختیار کرنا ہے۔جسے آج کل کی زبان میں آئیڈیالوجی کہتے ہیں۔یعنی اُن سے کہا جائے آؤ تم بعض باتوں سے صرف نظر کر لو اور ہم بھی اپنی بعض باتوں سے صرف نظر کر لیتے ہیں۔ محال ہے کہ کوئی دین حق، دشمن کے ساتھ اس طرح مصالحت اور نرمی کرنے کی اجازت دے۔ حتیٰ ایک چھوٹا سا مستحب اور مکروہ بھی قابل مصالحت نہیں ہے۔جو چیز وحی الٰہی کا حصہ ہے خواہ وہ چھوٹا سا مستحب یا مکروہ ہی کیوں نہ ہو، قابل مصالحت نہیں اور اس سے صرف نظر نہیں کیا جاسکتا۔ البتہ ایک دوسری چیز ہے جس میں مصالحت اور صرف نظر کیا جاسکتا ہے؛ اُس کا تعلق عمل سے نہ عقیدے اور نظریئے سے۔یعنی وہ اصول اور آئیڈیالوجی سے تعلق نہیں رکھتا، بلکہ ایک حکمت عملی ہے مثلاً ایک معاہدہ ہے اور اگر ہم کسی سے کوئی معاہدہ کرتے ہیں اور اسے نافذ کرتے وقت مصلحت کے طور پر فی الحال مؤخر کر دیتے ہیں۔قرآن نے نبی اکرم ﷺ سے یہ اختیار سلب نہیں کیا۔" (45)

اسلامی اصول اور آئیڈیالوجی ،اس قدر اہمیت رکھتی ہے حتیٰ پیغمبر اکرم ﷺ بھی کسی صورت میں ان میں کمی و پیشی کرنے کا حق نہیں رکھتے اور اگر ایسا کریں گے تو سخت ترین الٰہی عقاب کے مستحق بن سکتے ہیں۔ چنانچہ قرآن کا ارشاد ہے :

" تَنْزِيلٌ مِنْ رَبِّ الْعالَمِينَ وَ لَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنا بَعْضَ الْأَقاوِيلِ لَأَخَذْنا مِنْهُ بِالْيَمِينِ ثُمَّ لَقَطَعْنا مِنْهُ الْوَتِينَ فَما مِنْكُمْ مِنْ أَحَدٍ عَنْهُ حاجِزِينَ۔ " (46)

ترجمہ : " (یہ) تمام جہانوں کے رب کی طرف سے نازل شدہ ہے۔اور اگر وہ ہم پر کوئی (ایک) بات بھی گھڑ کر کہہ دیتے تو یقیناً ہم اُن کو پوری قوت و قدرت کے ساتھ پکڑ لیتے، پھر ہم ضرور اُن کی شہ رگ کاٹ دیتے پھر تم میں سے کوئی بھی (ہمیں) اِس سے روکنے والا نہ ہوتا۔"

اس سلسلے میں اسلام کی منطق جاہل کو آگاہ کرنا، فاسق کی تادیب کرنا، مخالفین کے سامنے برہان و دلیل قائم کرنا ہے نہ کہ اپنی دینی تعلیمات و معارف اور عقائد سے صرف نظر کرنا ہے۔اسلام باطل کے مقابلے میں نرمی کرنے او رچند روزہ مادی مفادات کی خاطر خاموشی اختیار کرنے سے منع کرتا ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید نے اپنے الٰہی اور مبنی بر حق اعتقادات کی خاطر صبر واستقامت کا مظاہرہ کرنے والوں اور خرافات اور ظالموں کے ظلم کے مقابلے میں قیام کرنے والوں کی مدح کی ہے۔ جس کی مثال قرآن مجید میں اصحاب کہف کا واقعہ ہے جن کی مدح وستایش میں سورۂ کہف کی آیات نازل ہوتی ہیں اور صبر واستقامت کرنے والوں کو بشارت الٰہی دی جاتی ہے۔(47)

ثقافتی مفاسد کا سدباب کرنے کی ضرورت

ثقافت کی اہمیت اس بات سے بھی واضح ہوتی ہے کہ قرآن مجید کی بہت سی آیات میں انبیائے کرام علیہم السلام کی جانب سے ثقافتی مفاسد کے خلاف جہاد کا ذکر ملتا ہے۔ قرآن ثقافتی مفسدین کے خلاف انبیاء علیہم السلام کے سخت رویئے کو نقل کرتا ہے اور ان کے اس کام کی مدح کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ اور انہیں اس لحاظ سے نمونہ عمل کے طور پر متعارف کراتا ہے مثلاً جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کوہ طور سے واپسی پر دیکھتے ہیں کہ سامری نے اُن کی قوم کو گمراہ کر دیا ہے تو اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام اس اعتقادی گمراہی کے مقابلے کے لئے چند قدم اُٹھاتے ہیں جن میں سے ایک یہ کہ اپنے بھائی کا مواخذہ کرتے ہیں اور اُن سے قوم کی اس گمراہی کے بارے میں پوچھ گچھ کرتے ہیں۔

اگر چہ اس مسئلے میں اُن کی بے گناہی ثابت ہو جاتی ہے۔ لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس عمل سے دوسروں پر واضح ہو جاتا ہے کہ قوم کی یہ گمراہی ایک سنگین جرم ہے جس پر دوسرے تو درکنار وہ اپنے بھائی کا

بھی مؤاخذہ کر سکتے۔اس کے بعد وہ اس گمراہی کے اصلی کردار یعنی سامری کی طرف جاتے ہیں،اور اس کو اس قدر شدید سزا دیتے ہیں کہ جو اس کے قتل سے بھی زیادہ سخت تھی۔معاشرے سے دھتکار دینا اور اسے گوشہ نشینی پر مجبور کرکے اس کو ایک نجس اور پلید انسان کی شکل میں تبدیل کر دینا، سخت ترین سزا تھی۔ اس سزا کے بعد قوم کا ہر شخص اس سے نفرت کرنے لگتا ہے اور پورا معاشرہ اس سے متنفر ہو جاتا ہے۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ثقافتی گمراہی ایک ایسا جرم ہے کہ جس کا ارتکاب کرنے والے قرآن کی نظر میں معاشرے کی نفرت اور لعنت کے مستحق قرار پانے چاہییں۔اس قرآنی قصے کی تفصیل سورۂ بقرہ کی آیات ۵۱ تا ۵۴ میں ذکر ہوئی ہے اور سورۂ طٰہٰ کی آیات ۹۴ تا ۹۷ میں بھی اس قصے کو بیان کیا گیا ہے۔

دوسرا واقعہ پیغمبر اکرم ﷺ کے زمانے کے منافقین کا ہے جو مسلمانوں میں فتنہ و فساد کی نیت سے ایک مسجد بناتے ہیں۔جسے قرآن ''مسجد ضرار'' کا نام دیتا ہے۔یہ مسجد مسلمانوں میں ثقافتی فساد پیدا کرنے کے لئے بنائی گئی تھی،جس کی تفصیل یہ ہے کہ کچھ منافقین رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور عرض کیا، ہمیں اجازت دیجیئے کہ ہم قبیلہ ''بنی سالم'' کے درمیان ''مسجد قبا'' کے قریب ایک مسجد بنالیں تاکہ ناتواں بیمار اور بوڑھے جو کوئی کام نہیں کر سکتے اس میں نماز پڑھ لیا کریں_اسی طرح جن راتوں میں بارش ہوتی ہے ان میں جو لوگ آپ ﷺ کی مسجد میں نہیں آسکتے اپنے اسلامی فریضہ کو اس میں انجام دے لیا کریں۔یہ اس وقت کی بات ہے جب پیغمبر خدا ﷺ جنگ تبوک کا عزم کر چکے تھے آنحضرتؐ نے انھیں اجازت دے دی۔

انھوں نے مزید کہا: کیا یہ بھی ممکن ہے کہ آپ ﷺ خود آکر اس میں نماز پڑھیں؟ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: اس وقت تو میں سفر کا ارادہ کر چکا ہوں البتہ واپسی پر خدا نے چاہا تو اس مسجد میں آکر نماز پڑھوں گا۔ جب آپ ﷺ جنگ تبوک سے لوٹے تو یہ لوگ آپؐ کے پاس آئے اور کہنے لگے ہماری درخواست ہے کہ آپؐ ہماری مسجد میں آکر نماز پڑھائیں اور خدا سے دعا کریں کہ وہ ہمیں برکت دے۔

یہ اس وقت کی بات ہے جب ابھی آنحضرت ﷺ مدینہ کے دروازے میں داخل نہیں ہوئے تھے اس وقت وحی خدا کا حامل فرشتہ نازل ہوا اور خدا کی طرف سے پیغام لایا اور ان کے کرتوت سے پردہ اٹھایا۔ اس مسجد کو بنانے کے سلسلے میں منافقین کے مقاصد کی وضاحت کرتے ہوئے قرآن مجید فرماتا ہے:

'' وَ الَّذِینَ اتخَذُوا مَسجِداً ضِرَاراً وَ کفْراً وَ تَفْرِیقَا بَینَ الْمُؤْمِنِینَ وَ إِرْصاداً لِّمَنْ حَارَبَ اللهَ وَ رَسولَهُ مِن قَبْلُ وَ لَیَحْلِفُنَّ إِنْ أَرَدْنَا إِلا الْحُسنی وَ اللهُ یَشهَدُ إِنهُمْ لَکَذِبُونَ۔'' (48)

ترجمہ: " اور (منافقین میں سے وہ بھی ہیں) جنہوں نے ایک مسجد تیار کی ہے (مسلمانوں کو) نقصان پہنچانے اور کفر (کو تقویت دینے) اور اہلِ ایمان کے درمیان تفرقہ پیدا کرنے اور اس شخص کی گھات کی جگہ بنانے کی غرض سے جو اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) سے پہلے ہی سے جنگ کر رہا ہے، اور وہ ضرور قسمیں کھائیں گے کہ ہم نے (اس مسجد کے بنانے سے) سوائے بھلائی کے اور کوئی ارادہ نہیں کیا، اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ وہ یقیناً جھوٹے ہیں۔" (49)

اس کے فوراً بعد رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا کہ مذکورہ مسجد کو جلا دیا جائے اور اس کے باقی حصے کو مسمار کر دیا جائے اور اس جگہ پر کوڑا کرکٹ ڈالا جایا کرے۔

اس واقعہ کے مطابق نبی اکرم ﷺ کا مسجد ضرار بنانے والے منافقین کے خلاف قاطعانہ قیام کرنا اور مسجد ضرار کو آگ لگا دینے کا حکم دینا ثقافتی مفاسد کے خلاف اسلام کے سخت رویئے کو ظاہر کرتا ہے۔ چونکہ یہ مسجد منافقین کی جانب سے لوگوں کو گمراہ کرنے لئے بنائی گئی تھی اور مسلمان معاشرے میں ثقافتی فساد کا باعث بن رہی تھی۔

خلاصہ یہ کہ ثقافت ہی سے انسان کی پہچان ہوتی ہے اور انسانی زندگی کے دوسرے تمام پہلو اس کی ثقافت کے تابع ہوتے ہیں اور یہ ثقافت اندرونی اور بیرونی عوامل سے اثر قبول کرتی ہے اور تمام انسانی اعتقادات، اقدار، نظریات اور علم ودانش، ہنر اور فنون اسی طرح رسوم ورواج اور معاشرتی عادات اس کے تحت تاثیر واقع ہوتی ہیں۔ اعتقادات اور اقدار کا ثقافت کو تشکیل دینے والے اہم ترین عناصر میں شمار ہوتا ہے۔

اسی لئے قرآن مجید نے دینی اعتقادات اور اقدار کے حوالے سے ثقافت کی اہمیت اور معاشرے میں اس کے مقام کو اُجاگر کیا ہے اور اس کی حفاظت کی تاکید فرمائی۔ قرآن مجید کی ان تعلیمات کے برعکس زندگی گزارنے اور ثقافتی مسائل میں سستی و سہل انگاری کی وجہ سے آج مسلمان معاشرے بے شمار مشکلات کا شکار ہو چکے ہیں۔

قرآنی نقطہ نظر سے اگر ہم اپنی موجودہ مشکلات کا جائزہ لیں تو واضح ہو جائے گا کہ ثقافتی مسائل کے بارے میں ہماری غفلت، سستی و سہل انگاری کی وجہ سے ہمارا معاشرہ دلدل میں دھنستا جارہا ہے، ہماری معیشت سے لے کر تعلیم وتربیت کا نظام، غیر اسلامی ثقافت کے تحت چل رہا ہے جس کے نتیجے میں نہ ہمیں معاشی امنیت حاصل ہے اور نہ اجتماعی امنیت۔ دن بدن ہمارا اجتماعی نظام بگڑ رہا ہے اور ہم اغیار کے دست نگر بن کر رہ گئے ہیں۔ چونکہ ہماری ثقافت ہی تباہ ہو چکی ہے لہٰذا دوسری ہر چیز کی تباہی یقینی ہے۔ یہ قرآن کو تنہا چھوڑنے اور تعلیمات قرآن سے منہ موڑنے کا نتیجہ ہے۔

*****

حوالہ جات

1۔ محمد تقی جعفری، فرہنگ پیرو فرہنگ پیشرو، ص ۳۵
2۔ فیض احمد فیض، پاکستانی کلچر اور قومی تشخص کی تلاش، ص ۲۴۔
3۔ جواد علی، تاریخ العرب والاسلام، ، ص ۱۶۹، ۱۷۴، آلوسی، بلوغ الارب، ج۱، ص۴۱
4۔ سورہ آل عمران، آیت ۱۰۳
5۔ شیرازی مکارم، تفسیر نمونہ ج ۲۷، ص ۲۳۴۔
6۔ امام خمینی، صحیفہ امام، ج۷، ص۵۷
7۔ فیض احمد فیض، پاکستانی کلچر اور قومی تشخص کی تلاش، ص ۲۴۔
8 ۔ایضاً
9۔ سورۂ نحل، آیت ۳۶
10 ۔ سورہ آل عمران، آیت ۱۶۴
11 ۔ سورۂ آل عمران، آیت ۳۳
12۔ سورۂ مجادلہ، آیت ۱۱
13۔ کلینی، الکافی، ج۱، ص۳۰
14۔ کلینی، الکافی، ج۱، ص ۳۴
15۔ شیخ صدوق، الأمالی، ص۱۶۹
16 ۔ مستدرک الوسائل، ج۱۷، ص۳۰۱
17 ۔ بحار الانوار، ج۶۱، ص۲۴۵
18 ۔ روضۃ الواعظین، ج۱، ص ۱۲
19 ۔ سورۂ انفال، آیت ۲۴
20 ۔ سورۂ حدید، آیت ۱۷
21 ۔ سورۂ فصلت، آیت ۳۹
22 ۔ سورۂ انعام، آیت ۱۲۲
23۔ سورۂ فجر، آیت ۲۴
24 ۔ سورۂ فرقان، آیت ۵۸

25۔ شیرازی مکارم، تفسیر نمونہ، ج۷، ص۱۲۸
26۔ سورۂ اعراف، آیت ۹۶
27۔ سورۂ مائدہ، آیت ٦٦
28۔ سورۂ حج، آیت ۴۰
29۔ طباطبائی، محمد حسین، تفسیر المیزان، ج۱۴، ص ۳۸۴
30۔ سورۂ توبہ، آیت ۱۲۲
31۔ شیرازی، مکارم، تفسیر نمونہ، ج۸، ص ۲۵۵
32 (ایضاً)۔
33 (سورۂ فرقان، آیت ۵۲)۔
34۔ شیرازی، مکارم، تفسیر نور، ج٦، ص۲٦۹
35۔ سورۂ علق، آیت ۱۔۵
36۔ شیرازی، مکارم، تفسیر نمونہ، ج۲۷، ص۱۵۹
37۔ سورۂ قلم، آیت ۱
38۔ شیرازی، مکارم، تفسیر نمونہ، ج۲۷، ص۱٦۰
39۔ سورۂ بقرہ، آیت ۱۱۴)۔
40۔ سورۂ انعام، آیت ۹۳)۔
41۔ سورۂ انعام، آیت ۱۴۴
42۔ سورۂ صف، آیت ۷
43۔ سورۂ قلم، آیت ۱۰، ۸
44۔ سورۂ فرقان، آیت ۵۲
45۔ مطہری، مجموعہ آثار، ج۱۷، ص ۲۸۴
46۔ سورہ الحاقہ، آیت ۴۳،۴۴
47۔ سورۂ کہف، آیات، ۹تا۲۰
48۔ سورہ توبہ، آیت ۱۰۷
49۔ مسجد ضرار کا واقعہ سورہ توبہ ۱۰۷تا۱۱۰ میں بیان ہوا ہے

اسلام اور معاشرتی عدل وانصاف

سید حسنین عباس گردیزی*

hasnain.gardezi@gmail.com

کلیدی کلمات: عدل ،قرآن کا عادلانہ نظام ،میانہ روی ،قصاص ،معاشی عدالت،معاشرتی عدل ،اسراف

خلاصہ

اسلام عدل اور اعتدال کا مکتب ہے۔عدل سے مراد ہر چیز کو اس کے موقع و محل پر رکھنا اور ہر کام کو احسن طریقے سے انجام دینا ہے۔ اللہ تعالی عادل ہے اوراس کا ہر فعل عدل وحکمت پر مبنی ہے۔ تکوینی اعتبار سے یہ کائنات خداکے عادلانہ نظام پر قائم ہے اور تشریعی اعتبار سے انسانوں کے لیے اللہ تعالی کی طرف سے جوضابطہ حیات، قانون اور شریعت دی گئی ہے وہ بھی نظام عدل پراستوار ہے۔اسلام میں تمام امور اور احکام میں ایک خاص اعتدلال حاکم ہے۔اسلامی احکام میں عدالت اور اعتدلال کا عنصر، درحقیقت اسلام کے متوازن، متعادل اور متناسب دین ہونے پر دلالت کرتے ہے۔

اس مقالے میں قرآن اور سیرت معصومینؑ کی روشنی میں اسلامی عدل ونصاف کی وضاحت کرنے کی سعی کی گئی ہے۔اور قرآن کے عادلانہ طرز عمل کو آیات اورسیرت معصومینؑ کی روشنی میں واضح کیا گیا ہے اور اس میں قصاص،عبادت،تعریف وتنقید،محبت ودشمنی،روزمرہ اخراجات،خاندانی اور عائلی زندگی،معاشی زندگی،وسائل کی تقسیم،چیزوں کے استعمال،معاشرتی عدل وانصاف اور قانون کی نظر میں مساوات جیسے عناوین کے بارے میں وضاحت کی گئی ہے۔

*۔چیئر مین نور الہدی ٹرسٹ،مدرس جامعۃ الرضاو مدیر اعلیٰ مجلّہ نور معرفت "نمت" بارہ کہو اسلام آباد۔

مقدّمہ

اسلام عدل اور اعتدال کا مکتب ہے، اسلام راہ مستقیم ہے اور اسلامی امت ایک وسطی، درمیانی اور معتدل امت ہے۔ جیسا کہ قرآن فرماتا ہے:

"وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِّتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَن يَتَّبِعُ الرَّسُولَ مِمَّن يَنقَلِبُ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ وَإِن كَانَتْ لَكَبِيرَةً إِلَّا عَلَى الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُضِيعَ إِيمَانَكُمْ إِنَّ اللَّهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوفٌ رَّحِيمٌ۔" (1)

ترجمہ: " اور اسی طرح ہم نے تمہیں امت وسط بنایا دیا تاکہ تم لوگوں پر گواہ رہو اور رسول تم پر گواہ رہیں اور آپ پہلے جس قبلے کی طرف رخ کرتے تھے اسے ہم نے صرف اس لئے مقرر کیا تھا تاکہ ہم رسول کی اتباع کرنے والوں کو الٹا پھر جانے والوں سے پہچان لیں اور یہ حکم اگرچہ سخت دشوار تھا مگر اللہ کی طرف سے ہدایت یافتہ لوگوں کے لئے (اس میں کوئی دشواری نہیں) اور اللہ تمہارے ایمان کو ضائع نہیں کرے گا، اللہ تو لوگوں کے حق میں یقیناً بڑا مہربان، رحیم ہے۔"

اسلام کا سارا نظام، عدل پر استوار ہے اس کے احکامات عادلانہ، متوازن اور متناسب ہیں، اس کی تعلیمات میں اعتدال پایا جاتا ہے اس کے فرمان عدل وانصاف پر مبنی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے خود عدل کو قائم کرنے کا حکم دیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: "إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ۔" (2) یعنی: "یقیناً اللہ عدل اور احسان کا حکم دیتا ہے۔" عدل کا مطلب یوں بیان ہوا ہے: "اِعطاء کُلِّ ذی حقّ حقَّهٗ۔" یعنی: "ہر صاحب حق کو اس کا حق دینا۔" پس دوسروں کے حقوق کا خیال رکھنا اور ان کی ادائیگی عدل کہلاتی ہے اور دوسروں کے حقوق پائمال کرنا ظلم کہلاتا ہے۔ ظلم عدل کا متضاد ہے۔

عدل کا ایک اور معنی بھی کیا گیا ہے جو اول الذکر معنی سے زیادہ وسیع ہے۔ اس کے مطابق عدل سے مراد " وضع کل شیئ فی موضعه " یعنی ہر چیز کو اس کے موقع و محل پر رکھنا اور ہر کام کو احسن طریقے سے انجام دینا عدل کہلاتا ہے۔ اس تعریف کی رو سے عدل حکمت کے مترادف ہے اور عادلانہ کام، حکیمانہ کام کے مساوی قرار پاتا ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ عادل ہے اس کا ہر فعل عدل وحکمت پر مبنی ہے۔ تکوینی اعتبار سے یہ کائنات اس مقدس ذات کے عادلانہ نظام پر قائم ہے کائنات کے تمام امور میں عدل کی حکمرانی ہے اور ہر

چیز میں عدل کارفرما ہے۔اسی طرح تشریعی اعتبار سے انسانوں کے لئے اسی کی طرف سے جو ضابطہ حیات، قانون اور شریعت دی گئی ہے وہ بھی اس حکیم ذات کے نظام عدل پر استوار ہے۔

پس اسلام میں اگر گریہ وزاری اور خوف الٰہی سے رونے پر تاکید ہے تو میدان جنگ میں تلوار و نیزے کا ذکر ہے اگر دین بدن کی صحت وسلامتی کا پروگرام دیتا ہے تو روح کی ترقی اور بلندی کا بھی درس دیتا ہے۔ اسلام میں جہاں نماز (اللہ تعالیٰ سے رابطہ) کا حکم ہے وہاں زکوۃ (لوگوں سے رابطہ) کا بھی حکم ہے۔اگر اسلام نے ہمیں تولیٰ یعنی اللہ، رسولؐ اور اولیاء الٰہی سے دوستی اور محبت کا فرمان دیا تو اس کے مقابلے میں ان کے دشمنوں سے دوری اور نفرت کا بھی حکم صادر کیا ہے۔

ایک طرف اسلام اگر علم کی حمایت کرتا ہے۔ تو دوسری طرف عمل پر بھی زور دیتا ہے۔اگر ایمان کی بات کرتا ہے تو اس کے ساتھ عمل صالح کو بھی لازم قرار دیتا ہے اگر خدا پر بھروسہ اور توکل کی تعلیم دیتا ہے تو اسی وقت سعی اور کوشش کو بھی ضروری سمجھتا ہے۔اگر اسلام میں مالکیت کا احترام کیا جاتا ہے تو دوسری جانب دوسروں کو ضرر پہنچانے اور مالکیت سے سوء استفادہ کرنے کو بھی ممنوع قرار دیتا ہے۔ اگر عفو ودرگذر کا حکم دیتا ہے تو حدود اور سزاؤں کے اجراء کا قطعی فرمان بھی جاری کرتا ہے۔ جہاں اسلام عبادت پر زور دیتا ہے وہاں عقل وفکر کی اہمیت کو بھی اجاگر کرتا ہے۔

یہ تمام امور اسلام کے متوازن، متعادل اور متناسب دین ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔اسلام میں تمام عہدوں کے لئے عدالت بنیادی شرط ہے۔ اسلام میں عادلانہ نظام یا معاشرتی عدالت سے مراد تمام حقوق کی حفاظت، قانون کی نظر میں سب کا مساوی اور برابر ہونا،امتیازات کی نفی، طبقاتی تقسیم کی نفی اور ظلم وانصافی کا مکمل خاتمہ ہے۔ ایک اسلامی نظام میں حکمران سے لے کر امام جماعت تک، قاضی سے لے کر ولایت فقیہ تک، بیت المال کے مسئول آڈیٹر جنرل سے لے کر کلرک تک، سب افراد کو عادل ہونا چاہئے۔ یہاں تک کہ عدالت میں گواہوں کو عادل ہونا چاہئے۔طلاق کے مسئلہ میں بھی گواہوں کا عادل ہونا شرط ہے۔ خبر نگاری میں بھی صرف عادل افراد کی خبر پر اطمینان کیا جاسکتا ہے غیر عادل کی خبر قابل تحقیق ہے۔عادل سے مراد وہ اشخاص میں جو بُری شہرت کے حامل نہ ہوں، پہلے کسی جرم میں سزا یافتہ نہ ہوں اور نیکی اور تقویٰ میں معروف ہوں۔ مختصر یہ کہ اسلام نے عدل کو بہت زیادہ اہمیت دی ہے اور معاشرے کے تمام شعبہ ہائے زندگی میں خواہ وہ حقوق کے امور ہوں یا معاشرتی مسائل ہوں یا کہ خاندانی

معاملات ہوں یا پھر ان کا تعلق معاشیات سے ہو یا سیاسیات سے؛ سب کا تعلق اور بنیاد عدل وانصاف پر قائم ہے۔ حتیٰ اسلام کے نظام مساوات کی اساس بھی عدل ہے۔ اپنی بات کے اثبات کے لئے ہم قرآن، حدیث اور سیرت معصومین علیہم السلام کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

قرآن کا عادلانہ طرز عمل

1. جب قرآن شراب کو حرام قرار دیتا ہے تو اس سے پہلے اس کے ظاہری فوائد کی طرف اشارہ کرتا ہے پھر فرماتا ہے: " يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيهِمَا إِثْمٌ كَبِيرٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَإِثْمُهُمَا أَكْبَرُ مِن نَّفْعِهِمَا وَيَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ قُلِ الْعَفْوَ كَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللّهُ لَكُمُ الْآيَاتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُونَ۔ "(3)
2. ترجمہ: "لوگ آپ سے شراب اور جوئے کے بارے میں پوچھتے ہیں، کہدیجیے: ان دونوں کے اندر عظیم گناہ ہے اور لوگوں کے لئے کچھ فائدے بھی، مگر ان دونوں کا گناہ ان کے فائدے سے کہیں زیادہ ہے اور یہ لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں؟ کہدیجیے: جو ضرورت سے زیادہ ہو، اس طرح اللہ اپنی نشانیاں تمہارے لئے کھول کر بیان فرماتا ہے تاکہ تم سوچو۔"
3. اسلام اپنے تمام امتیازات اور خصوصیات کے باوجود دیگر آسمانی کتابوں کو نظر انداز نہیں کرتا اور فرماتا ہے: "وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ مِنَ الْكِتَابِ هُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ إِنَّ اللّهَ بِعِبَادِهِ لَخَبِيرٌ بَصِيرٌ۔ "(4)

ترجمہ: "اور ہم نے جو کتاب آپ کی طرف وحی کی ہے وہی برحق ہے، یہ ان کتابوں کی تصدیق کرتی ہے جو اس سے پہلے آئی ہیں، یقیناً اللہ اپنے بندوں سے خوب باخبر، ان پر نظر رکھنے والا ہے۔"

4. اہل کتاب کی امانتداری کے حوالے سے سب کو ایک لاٹھی سے نہیں ہانکتا بلکہ فرماتا ہے: "وَمِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ مَنْ إِن تَأْمَنْهُ بِقِنطَارٍ يُؤَدِّهِ إِلَيْكَ وَمِنْهُم مَّنْ إِن تَأْمَنْهُ بِدِينَارٍ لاَّ يُؤَدِّهِ إِلَيْكَ إِلاَّ مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَآئِمًا ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُواْ لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الأُمِّيِّينَ سَبِيلٌ وَيَقُولُونَ عَلَى اللّهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُونَ۔ "(5) یعنی: "اور اہل کتاب میں کوئی ایسا بھی ہے کہ اگر آپ اسے ڈھیر دولت کا امین بنادیں تو وہ آپ کو لوٹا دے گا، البتہ ان میں کوئی ایسا بھی ہے جسے اگر آپ اک دینار کا بھی امین بنادیں تو وہ آپ کو ادا نہیں کرے گا جب تک آپ اس

کے سر پر کھڑے نہ رہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں: ناخواندہ (غیر یہودی) لوگوں کے بارے میں ہم پر کوئی ذمے داری نہیں ہے اور وہ جان بوجھ کر اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں۔"

کفار و دشمنوں کے ساتھ عدل وانصاف

1. غیر مسلم اگر فتنہ پرور نہ ہو اپنے باطل نظریات کو لوگوں میں رائج کرنے اور حق کا راستہ روکنے میں کوئی کردار ادا نہ کرے تو اسلام میں اس کے لئے پیغام امن ہے لیکن اگر وہ فتنے سے باز نہیں آئے تو پھر مسلمانوں کو ان سے جنگ کا حکم دیا گیا ہے۔ فتنے اور لڑائی سے باز آجانے کی صورت میں ان پر کوئی زیادتی نہ ہوگی۔ ارشاد رب العزت ہے: "فَإِن قَاتَلُوكُمْ فَاقْتُلُوهُمْ كَذَٰلِكَ جَزَاءُ الْكَافِرِينَ۔" (6) یعنی: "لیکن اگر وہ تم سے لڑیں تو تم بھی ان سے لڑائی کرو کافروں کی ایسی ہی سزا ہے۔"
2. اسلام نے کسی کو بھی ناحق مارنے کی اجازت نہیں دی لیکن اگر کوئی شخص ناحق مارا جائے تو عدل کے تقاضوں کے مطابق اس کے وارث کو اختیار ہے کہ وہ قصاص لے یا دیت لے کر قصاص معاف کرے۔ قرآن فرماتا ہے: "وَمَن قُتِلَ مَظْلُومًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهِ سُلْطَانًا فَلَا يُسْرِف فِّي الْقَتْلِ إِنَّهُ كَانَ مَنصُورًا۔" (7) یعنی: "اور جو شخص ناحق مارا جائے تو ہم نے اس کے ولی کو (قصاص کا) اختیار دیا ہے، پس اسے بھی قتل میں حد سے تجاویز نہیں کرنا چاہیے۔"

قتل میں اسراف نہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وارث کو صرف قاتل سے قصاص لینے کا حق ہے دیگر عزیزوں سے نہیں۔ ایک کے بدلے میں صرف ایک مارا جائے گا زیادہ نہیں مگر انسانی حقوق کا پرچار کرنے والے اپنی قوم کے ایک فرد کا قصاص دوسری پوری قوم سے لیتے ہیں۔ قرآن کے اس حکم کا عملی نمونہ ہمیں حضرت علی علیہ السلام کی سیرت میں ملتا ہے۔ حضرت علی علیہ السلام نے ضربت کھانے کے بعد اپنے بیٹوں کو وصیت کرتے ہوئے فرمایا: "لاتَقْتُلُنَّ بِی اِلَّا قَاتِلِی۔۔۔فَاضْرِبُوْهُ ضَرْبَةً بِضَرْبَةٍ۔" یعنی: "میری شہادت کے بہانے لوگوں کا قتل عام نہ کرنا بلکہ صرف میرے قاتل (ابن ملجم کو قتل کرنا۔" پھر

فرمایا اس نے مجھے ایک ضربت ماری ہے تم بھی اُسے ایک ضربت لگانا۔ (مکتوب، ۴۷) حضرت علی علیہ السلام اپنے خون میں غلطان تھے لیکن عدل وانصاف کو قائم رکھا اور عدل کے مدار سے خارج نہیں ہوئے۔

3. اسلام کسی پر زیادتی کرنے کا حکم نہیں دیتا اور اگر کوئی زیادہ کرے تو اس کا اسی طرح سے بدلہ لینے کا حکم دیتا ہے یعنی بدلہ لینے میں عدل وانصاف کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں۔ ارشاد الٰہی ہے کہ: "فَمَنِ اعْتَدَىٰ عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدَىٰ عَلَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ۔" (8)

ترجمہ: "پس جو تم پر زیادتی کرے تو تم بھی اس پر اسی طرح زیادتی کرو جس طرح اس نے تم پر زیادتی کی ہے اور اللہ (تعالیٰ) سے ڈرتے رہو اور جان لو کہ اللہ متقین کے ساتھ ہے۔"

4. دشمنوں کے ساتھ عدل ارشاد ہوتا ہے: "يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ لِلَّهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ۔" (9) یعنی: "اے ایمان والو! اللہ کے لئے بھرپور قیام کرنے والے اور انصاف کے ساتھ گواہی دینے والے بن جاؤ اور کسی قوم کی دشمنی تمہاری بے انصافی کا سبب نہ بنے، (ہر حال میں) عدل کرو! یہی تقویٰ کے قریب ترین ہے اور اللہ سے ڈرو، بے شک اللہ تمہارے اعمال سے خوب باخبر ہے۔"

متعدد آیات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اسلام عدل وانصاف کو بنیادی انسانی حقوق میں سے قرار دیتا ہے۔ اس میں مذہب، نسل وغیرہ کا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔ مذکورہ آیت میں مسلمانوں کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ دشمن کے ساتھ بھی عدل وانصاف سے پیش آئیں کیونکہ جہاں وہ دشمن ہے وہاں انسان بھی ہے بلکہ پہلے انسان اور بعد میں دشمن ہے۔

عادلانہ قصاص:

قصاص ایک اہم ترین اسلامی حکم ہے جس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ:

"وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَاةٌ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ۔" (10)

ترجمہ: "اور اے عقل والو! تمہارے لئے قصاص میں زندگی ہے، امید ہے تم (اس قانون کے سبب) بچتے رہو گے۔"

اس میں کس قدر عدل کو مد نظر رکھا گیا ہے۔ارشاد الٰہی ہے:

" وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَا أَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْأَنفَ بِالْأَنفِ وَالْأُذُنَ بِالْأُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوحَ قِصَاصٌ فَمَن تَصَدَّقَ بِهِ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهُ وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللّٰهُ فَأُوْلَـئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ۔" (11)

ترجمہ: "اور ہم نے توریت میں ان پر (یہ قانون) لکھ دیا تھا کہ جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک، کان کے بدلے کان اور دانت کے بدلے دانت ہیں اور زخموں کا بدلہ (ان کے برابر) لیا جائے، پھر جو قصاص کو معاف کردے تو یہ اس کے لئے (گناہوں کا) کفارہ شمار ہوگا اور جو اللہ کے نازل کردہ حکم کے مطابق فیصلے نہ کریں پس وہ ظالم ہیں۔"

ایک روایت میں ہے کہ ایک عورت جس نے فحشاء کا ارتکاب کیا تھا حضرت علی علیہ السلام کی عدالت میں لائی گئی۔ امام علیہ السلام نے پوری تحقیق کرنے کے بعد حکم الٰہی کو جاری کرنے کا حکم دیا اور آپ کے غلام قنبر کو عورت کو کوڑے مارنے پر مامور کیا گیا۔اس نے غصے میں آکر تین کوڑے زیادہ مار دیئے جونہی حضرت علی علیہ السلام اس سے آگاہ ہوئے انہوں نے کوڑا اپنے ہاتھ میں پکڑا اور قنبر کو لٹا کر وہی تین اضافی کوڑے اُسے لگا دیئے۔یہ ہے اسلامی عدل وانصاف، جہاں سالہا سال سے خدمت گذار اور "حد" کے اجراء پر مامور شخص کے لئے بھی کوئی رورعایت نہیں برتی جاتی۔دنیا حضرت علی علیہ السلام کے عدل کو کہاں پا سکے گی!

عبادت میں میانہ روی

اسلام میں مستحب عبادت پر بہت زور دیا گیا ہے لیکن اس بات کی تاکید کی ہے کہ اگر عبادت غیر واجب کے لئے قلبی آمادگی نہیں تو اُسے زبردستی اپنے اوپر بوجھ نہ بناؤ اور کوشش کرو کہ عبادت کو قلبی لگاؤ اور شوق ورغبت سے انجام دیں۔

امام صادق علیہ السلام نے فرمایا: "لاتُکْرِهُوا اِلٰی انفُسِکُمْ العِبادَةَ۔" (12) یعنی: "عبادت کو اپنے اوپر زبردستی لاگو نہ کرو۔" ایک اور روایت میں یوں فرمایا گیا ہے: "لاتُکْرِهُوا عِبادَةَ اللّٰهِ اِلٰی عِبادِاللّٰهِ۔" (13) یعنی: "عبادت کو اللہ کے بندوں پر بوجھ نہ بناؤ۔"

تعریف و تنقید میں عدل

جن امور پر توجہ دینے کی ضرورت ہے ان میں ایک بے جا تعریف اور غلط تنقید ہے جس کے معاشرے پر بُرے اثرات پڑتے ہیں۔اس حوالے سے حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا ہے:

"الثَّنَاءُ بِاَكْثَرَ مِنَ الِاسْتِحْقَاقِ مَلَقٌ وَّ التَّقْصِيرُ عَنِ الِاسْتِحْقَاقِ عِيٌّ اَوْ حَسَدٌ۔" (14)

یعنی: "نااہل کی تعریف یا حق سے زیادہ کسی کی مدح، خوشامد اور چاپلوسی ہے اور حقدار اور لائق کی مدح و ستائش نہ کرنا عاجزی یا حسد ہے۔"

پس دوسروں کی مدح و تعریف کرتے ہوئے بھی ہمیں عدل کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے ورنہ دو عیبوں میں سے کسی ایک میں مبتلا ہو جائیں گے۔

محبت اور دشمنی میں عدالت

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:"اَلِافْرَاطُ فِي الْمَلَامَةِ يَشُبُّ نِيرَانَ اللَّجَاجَةِ ۔" (15) یعنی: "سرزنش اور ڈانٹ ڈپٹ میں افراط اور زیادتی ضد اور سرکشی کی آگ بھڑکاتی ہے۔" اسی طرح سے بچوں سے حد سے زیادہ پیار و محبت بھی انہیں بگاڑ دیتا ہے دوسری طرف ایسا بھی نہ ہو کہ وہ محبت سے محروم کر دیئے جائیں۔اس بارے میں حدیث میں آیا ہے کہ مَنْ كَانَ لَهُ صَبِيٌّ صَبا۔ جس کا بچہ ہو اُسے چاہیے کہ وہ بچہ بنے یعنی اس کے ساتھ گفتگو کرے اس کے ساتھ کھیلے تاکہ اس کی نفسیاتی ضرورت پوری ہو سکے۔

اخراجات میں اعتدال و توازن

قرآن مجید نے زندگی کے اخراجات میں بھی عدل سے کام لینے کی ہدایت کی ہے۔ارشاد ربّانی ہے:

"وَالَّذِينَ إِذَا أَنفَقُوا لَمْ يُسْرِفُوا وَلَمْ يَقْتُرُوا وَكَانَ بَيْنَ ذَٰلِكَ قَوَامًا۔" (16)

ترجمہ: "اور یہ لوگ جب خرچ کرتے ہیں تو نہ اسراف کرتے ہیں اور نہ کنجوسی کرتے ہیں بلکہ ان کے درمیان اعتدال رکھتے ہیں۔"

قرآن مجید نے عبادالرحمٰن کی صفات بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ وہ نہ تو فضول خرچی کرتے ہیں اور نہ ہی بخل سے کام لیتے ہیں۔اسراف اور فضول خرچی طاقت کا ضیاع ہے اور کنجوسی طاقت کا جمود ہے۔اسلام فردی ملکیت کا

قائل ہے لیکن اس ملکیت میں نہ ضیاع کی اجازت دیتا ہے، نہ جمود اور سرمائے کے ٹھہراؤ کی، بلکہ ان دونوں کے درمیان ایک اعتدال کی سفارش کرتا ہے یعنی سرمائے کے حوالے سے بھی عدل وانصاف کا حکم دیتا ہے۔

حضور پاک ﷺ سے خطاب ہوا:

"وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُومًا مَّحْسُورًا۔" (17)

ترجمہ: "اور نہ تو آپ اپنا ہاتھ اپنی گردن سے باندھ کر رکھیں (یعنی کنجوسی نہ کریں) اور نہ ہی اسے بالکل کھلا چھوڑ دیں (یعنی فضول خرچی نہ کریں)، ورنہ آپ ملامت کا نشانہ اور تہی دست ہو جائیں گے۔"

یہ حکم آنحضرتؐ جو کہ سربراہ حکومت بھی تھے کو دیا گیا ہے اور ان کے ذریعے پوری امت کو یہ پیغام دیا گیا ہے۔ اگر حکومتوں کی سطح پر اس پر عملدرآمد کیا جائے تو ملک معاشی بدحالی سے نکل سکتے ہیں، ان میں معاشی ترقی اور خوشحالی آسکتی ہے۔ آج ہمارے ملک اور دیگر ممالک میں معاشی بدحالی کا ایک اہم عامل حکومتی سطح پر فضول خرچی اور اسراف ہے۔

گھر کے اندر عدل وانصاف

اسلام نے مرد کو اپنی خواہشات کو پورا کرنے کے لئے چار بیویوں کی اجازت دی ہے اور ان کے حقوق مقرر فرمائے ہیں لیکن یہ اجازت اس صورت میں ہے جب وہ ان سب کے حقوق کو پورا کرے اور ان کے درمیان عدل وانصاف سے کام لے لہٰذا فرمایا:

"وَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تُقْسِطُوا فِي الْيَتَامَىٰ فَانكِحُوا مَا طَابَ لَكُم مِّنَ النِّسَاءِ مَثْنَىٰ وَثُلَاثَ وَرُبَاعَ فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ ذَٰلِكَ أَدْنَىٰ أَلَّا تَعُولُوا۔" (18)

ترجمہ: "اور اگر تم لوگ اس بات سے خائف ہو کہ یتیم (لڑکیوں) کے بارے میں انصاف نہ کرسکو گے تو جو دوسری عورتیں تمہیں پسند آئیں ان میں سے دو دو، تین تین یا چار چار سے نکاح کرلو، اگر تمہیں خوف ہو کہ ان میں عدل نہ کرسکو گے تو ایک ہی عورت یا لونڈی جس کے تم مالک ہو (کافی ہے)، یہ ناانصافی سے بچنے کی قریب ترین صورت ہے۔"

پیغمبر اکرم ﷺ اپنی زندگی کے آخری ایام میں بیماری کی حالت میں بھی بیویوں کے درمیان عدل وانصاف کا خیال رکھتے تھے اور ہر رات اپنے بستر بیماری کو اس زوجہ کے گھر میں منتقل کراتے جس کی باری اس رات ہوتی تھی۔ حضرت عائشہ بیان کرتی ہیں کہ آنحضرت ﷺ کسی بھی بیوی کو دوسری پر ترجیح

نہیں دیتے تھے سب سے مساوی سلوک کرتے تھے۔ روزانہ سب کے پاس تشریف لے جاتے، اس کا حال احوال پوچھتے لیکن رات کو سونا باری کے حساب سے ہوتا تھا اگر آپ باری کو تبدیل کرنا چاہتے تو پہلے اس بیوی سے اجازت لیتے تھے۔ اسی طرح جس زمانے میں حضرت علی علیہ السلام کی دو بیویاں تھیں آپ بھی عدل کا یہاں تک خیال رکھتے تھے کہ جس بیوی کے گھر باری ہوتی اس دن دوسری کے گھر سے وضو بھی نہیں فرماتے تھے۔

معاشیات میں عدل

اسلام کے معاشی نظام بھی عدل پر استوار ہے اس میں کسی کا حق ضائع نہیں ہوتا ہر ایک کو اس کے کام کی حیثیت سے معاوضہ ملتا ہے یا اپنی ضروریات کے حساب سے وہ اپنی زندگی گذارتا ہے۔

اسلام نے تاکید فرمائی ہے کہ اپنے اوقات کو چند حصوں میں تقسیم کیا جائے، انسان دن کے اوقات کا ایک حصہ کام کے لئے، ایک حصہ عبادت کے لئے اور ایک حصہ جائز تفریح اور حلال لذتوں کے لئے مخصوص کردے تاکہ اس طرح سے وہ اپنی مادی اور معنوی یا روحانی ضروریات کو پورا کرسکے۔(19)

دوسری طرف یہ بھی مسئلہ ہے کہ اگر بعض افراد کے کام کی مقدار اتنی زیادہ ہو کہ دوسروں کے لئے کام کی گنجائش اور مواقع کم کردے تو اسلامی حکمران اور ولایت فقیہ کو حق حاصل ہے کہ وہ اسے کنٹرول کرے مثلاً اگر چند افراد نے میلوں تک بنجر زمین کو محنت کرکے آباد کردیں تو اسلامی قانون" مَنْ اَحْیٰی اَرْضاً مَوَاتاً فَھِیَ لَہُ " "جس نے بنجر زمین کو آباد کیا وہ اس کا مالک بن جائے گا" کے تحت وہ اس زمین کے مالک بن جائیں گے لیکن ان کے آباد کرنے سے چند دیگر لوگ محروم ہو جائیں اور لوگوں کی معاشیات کا توازن بگڑ جائے تو یہاں پر حکومت اسلامی عدل کی بنیاد پر ان کے آباد کرنے کے علاقے کو محدود کرسکتی ہے۔(20)

وسائل کی تقسیم میں عدل

ملک کے دور دراز علاقوں کے لئے وہی خرچ کیا جائے جو نزدیک ترین علاقوں کے لئے عدل کا ایک وسیع مفہوم ایک عدل اجتماعی ہے جس کے تحت معاشرے کے تمام افراد کو ترقی کے یکساں مواقع میسر آئیں اس طرح ملکی وسائل اور سہولیات بھی تمام لوگوں کے لئے یکساں اور بطوری مساوی مہیا ہوں نہ یہ کہ عوام کا ایک طبقہ تو ہر قسم کے سائل اور سہولیات سے بہرہ مند ہو لیکن دوسرا طبقہ زندگی کی بنیادی سہولیات سے بھی محروم ہو مالک کے بعض علاقے تو ترقی یافتہ ہوں اور بعض دیگر علاقے میں پس ماندہ اور محرومی کا شکار

ہوں یہ معاشرتی ظلم اور ناانصافی ہے اس کے مقابلے میں اسلام عدالت اجتماعی یا معاشرتی عدل انصاف کی بات کرتا ہے۔ اسی مطلب کو حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام نے اپنے اس خط میں جو جناب مالک اشتر کو دیا جب انہیں مصر کا حاکم بنایا بیان کیا ہے: "اِنَّ لِلْاَقْصیٰ مِثْلُ الَّذِی لِلْاَدْنیٰ۔" (21) یعنی: "ملک کے دور دراز علاقوں کے لئے وہی خرچ کیا جائے جو (دارالخلافہ) کے نزدیک ترعلاقوں کے لئے ہو۔"

بعض انبیاء علیہم السلام جیسے حضرت شیعب علیہ السلام نے توحید اور نبوت کے بعد سب سے پہلا پیغام عادلانہ تقسیم کا دیا ہے اور کم فروشی کرنے والوں کو خبر دار کیا ہے۔ قرآن ارشاد فرماتا ہے:

"وَیَاقَوْمِ أَوْفُواْ الْمِکْیَالَ وَالْمِیزَانَ بِالْقِسْطِ وَلاَ تَبْخَسُواْ النَّاسَ أَشْیَاءَهُمْ وَلاَ تَعْثَوْاْ فِی الأَرْضِ مُفْسِدِینَ۔" (22)

ترجمہ: "اے میری قوم! انصاف کے ساتھ پورا ناپا اور تولا کرو اور لوگوں کو ان کی چیزیں کم نہ دیا کرو اور زمین میں فساد کرتے نہ پھیرو۔"

استعمال میں عدل

روزمرہ ضروریات کے استعمال کی چیزوں میں بھی عدل سے کام لینا چاہیے۔ اس حوالے سے قرآن فرماتا ہے: "کُلُواْ مِن ثَمَرِهِ إِذَا أَثْمَرَ وَآتُواْ حَقَّهُ یَوْمَ حَصَادِهِ وَلاَ تُسْرِفُواْ إِنَّهُ لاَ یُحِبُّ الْمُسْرِفِینَ۔" (23)

ترجمہ: "ان پھلوں کو کھاؤ، البتہ ان کی فصل کاٹنے کے دن اس (اللہ) کا حق (غریبوں کو) ادا کرو اور فضول خرچی نہ کرو، بتحقیق اللہ فضول خرچی کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔

"کُلُواْ وَاشْرَبُواْ وَلاَ تُسْرِفُواْ إِنَّهُ لاَ یُحِبُّ الْمُسْرِفِینَ۔" (24)

ترجمہ: "کھاؤ اور پیو لیکن اسراف نہ کرو، اللہ (تعالیٰ) اسراف کرنے والوں کو یقیناً دوست نہیں رکھتا۔"

"کُلُواْ مِن طَیِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاکُمْ وَلاَ تَطْغَوْاْ فِیهِ۔" (25)

ترجمہ: "جو پاکیزہ رزق ہم نے تمہیں دیا ہے اس میں سے کھاؤ اور اس میں سرکشی نہ کرو ورنہ تم پر میرا غضب نازل ہوگا اور جس پر میرا غضب نازل ہوا بتحقیق وہ ہلاک ہوگیا۔"

آج ہمارے ملک میں جتنا کھانا ضائع ہوتا ہے اگر اسے روک دیا جائے تو ہمارے ملک میں تمام غریبوں کا پیٹ بھرا جاسکتا ہے۔ حضرت علی علیہ السلام متقین کی صفات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"وَمَلْبَسُهُمُ الْاِقْتِصادُ۔" (26)

یعنی: "اور ان کا لباس میانہ روی ہے" یعنی میانہ روی اور اعتدال ان کے لباس میں نمایاں ہے۔"

امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: "لَوِ اقْتَصَدَ النّاسُ فِی المَطْعَم لَا سْتَقَامَتْ اَبْدانُهُمْ۔" یعنی: "اگر لوگ کھانے پینے میں میں میانہ روی اور اعتدال سے کام لیں تو ان کے بدن مضبوط اور صحت مند رہیں۔"

قرآن فرماتا ہے: "وَكُلُواْ مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّهُ حَلاَلاً طَيِّبًا۔" (27) یعنی: "اور جو اللہ تعالیٰ نے تمہیں پاک اور حلال رزق دیا ہے اس میں سے کھاؤ۔" کھانے پینے میں اعتدال جہاں انسانی صحت کے لئے لازم اور ضروری ہے وہاں وسائل اور اخراجات کی بچت بھی ہے علاوہ ازیں حلال اور پاکیزہ غذائیں کھانا اور حرام اور نجس غذاؤں سے پرہیز بھی عدل کا ایک مصداق ہیں۔

روایات میں عدالت کی اہمیت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"عدلُ سَاعَةٍ خَيْرٌ مِنْ عِبادةِ سبعين سَنَةٍ قِيَامُ لَيْلُهَا وصيام نَهَارُهَا۔" (28)

یعنی: "ایک گھڑی کا عدل ستر سال کی عبادت سے بہتر ہے، جن میں رات کو قیام اور دن کو روزہ ہو۔"

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"لَعَمَلُ الِامام العَادِلِ فِی رَعِيَّتِهِ يَوماً وَاحِداً اَفْضَلُ مِنْ عِبادَةِ العَابِدِ فی اَهْلِهِ مِأَةَ عامٍ اَوْ خَمْسِيْنَ۔" (29)

یعنی: "امام عادل کا اپنی رعایا میں عدل وانصاف کے ساتھ ایک دن عابد کی اپنے اہل میں سو سال یا پچاس سال کی عبادت سے افضل ہے۔"

امام صادق علیہ السلام نے فرمایا: "اَلِامَامُ العَادِلُ لا تُرَدُّ لَهُ دَعْوَةٌ۔" یعنی: "رہبر عادل کی دعا ہرگز رد نہیں ہوتی۔" امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام نے فرمایا: "فِی العَدْلِ صَلاحُ الْبَرِيَّةِ وَالْاَ قْتِداءُ بِسُنَّةِ اللهِ۔" (30) یعنی: "عدالت مخلوق اور لوگوں کے لئے بہتر اور مصلحت بھی ہے اور سنت الٰہی کی پیروی بھی۔" "وقَالَ: اَلْعَدْلُ حَيٰوةٌ والجَوْرُ مَمَاتٌ۔" یعنی: "عدالت اجتماعی زندگی اور ظلم اجتماعی موت ہے۔"

حضرت علی علیہ السلام سے پوچھا گیا عدالت افضل ہے یا سخاوت؟ انہوں نے فرمایا:

" اَلْعَدْلُ يَضَعُ الاُمُور مَوَاضِعَهَا، والجودُ يُخْرِجُها مِنْ جِهَتِهَا وَالْعَدْلُ سائس عامٌ والجودُ عارض خاصٌّ، فالعدلُ اَشْرَفُهُمَا وَاَفْضَلُهُمَا۔" (31)

یعنی: "عدل ہر چیز کو اس مقام اور جگہ پر قرار دیتا ہے لیکن سخاوت اُسے اس کے راستے سے خارج کر دیتی ہے۔ عدالت ایک عمومی قانون اور قاعدہ ہے جبکہ سخاوت ایک خاص جہت اور پہلو سے ہوتی ہے۔ لہٰذا عدل بہتر اور افضل ہے۔"

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام نے آیت " یُحی الارضَ بَعْدَ مَوْتِهَا۔ (32) کی تفسیر میں فرمایا: زمین عدل وانصاف کے قیام اور حدود الٰہی کے نفاذ سے زندہ ہوتی ہے۔ انہوں نے فرمایا:

لیس یُحْیِیْهَا بِالقَطْرِ وَ لَکِنْ یبعثُ اللهُ رِجالاً فَیُحْیُونَ العَدْلَ فَتُحْیَا الارضُ لِاِحْیَاءِ العَدْلِ وَ اِلاِ قَامَةُ العَدْلِ فِیْهِ اَنْفَعُ فِی الارضِ مِنَ القَطْرِ اَرْبَعِینَ صبَاحاً۔ (33)

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ بارش کے ذریعے زمین کو زندہ کرتا ہے بلکہ وہ ایسے مردوں کو مبعوث فرماتا ہے جو اصول عدالت کو زندہ کرتے ہیں اور زمین عدل وانصاف کے برپا ہونے سے زندہ ہوتی ہے۔ یہاں امام نے انحصار کی نفی کی ہے یعنی صرف بارش کا نزول زمین کے زندہ ہونے کا سبب نہیں ہے بلکہ عدل وانصاف کا قیام بھی اس کا ایک اہم سبب ہے۔

عدالت کا قیام انبیاء کے اہداف میں سے ایک ہدف ہے

"لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ۔" (34)

ترجمہ: "بے شک ہم نے اپنے رسولوں کو واضح دلائل دے کر بھیجا ہے اور ہم نے ان کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کیا ہے تاکہ لوگ عدل قائم کریں۔"

اس آیت میں تمام انبیاء کے مبعوث ہونے کی غرض وغایت کا خلاصہ بیان فرمایا ہے کہ انہیں شریعت، آیات، کتابیں اور میزان عطا ہوا ہے ان سب کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں کو اس قابل بنایا جائے کہ وہ عدل وانصاف قائم کریں اور اس مسئلے یعنی عدل وانصاف کے نفاذ کے راستے میں رکاوٹیں پیدا کرنے والوں کے مقابلے کے لئے لوہا نازل کیا تاکہ اس کے ذریعے سے ان کا قلع قمع کیا جاسکے۔

عدالت ایک فطری امر ہے

ایک بچے کی مثال: اگر وہ سیب کھا رہا ہو اور وہ آپ کے سپرد کرکے پانی پینے کے لئے چلا جائے اور جب واپس آئے تو دیکھے کہ آپ نے کچھ سیب کھالیا ہے تو وہ عجیب نظروں سے دیکھے گا اگر زبان سے کچھ نہ بھی کہے لیکن چہرے کے تاثرات سے ناگواری اور ناراضگی ضرور ظاہر ہوگی۔ چور اور ڈاکو لوٹا ہوا مال

عدالت کے مطابق تقسیم کرتے ہیں یعنی مساوی اور برابر تقسیم کرتے ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ عدل وانصاف ایک فطری جذبہ ہے جو ہر جگہ پر نمایاں نظر آتا ہے۔

معاشرتی عدل وانصاف اور سیرت معصومین علیہم السلام

حضرت علی علیہ السلام نے زندگی کے ہر شعبے میں اسلامی عدل انصاف کا اعلیٰ ترین نمونہ پیش کیا اور زندگی کے تمام شعبوں میں عدل وانصاف کی حکمرانی کی بہترین مثال پیش کی۔ آپ کا عدل بے مثال تھا یہاں تک کہ بعض مفکرین نے یہاں تک کہہ دیا کہ آپ عدل کی وجہ سے شہید ہوئے یعنی آپ کا عدل وانصاف آپ کے قتل کا سبب بنا۔ یہاں پر ہم ان کے عدل وانصاف کے چند نمونے پیش کرتے ہیں۔

(i) بیت المال کی مساوی تقسیم: جب مال کی تقسیم میں آپ کے برابری ومساوات کا اصول برتنے پر کچھ لوگ بگڑ اٹھے تو حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

"۔۔۔وَلَوكَانَ المَالُ لِیْ لَسَوَّيْتُ بَيْنَهُمْ فَكَيْفَ۔۔۔فَشَرُّ خَلِيلٍ وَالْاَمُ خَدِينٍ۔" (35)

یعنی: "۔۔۔۔(۱) اگر یہ خود میرا مال ہوتا جب بھی میں اسے سب میں برابر تقسیم کرتا۔ چہ جائیکہ یہ مال اللہ کا مال ہے۔ (۲) دیکھو بغیر کسی حق کے دادودہش کرنا بے اعتدالی اور فضول خرچی ہے۔ (۳) اور یہ اپنے مرتکب کو دنیا میں بلند کردیتی ہے لیکن آخرت میں پست کردیتی ہے۔ لوگوں میں تواس کی عزت میں اضافہ کرتی ہے مگر اللہ کے نزدیک ذلیل کرتی ہے۔ (۴) جو شخص بھی مال کو بغیر استحقاق یا نااہل افراد کو دے گا۔ اللہ اُسے ان کے شکریہ سے محروم ہی رکھے گا اور ان کی دوستی اور محبت بھی دوسروں ہی کے حصہ میں جائے گی اور اگر کسی دن اس کے پیر پھسل جائیں اور یہ ان کی امداد کا محتاج ہو جائے تو وہ اس کے لئے بہت ہی برے ساتھی اور کمینے دوست ثابت ہوں گے۔"

(ii) عرب اور عجم میں کوئی فرق نہیں: دو عورتیں بیت المال سے اپنا حصہ وصول کرنے کے لئے حضرت امیر المومنین علیہ السلام کی خدمت میں آئیں۔ ان میں سے ایک عرب اور دوسری غیر عرب تھی امام علیہ السلام نے اپنی دائمی عادلانہ روش کے مطابق دونوں کو برابر حصہ دیا۔ عرب عورت چیخ اٹھی اور آپ پر اعتراض کیا کہ آپ عرب اور عجم میں برابر تقسیم کرتے ہیں؟ امامؑ نے فرمایا میں دونوں میں کوئی فرق نہیں سمجھتا۔

کئی بار آپ کی اسی عادلانہ روش پر لوگوں نے اعتراضات کیے اور آپ پر تنقید کی مگر یہ سب کچھ آپ کو عدل وانصاف سے نہ روک سکا۔ آپ قرآن کی زبان میں ان افراد میں تھے جن پر یہ ملامتیں اثر نہیں کرتی تھی۔ وَلَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ (36)

(iii) ایک روٹی کی عادلانہ تقسیم: ایک دفعہ کچھ بیت المال امیر المومنین علیہ السلام کی خدمت میں آیا لوگ اس کے لینے کے لئے جمع ہوگئے آپ نے ایک رسی باندھ کر اس کی حد بندی کردی پھر آپ خود اندر داخل ہوئے اور اس وقت کے دستور کے مطابق مال کو سات قبائل کے سرداروں میں تقسیم کردیا تاکہ وہ اپنے افراد میں تقسیم کریں۔ آخر میں دیکھا کہ ایک روٹی بچ گئی ہے آپؑ نے فرمایا اسے بھی سات مساوی ٹکڑے کرکے تقسیم کردیا جائے۔ (37)

(iv) عدالت علی علیہ السلام کا ایک اور نمونہ: ایک دن امیر المومنین علی ابن بی طالب علیہ السلام کے بھائی حضرت عقیل اپنے پریشان حال اور بھوکے بچوں کو لے کر آپؑ کی خدمت میں آئے اور بیت المال میں سے اپنا حصہ بڑھانے کی درخواست کی۔ فطری امر ہے کہ ہر شخص بچوں کی حالت دیکھ کر متاثر ہوتا ہے۔ لیکن امام علیہ السلام نے دوٹوک جواب دیا اور حصہ بڑھانے سے انکار کردیا اور اپنی بات کا فلسفہ سمجھانے کے لئے لوہے کی سلاخ گرم کرکے ان کے نزدیک کی اور فرمایا جیسا کہ تو اس کے نزدیک ہونے سے ڈرتا ہے میں بھی عذاب جہنم سے ڈرتا ہوں۔ (اسی واقعہ کا ذکر خود مولا علیؑ نے نہج البلاغہ خطبہ ۲۲۱ میں ذکر کیا ہے) (38)

(v) ایک اور نمونہ: حضرت علی علیہ السلام بیت المال کو تقسیم کررہے تھے تو امام علیہ السلام کے پوتوں یا نواسوں میں سے ایک بچے نے کوئی چیز اٹھائی اور بھاگ گیا۔ یہاں پر ہر باپ ممکن ہے اسے نظر انداز کردے مگر امام علیہ السلام اس کے پیچھے بھاگے اور اُس چیز کو اس کے ہاتھ سے لیا اور دوبارہ بیت المال میں رکھ دیا۔ لوگوں نے کہا۔ اس بچے کا بھی تو حصہ ہے۔ امامؑ نے فرمایا ہرگز نہیں، صرف اس کے باپ کا حصہ ہے اور وہ باقی مسلمانوں کی طرح، جب وہ وصول کرے گا تو جتنا چاہے گا اپنے بیٹے کو دے گا۔ یہ بیت المال کا مسئلہ ہے مگر ذاتی امور میں امامؑ کی سخاوت کا یہ حال ہے کہ امیر شام جو کہ حضرت علیؑ کے مخالف تھا یہ کہتے ہوئے نظر آتا ہے کہ اگر حضرت علی علیہ السلام کے پاس دو کمرے ہوں اور ایک میں بھوسہ اور دوسرا سونے سے بھرا ہو تو ان کے لئے بخشنے کے لحاظ سے دونوں یکساں اور برابر ہیں۔

(vi) کاغذ کا استعمال: حضرت علی علیہ السلام نے جو ہدایت نامہ/سرکلر اپنے نمائندوں کو جاری کیا اس میں لکھا: اپنے قلم کی نوک کو تیز کرو، لکھتے ہوئے سطروں کے درمیان زیادہ فاصلہ نہ ڈالیں اضافی حروف کو حذف کر دیں، عبارت پر وازی کی بجائے مطلب اور مدعا بیان کرنے پر اکتفاء کریں بہت زیادہ لکھنے اور زیادہ کاغذ استعمال کرنے سے پرہیز کریں چونکہ یہ کاغذ بیت المال سے ہیں اور بیت المال اتنے نقصان کا متحمل نہیں ہے۔ (39)

عدالت کی قدر و قیمت

خطبہ نمبر ۲۲۱ (اردو ترجمہ مفتی جعفر حسین) میں مولا المومنینؑ فرماتے ہیں: خدا کی قسم! مجھے سعدان (ایک کانٹے دار جھاڑی) کے کانٹوں پر جاگتے ہوئے رات گزارنا اور طوق وزنجیر میں مقید ہو کر گھسیٹا جانا اس سے کہیں زیادہ پسند ہے کہ میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے اس حالت میں ملاقات کروں کہ میں نے کسی بندے پر ظلم کیا ہو۔ یا مال دنیا میں سے کوئی چیز غصب کی ہو۔

اس کے بعد امام علیہ السلام نے اپنے بھائی عقیل والا واقعہ اور شہد میں گوندھا ہوا حلوہ لے کر آنے والے شخص کا واقعہ بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

"خدا کی قسم! اگر ہفت اقلیم ان چیزوں سمیت جو آسمانوں کے نیچے ہیں مجھے دے دیئے جائیں صرف اس بات کے عوض کہ میں چیونٹی سے جو کا ایک چھلکا چھین لوں تو کبھی ایسا نہ کروں گا یہ دنیا تو میرے نزدیک اُس پتی سے بھی زیادہ بے قدر ہے جو ٹڈی کے منہ میں ہو جسے وہ جبار ہی ہو۔"

قانون کی نظر میں سب برابر

1. بنی مخزوم کی عورت کا چوری کا واقعہ۔ اسامہ کو لوگوں نے سفارشی بنایا آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔ اے اسامہ کیا تو واسطہ بنتا ہے کہ حکم خدا جاری نہ ہو؟ سابقہ امتوں کی بد بختی اور ہلاکت کا راز یہی تھا کہ جب کبھی امیر اور اشراف جرم کرتے تو حکم الٰہی ان پر جاری نہ ہوتا لیکن جب غریب اور عام افراد جرائم کرتے تو انہیں سخت سزا دی جاتی۔
2. مدینے میں کسی مسلمان کے گھر چوری ہو گئی چوری کے الزام میں دو افراد (ایک مسلمان اور ایک یہودی) کو گرفتار کیا گیا اور حضور ﷺ کے سامنے لایا گیا۔ مسلمانوں کے دل میں یہ خوف پیدا ہوا کہ اگر ثابت ہو جائے کہ مسلمان نے چوری کی ہے تو مدینے کے یہودیوں میں ہماری عزت خاک میں مل جائے گی۔ لہٰذا وہ مل کر حضور ﷺ کی خدمت آئے اور عرض کی یہ مسئلہ ہے آپ ﷺ

کوشش کریں کہ مسلمان بری ہو جائے اور انہوں نے یہ بھی کہا کہ اب تک یہودیوں نے ہم پر کتنے مظالم ڈھائے ہیں اگر اس مسئلے میں ان پر ظلم ہو بھی گیا تو ان مظالم کے مقابلے میں یہ کچھ بھی نہیں ہے۔ لیکن آنحضرت ﷺ نے فرمایا: عدالت اور قضاوت کا مسئلہ گذشتہ تلخیوں سے جدا ہے۔ آخرکار دونوں کے بارے میں تحقیقات ہوئیں۔ مسلمان کا جرم ثابت ہو گیا اور مسلمانوں کی خواہش کے برخلاف یہودی کو بری کر دیا گیا۔

3. **حضرت علی علیہ السلام نے مہمان کو گھر سے نکال دیا:** ایک شخص حضرت علیؑ کے ہاں مہمان ٹھہرا کچھ دیر کے بعد اُس نے آپ کے سامنے ایک تنازعے کا ذکر کیا جو اس کے اور ایک اور شخص کے درمیان پیدا ہوتا تھا۔ آپؑ نے کہا اب تک تو میرا مہمان تھا لیکن اب چونکہ تو ایک فریق بن گیا ہے لہٰذا میرے ہاں سے چلے جاؤ کیونکہ پیغمبر اکرم ﷺ کا ارشاد ہے: متنازع فریقین میں سے کسی کو مہمان نہ بناؤ مگر یہ کہ دوسرے فریق کو بھی مہمان بناؤ۔ مہمانی کا مسئلہ الگ ہے اور عدل وانصاف کا مسئلہ الگ ہے۔ مہمانی کی بنیاد جذبات واحساسات جبکہ فیصلے کی بنیاد قانون ہے۔ (40)

4. **حضرت علی علیہ السلام کا مالیات اکٹھا کرنے والوں کو ہدایت:** اس بات کے پیش نظر کہ کسی کے ہاں مہمان بننے سے مالیات کو اکٹھا کرنے میں رعایت کا پہلو سامنے آئے اور یہ اثر انداز ہو۔ آپ نے مالیات اکٹھا کرنے والوں کو ہدایت کہ: جب کسی علاقے اور قبیلے میں مال اکٹھا کرنے جاؤ تو کسی کے گھر میں نہ ٹھہرنا بلکہ کنوؤں (عمومی جگہوں) پر قیام کرنا پھر وقار وسکون کے ساتھ ان کی طرف جانا۔ کیونکہ تمہارا مہمان ٹھہرنا ممکن ہے لوگوں سے مالیات وصول کرنے پر اثر انداز ہو۔ (41)

5. **عدالت پر اعتراض اور علی علیہ السلام کا عدالت سے چلے جانا:** حضرت عمرؓ کا زمانہ حکومت تھا ایک شخص نے قاضی کے پاس حضرت علی علیہ السلام کی شکایت کی۔ مدعی اور مدعا علیہ دونوں عدالت میں حاضر ہوئے قاضی کے لئے ضروری ہے کہ وہ گفتگو میں یہاں تک کہ دیکھنے اور نام پکارنے میں دونوں افراد سے یکساں طرز عمل اپنائے یہاں پر قاضی نے امامؑ اور دوسرے فرد کے درمیان نام پکارنے میں امتیاز برتا۔ امامؑ کو احترام اور کنیت سے پکارا جبکہ دوسرے کو سادہ نام سے پکارا۔ امامؑ غصے میں

آ گئے اور عدالت سے باہر نکل گئے اور فرمایا قاضی کو طرفین میں نام کہنے میں کوئی فرق نہ رکھے تو نے فرق رکھا ہے یہ اسلامی عدالت نہیں ہے۔(42)

6. **حضرت علی علیہ السلام کا اپنے خلاف فیصلہ قبول کرنا:** حضرت علی علیہ السلام کے دور میں یہودی کے ساتھ زرہ کے مسئلے پر مقدمہ عدالت میں پیش ہوا جس کے فریق خود آپؑ تھے۔ قاضی نے اسلامی اصولوں کے تحت فیصلہ یہودی کے حق میں دے دیا۔ یہودی اصل معاملہ کو جانتا تھا اس نے اسلامی عدالت کو دیکھ کر اسلام قبول کر لیا۔

اپنے مقام و منصب سے سوء استفادہ ممنوع:

1) حضرت علی علیہ السلام نے اپنی حکومت کے مرکز میں لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا" اے کوفہ والو! اگر تم دیکھو کہ میں شہر سے باہر نکلا ہوں اس حالت میں کہ میری وضع قطع پہلے سے تبدیل ہے مثلاً میرا لباس، خوراک، سواری یا غلام پہلے سے بہتر ہے تو سمجھ لینا کہ میں نے حکومت میں رہتے ہوئے خیانت کی ہے۔(43)

2) **بازار سے چیز نہ خریدنا اگر خریدنا تو ناواقف سے:** حضرت علی علیہ السلام بازار سے خود چیز نہیں خریدتے تھے یا خریدتے تو ان افراد سے جو آپ کو نہیں جانتے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حکمرانوں یا بڑے لوگوں کو دکاندار اچھی کوالٹی کی چیز ارزاں قیمت پر دیتے ہیں۔ مولا نہیں چاہتے کہ اس معاشرے میں کچھ لوگ تو بہترین چیز کم قیمت پر خریدیں اور عام لوگوں گھٹیا چیز مہنگے داموں خریدیں۔

ایک دفعہ آپؑ بازار میں گئے ایک دکان سے کپڑے کی قیمت پوچھی اُس نے کہا۔ اے امیر المومنینؑ یہ دام ہیں۔ آپؑ سمجھ گئے کہ اس نے مجھے پہچان لیا ہے دوسری دکان پر گئے وہاں سے کپڑا خریدا۔ بعد میں دکاندار آیا اور اُس نے کہا کہ مولاؑ دکان پر میرا بیٹا تھا اُس ریٹ کا پتہ نہیں تھا اُس نے مثلاً ۵ روپے فی گز زیادہ قیمت وصول کی ہے میں وہ رقم واپس کرنے آیا ہوں آپؑ نے فرمایا میں نے اپنی رضا مندی سے اُس قیمت پر کپڑا خریدا ہے لہٰذا واپسی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

*****

حوالہ جات

1۔ سورہ بقرہ۔ ۱۴۳

2۔ (سورہ نحل۔ ۹۰)

3۔ بقرہ۔ ۲۱۹

4۔ فاطر۔ ۳۱

5 ۔ آل عمران۔ ۷۵

6 ۔ سورہ بقرہ۔ ۱۹۱

7 ۔ سورہ اسراء / بنی اسرائیل۔ ۳۳

8 ۔ سورہ بقرہ۔ ۱۹۴

9 ۔ سورہ مائدہ۔ ۸

10 ۔ سورہ بقرہ۔ ۱۷۹

11 ۔ سورہ مائدہ۔ ۴۵

12 ۔ کلینی، ابو جعفر محمد بن یعقوب، الاصول من الکافی۔ ج ۲، ص ۸۶، ح ۲

13 ۔ کافی ج ۲، ص ۸۶، ح ۱

14 ۔ نہج البلاغہ / حکمت۔ ۳۴۷

15 ۔ الحرانی، ابو محمد حسن بن علی بن حسین بن شعبہ: تحف العقول عن ال الرسول وصایا امیر المومنین علیہم السلام ص ۸۴، موسسۃ، النشر الاسلامی (۱۴۰۴ ہجری

16 ۔ فرقان۔ ۶۷

17 ۔ بنی اسرائیل۔ ۲۹

18 ۔ نساء۔ ۳

19 ۔ نہج البلاغہ۔ ص ۲۱۷

20 ۔ الصدر، محمد باقر، اقتصادنا، ص ۴۲۰، دار الفکر ۱۹۶۹ء بیروت

21 ۔ خط مالک اشتر کا نام، مکتوب نمبر ۵۳
22 ۔ ہود۔ ۸۵
23 ۔ انعام۔ ۱۴۱
24 ۔ اعراف۔ ۳۱
25 ۔ طٰہٰ۔ ۸۱
26 ۔ خطبہ ۱۹۳، متقین کی صفات
27 ۔ نحل۔ ۱۱۴
28 ۔ جامع السادات، ج ۲، ص ۲۲۳
29 ۔ نظام الاسلام السیاسی۔ ص ۷۱۔ باقر شریف قریشی
30 ۔ مدیٰ عبد الواحد غرر الحکم ودرر الکلم، ج ۲، ص ۵۱۳، چاپ تہران
31 ۔ کلمات قصار ۳۴۷
32 ۔ سورہ روم۔ ۱۹
33 ۔ شیرازی، ناصر مکارم، تفسیر نمونہ، ج ۱۶، ص ۴۰۸، دار الکتب الاسلامیہ۔ تہران
34 ۔ حدید۔ ۲۵
35 ۔ نہج البلاغہ۔ ۱۲۶
36 ۔ مائدہ۔ ۵۴
37 ۔ مجلسی، محمد باقر، بحار الانوار، تاریخ امیر المومنین، باب مکارم اخلاقہ، ج ۴۱، ص ۱۳۶، موسئہ الوفاء بیروت
38 ۔ بحار الانوار، ج ۴۱، ص ۱۱۵
39 ۔ بحار۔ ج ۴۱، ص ۱۰۵
40 ۔ حر عاملی، شیخ محمد بن الحسن (۱۱۰۶ھ)، وسائل الشیعہ الی تحصیل سائل الشرایعۃ کتاب القضاء ابواب آداب القاضی، ج ۱۸، ص ۱۵۷، ح ۲، دار احیاء التراث العربی بیروت
41 ۔ نہج البلاغہ۔ خط ۲۵
42 ۔ صوت العدالۃ الاسلامیہ /
43 ۔ بحار الانوار، ج ۴۱، ص ۱۳۷

نہج البلاغہ میں احادیث اور اصول حدیث

روشن علی*

ڈاکٹر کرم حسین ودھو

کلیدی کلمات: حدیث، سنت، قول، فعل، طرز زندگی، قصاص، حدود، راوی،، عقل، سند

خلاصہ

نہج البلاغہ امیر المومنین حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے کلام کا مشہور ترین مجموعہ اور معارف کا وہ گراں بہا سرمایا ہے جس کی اہمیت اور عظمت ہر دور میں مسلم رہی ہے۔ اس میں انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں میں جس جامعیت کے ساتھ رہنمائی پیش کی گئی ہے وہ کسی ترجمانِ وحی کے یہاں نہیں پائی جاتی۔ نہج البلاغہ میں نبی کریم ﷺ کی بہت سی احادیث موجود ہیں۔ حضرت علی علیہ السلام نے اپنے کلام میں کچھ احادیث کا حوالہ دیا ہے اور فرمایا ہے: "فقال"، "قال لی" ، "سمعت رسول اللہ" ، "کان یقول" وغیرہ کہہ کر حدیث نقل کی ہے۔ یا آپؑ کے فعل کی طرف اشارہ کیا ہے۔ کئی مقامات پر آپؑ نے حوالہ دیے بغیر بھی اپنے کلام میں حدیث نقل کی ہے۔ بعض مقامات پر الفاظ حضرت علی علیہ السلام کے ہیں لیکن ان کا مفہوم و معنی وہی حدیثِ رسول ﷺ والا ہے۔

اس مقالہ میں ہم حدیث کے طور پر نہج البلاغہ سے رسول اکرم ﷺ کے قول، فعل، تقریر کو، آپؐ کی سیرت، اخلاق، کردار یہاں تک کہ آپؐ کا سونا، کھانا، پینا، اٹھنا، بیٹھنا یعنی آپؐ کا طرز زندگی وغیرہ کو بیان کریں گے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہم اس مقالہ میں اصول حدیث کو بھی بیان کریں گے کیونکہ حضرت علی علیہ السلام نے ایسے اصول حدیث بیان فرمائے ہیں جن میں احادیث کی اقسام اور ان کو پرکھنے کے کا طریقہ کار، رواۃ کی اقسام اور ان کی بیان کی ہوئی احادیث کی حیثیت کو بھی بیان کیا گیا ہے۔

*۔اسسٹنٹ پروفیسر اسلام آباد ماڈل کالج فار بوائز، ایف 10/3 اسلام آباد

مقدمہ

اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا اور اس میں اپنی روح پھونک دی۔ پھر اسے مسجود ملائکہ قرار دیا اور اپنا نائب و خلیفہ بنایا۔ اسے وہ کچھ سکھا دیا جو وہ نہیں جانتا تھا۔ اللہ تعالی نے انسان کو علم و شریعت عطا کیا تا کہ وہ گمراہی سے محفوظ رہے اور اللہ وحدہ لا شریک کی اطاعت و بندگی سے دور نہ ہو جائے۔ جیسے جیسے انسانوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا ویسے ان میں اختلافات اور خرافات کا بھی اضافہ ہوتا گیا۔ اللہ ان کے اختلاف کو مٹانے اور ان کو یکجا جمع کرنے کے لئے اپنی طرف سے ضرورت کے مطابق انبیاء کرام علیہم السلام کو اپنے احکام دے کر بھیجتا رہا۔

انبیاء کرام علیہم السلام کی آمد کا یہ سلسلہ چلتا ہوا آپ ﷺ تک پہنچا۔ اللہ تعالی نے آپ ﷺ کو آخری نبی بنایا اور آپ ﷺ کو ایسی کتاب و شریعت عطا کی جو تمام بنی نوع انسان کے لئے ہدایت ہے۔ ہمارے پیارے نبی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے لوگوں کو گمراہی سے نکالا۔ نور شریعت کے ماخذ میں سے بنیادی ماخذ قرآن و حدیث نبوی ہیں۔ قرآن تو ہمارے لئے قطعی الصدور ہے، جس میں ذرہ برابر بھی شک و شبہ نہیں ہے کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بذریعہ وحی نازل ہوا ہے، لیکن احادیث نبویہ کی اکثریت قطعی الصدور نہیں ہیں اس میں بہت زیادہ اختلاف پایا جاتا ہے۔ ہمارے پیارے نبی حضرت محمد ﷺ پر آپ کی زندگی میں ہی جھوٹ بولا گیا یہاں تک کہ آپ ﷺ کو کہنا پڑا کہ جو شخص بھی مجھ پر جھوٹ بولے گا وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں پائے گا۔

آپ ﷺ کی رحلت کے بعد حدیث کا نشر اشاعت رواۃ حدیث کے واسطے سے ہوا، اس طرح کہ فلان عن فلان اس نام بنام سلسلہ رواۃ کو سند کہا جاتا ہے یہ سلسلہ سند ہی وہ معیار ہے جس پر حدیث کو پرکھا جا سکتا ہے اور صحیح و سقیم کو جانچا جا سکتا ہے۔ اگر حدیث کے رواۃ ثقہ ہوں گے تو حدیث بھی قابل وثوق و اعتماد ہو گی اور اگر ان کی عدالت مشتبہ اور صداقت مشکوک ہو گی تو حدیث بھی اعتماد و وثوق کے پایہ سے گر جائے گی اس لئے ہر حدیث کو ایک سطح پر سمجھا نہیں جا سکتا بلکہ کچھ قابل اعتماد و وثوق ہوں گی اور کچھ متروک و ساقط الاعتبار۔ اس کی صحت یا عدم صحت پر اس وقت تک حکم نہیں لگایا جا سکتا جب تک سلسلہ سند کے رواۃ کو پرکھ نہ لیا جائے۔ چنانچہ امیر المؤمنین حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام راویوں کو یہ ہدایت کرتے تھے کہ وہ متن حدیث کے ساتھ راوی یا رواۃ کا ذکر بھی کریں تا کہ حدیث کی صحت کو پرکھا جا سکے۔ حضرت علیؑ نے

نہج البلاغہ میں اسی سلسلہ رواۃ کی صفات بیان کی ہیں جس کی وجہ حدیث کے قبولیت اور عدم قبولیت کو پرکھا جاسکتا ہے۔اس مقالہ میں نہج البلاغہ میں احادیث رسول ﷺ کا تذکرہ کیا جائے گا۔

حدیث کا تعارف

حدیث عربی زبان کا لفظ ہے، جس کے لغوی معنی ہیں:

"الحدیث لغۃ: الجدید او ھو ضد القدیم، و یطلق علی الخبر قلیلہ و کثیرہ۔" (1)

"حدیث کی لغوی معنی جدید کے ہیں، جو قدیم کا ضد ہے۔اس کا اطلاق خبر پر ہوتا ہے چاہے وہ قلیل ہو یا کثیر۔"

حدیث کی اصطلاحی تعریف اس طرح بیان کی گئی ہے:

محدثین کی اصطلاح میں رسول اکرم (ﷺ) کے قول، فعل، تقریر اور وصف کو حدیث کہتے ہیں۔ (لیکن) محدثین نے صحابہ و تابعین کے اقوال، افعال اور تقاریر پر بھی اس کا اطلاق کیا ہے۔(2)

مکتب تشیع کے ایک عظیم علمبردار شہید ثانی نے منیۃ المرید میں حدیث کے علم کی فضیلت کے بیان کے ضمن میں اس علم کا موضوع، قول، فعل، تقریر اور صفت معصوم کو قرار دیا ہے۔ان کے مطابق:

"و اما علم الحدیث فھو اجل العلوم قدرا اعلاھا رتبۃ و اعظمھا مثوبۃ بعد القرآن و ھو ما اضیف الی النبی صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلم او الی الائمۃ المعصومین علیھم السلام قولا او فعلا او تقریرا او صفۃ، حتی الحرکات و السکنات و الیقظۃ و النوم۔" (3)

یعنی "جہاں تک حدیث کے علم کا تعلق ہے تو یہ علم قرآن کے (علم) کے بعد دیگر تمام علوم سے اپنی قدر و منزلت کے لحاظ سے زیادہ وزنی، اپنے مقام کے لحاظ سے اعلی رتبہ اور ثواب کے لحاظ سے اعظم ہے۔اور وہ عبارت ہے اُس چیز سے جس کی نسبت نبی کریم ﷺ یا ائمہ معصومین علیہم السلام میں سے کسی کی طرف دی گئی ہو، وہ چاہے، قول ہو یا فعل یا تقریر ہو یا صفت، یہاں تک کہ حرکات، سکنات، بیداری اور نیند بھی ہو۔"

اس تعریف کی روشنی میں نہج البلاغہ چونکہ کلام معصوم ہے لہٰذا یہ مکمل حدیث ہے۔لیکن ہماری مراد نبی کریم ﷺ کا قول، فعل اور تقریر ہے لہٰذا ہم اس مقالہ میں رسول اکرم ﷺ کے قول، فعل اور تقریر

کو، آپؐ کی سیرت، اخلاق، کردار یہاں تک کہ آپؐ کا سونا، کھانا کھانا، اٹھنا بیٹھنا یعنی آپؐ کا طرز زندگی وغیرہ کو بیان کریں گے چونکہ یہ سب حدیث میں شامل ہیں۔

حدیث کی اہمیت وافادیت

قرآن مجید کی طرح احادیث مبارکہ بھی شرعی اوامر ونواہی کا سرچشمہ اور دینی احکام کا اہم ماخذ ہیں۔ اگر حدیث کو قابل عمل نہ سمجھا جائے تو قرآن مجید کی افادیت بھی مضمحل ہو جائے گی۔ اس لئے کہ قرآن مجید کے اکثر احکام مجمل اور شرح طلب ہیں، جنہیں احادیث ہی کے ذریعے سمجھا جاسکتا ہے۔ اگر احادیث مبارکہ کو نظرانداز کرکے قرآن مجید کے مفہوم کو اپنی رائے سے متعین کرنے کی اجازت ہوتی تو نماز، روزہ، حج، زکوۃ وغیرہ کے احکام کی کوئی واضح صورت باقی نہ رہتی اور نہ اسلامی اصطلاحات کا کوئی خاص مفہوم متعین ہوتا، بلکہ ہر شخص ان اصطلاحات کی اپنی مرضی کے مطابق تشریح کرتا اور اسی پر عمل کرکے اپنے آپ کو عہدہ برآ سمجھ لیتا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ قرآن ایک جامع کتاب ہے مگر اس میں اکثر احکام اجمالا بیان ہوئے ہیں، ان کی تشریح وتفصیل نبی کریم ﷺ کی ذمہ داری ہے۔ اس کے متعلق قرآن مجید میں ارشاد ہے:

"وَ اَنْزَلْنَآ اِلَیْكَ الذِّكْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْهِمْ۔" (4)

ترجمہ: "ہم نے تم پر قرآن اتارا تاکہ جو احکام لوگوں کے لئے نازل کئے گئے ہیں تم انہیں واضح طور سے بیان کرو۔"

اس آیت کریمہ سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں جو احکام نازل کئے ہیں وہ مجمل ہیں اور ان احکام کی وضاحت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذمہ داری ہے۔ اسی لئے حضرت علی علیہ السلام نے جب حضرت عبداللہ ابن عباس کو خوارج کے ساتھ مناظرہ اور بحث ومباحثہ کے لئے بھیجا تو انہیں حکم دیا:

"لَا تُخَاصِمْهُمْ بِالْقُرْآنِ فَإِنَّ الْقُرْآنَ حَمَّالٌ ذُو وُجُوهٍ تَقُولُ وَ يَقُولُونَ وَ لَكِنْ حَاجِجْهُمْ بِالسُّنَّةِ فَإِنَّهُمْ لَنْ يَجِدُوا عَنْهَا مَحِيصاً۔" (5)

یعنی: "تم ان سے قرآن کی رو سے بحث نہ کرنا کیونکہ قرآن بہت سے معنی کا حامل ہوتا ہے اور بہت سی وجہیں رکھتا ہے تم اپنی کہتے رہوگے اور وہ اپنی کہتے رہیں گے بلکہ تم حدیث سے ان کے سامنے استدلال کرنا، وہ اس سے گریز کی کوئی راہ نہ پاسکیں گے۔"

اسی طرح قرآن کریم میں ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ نبی کریم ﷺ کے متعلق ہمیں حکم دیتا ہے:

"وَ مَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۗ وَ مَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا۔" (6)

ترجمہ: "جو چیز تم کو رسولؐ دے دیں وہ لے لو اور جس چیز سے روکیں اس سے رک جاؤ۔"

اس میں واضح ہو رہا ہے کہ نبی کریم ﷺ جس چیز کے کرنے کا حکم دیں چاہے وہ قول کے ذریعے ہو یا فعل کے ذریعے اس پر عمل کرنا لازمی ہے اور جس چیز سے منع کر دیں تو اس سے رک جانا لازمی ہے۔

پس دین اور دینی علوم کی معرفت کا دار و مدار قرآن مجید اور احادیث رسول ﷺ پر ہے۔ قرآن تو ہمارے لئے قطعی الصدور ہے، جس میں ذرہ برابر بھی شک و شبہ نہیں ہے کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بذریعہ وحی نازل ہوا ہے، لیکن احادیث کی اکثریت قطعی الصدور نہیں ہیں، اس میں بہت زیادہ اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس کے متعلق حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"وَ لَقَدْ كُذِبَ عَلَى رَسُولِ اللهِ صلى الله عليه و آله وسلم عَلَى عَهْدِهِ حَتَّى قَامَ خَطِيباً فَقَالَ مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّداً فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ۔" (7)

یعنی: "رسول اللہ ﷺ پر آپؐ کے عہد میں جھوٹ بولا گیا یہاں تک کہ آپؐ کو خطاب کرنا پڑا کہ اے لوگو! مجھ پر کثرت سے جھوٹ بولا جا رہا ہے پس جو بھی مجھ پر جان بوجھ کر جھوٹ بولے گا وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں پائے گا۔"

پھر آپؐ کی رحلت کے بعد آپؐ پر جھوٹ بولا گیا۔ اسی لئے علماء کرام نے احادیث کو پرکھنے کے لئے کچھ اصول وضع کئے ہیں۔ احادیث کو اپنے مقررہ اصول و ضوابط پر پرکھنا انتہائی ضروری ہے تاکہ دین کے اصلی مصادر کو صحیح پہچانا جا سکے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ ﷺ کی زندگی میں ہی منافقین آپؐ پر جھوٹ بولنا شروع کیا تھا، چونکہ خود رسول اکرم ﷺ خود موجود تھے اسی ان کی اصلاحات کیا کرتے تھے اور منافقین ڈرتے رہتے تھے کہ کہیں رسول اکرم ﷺ کو ان کی ان حرکتوں کا پتا چل نہ جائے، لیکن رحلت کے بعد منافقین نے آپؐ پر بہت سے جھوٹ بولے اب تو انہیں کسی قسم کا کوئی ڈر بھی نہیں تھا۔

اسی اللہ کے رسول ﷺ اپنی زندگی میں یہ ارشاد فرمایا کہ جو شخص بھی آپؐ پر جھوٹ بولے گا وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں پائے گا یہ حدیث: مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّداً فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ متواتر احادیث میں سے ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک کثیر تعداد نے اس حدیث کو روایت کیا ہے۔ یہ حدیث تقریباً شیعہ سنی کی بڑی

تعداد کی کتب میں موجود ہے۔ لہٰذا جب بھی کوئی حدیث سنی جائے یا روایت کی جائے تو ان کے راوی یا رواۃ کو ضرور بیان کیا جائے اس کے بعد اس حدیث کو عقل بنیاد پر بھی پرکھا جائے۔ کیونکہ ایسا نہ ہو کہ وہ حدیث عقل کے خلاف ہو۔ حضرت علی علیہ السلام نے ہر سنی اور بیان کی جانے والی حدیث کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں:

"اِعْقِلُوا الْخَبَرَ إِذَا سَمِعْتُمُوهُ عَقْلَ رِعَايَةٍ لَا عَقْلَ رِوَايَةٍ فَإِنَّ رُوَاةَ الْعِلْمِ كَثِيرٌ وَ رُعَاتَهُ قَلِيلٌ۔" (8)

یعنی: "جب کوئی حدیث سنو تو اسے عقل کے معیار پر رکھ لو صرف نقل پر بس نہ کرو کیونکہ علم کے نقل کرنے والے تو بہت ہیں اور اس پر غور و فکر کرنے والے کم ہیں۔"

اس قول سے یہ بات واضح ہو رہی ہے کہ حدیث کو سن کر فوراً اسی پر عمل نہ کیا جائے بلکہ اس کی تحقیق کی جائے کہ وہ حدیث صحیح ہے یا نہیں ہے۔ اسی لئے علماء نے حدیث کو پرکھنے کے لئے کچھ اصول وضع کئے ہیں۔ اسی طرح حضرت علی علیہ السلام کا ایک اور ارشاد ہے:

"إِذَا حَدَّثْتُمْ بِحَدِيثٍ، فَأَسْنِدُوهُ إِلَى الَّذِي حَدَّثَكُمْ، فَإِنْ كَانَ حَقّاً فَلَكُمْ، وَإِنْ كَانَ كَذِباً فَعَلَيْهِ۔" (9)

یعنی: "جب حدیث بیان کرو تو جس نے تم سے وہ حدیث بیان کی ہے اس کی سند کا بھی ذکر کرو اگر وہ صحیح ہو گی تو تمہیں فائدہ پہنچے گا اور جھوٹ ہو گی تو اس کا مظلمہ بیان کرنے والے پر ہو گا۔"

رسول اللہ ﷺ کا حضرت علیؑ کو تعلیم دینا

حضرت علی علیہ السلام کو نبی کریم ﷺ نے ہی تعلیم دی جس کے متعلق خود امیر المؤمنین علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

"وَ الَّذِي بَعَثَهُ بِالْحَقِّ وَ اصْطَفَاهُ عَلَى الْخَلْقِ مَا أَنْطِقُ إِلَّا صَادِقاً وَ قَدْ عَهِدَ إِلَيَّ بِذَلِكَ كُلِّهِ وَ بِمَهْلِكِ مَنْ يَهْلِكُ وَ مَنْجَى مَنْ يَنْجُو وَ مَآلِ هَذَا الْأَمْرِ وَ مَا أَبْقَى شَيْئاً يَمُرُّ عَلَى رَأْسِي إِلَّا أَفْرَغَهُ فِي أُذُنَيَّ وَ أَفْضَى بِهِ إِلَيَّ۔" (10)

یعنی: "اس ذات کی قسم جس نے پیغمبرؐ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا اور ساری مخلوقات میں سے اسے منتخب کیا، میں جو کہتا ہوں سچ کہتا ہوں، مجھے رسول اللہ ﷺ نے ان تمام چیزوں اور ہلاک ہونے والوں کی ہلاکت، اور نجات پانے والوں کی نجات اور اس امر کے انجام کی خبر دی ہے۔ اور ہر وہ چیز جو سر پر سے گذرے گی اسے میرے کانوں میں ڈالے اور مجھ تک پہنچائے بغیر نہیں چھوڑا۔"

اسی طرح ایک اور مقام پر حضرت علی علیہ السلام اپنے آپؑ کو رسول ﷺ کے علم کا دروازہ کہتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

''نَحْنُ الشِّعَارُ وَ الْأَصْحَابُ وَ الْخَزَنَةُ وَ الْأَبْوَابُ وَ لَا تُؤْتَى الْبُيُوتُ إِلَّا مِنْ أَبْوَابِهَا فَمَنْ أَتَاهَا مِنْ غَيْرِ أَبْوَابِهَا سُمِّيَ سَارِقاً۔'' (11)

یعنی: ''ہم قریبی تعلق رکھنے والے اور خاص ساتھی، خزانہ دار اور دروازے ہیں اور گھروں میں دروازوں ہی سے آیا جاتا ہے اور جو دروازوں کو چھوڑ کر کسی اور طرف سے آئے اس کا نام چور ہوتا ہے۔''

اسی طرح ایک اور مقام پر آپ علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

''وَإِنَّمَا هُوَ تَعَلُّمٌ مِنْ ذِي عِلْمٍ ۔۔۔ تَضْطَمَّ عَلَيْهِ جَوَانِحِي۔'' (12)

یعنی: ''یہ صاحب علم (رسولؐ) سے معلوم کی ہوئی باتیں ہیں۔ علم غیب تو قیامت کی گھڑی کا علم ہے، اور ان چیزوں کا علم ہے جن اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں شمار کر دیا ہے کہ اللہ کے پاس قیامت کا علم ہے۔ اور بارش کے برسانے والا وہی ہے۔ اللہ جانتا ہے کہ شکموں میں کیا ہے۔ اس کے علاوہ کسی کو نہیں معلوم کہ کل کیا کمائے گا اور کس سرزمین پر موت آئے گی۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ جانتا ہے کہ شکم مادر میں بچہ نر ہے یا مادہ، بدصورت ہے یا خوبصورت، سخی ہے یا بخیل، بدبخت ہے یا خوش نصیب، اور کون ہے جو جہنم کا ایندھن ہوگا اور کون جنت میں نبیوں کا رفیق ہوگا۔ یہ وہ علم ہے جسے اللہ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔ رہا علاوہ دوسری چیزوں کا علم ہے جو اللہ نے اپنے نبی ﷺ کو دیا اور نبیؐ نے مجھے بتایا اور میرے لئے دعا فرمائی کہ میرا سینہ انہیں محفوظ رکھے اور میری پسلیاں انہیں سمیٹے رہیں۔''

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی علیہ السلام کو تمام علوم نبی کریم ﷺ کی طرف ملے ہوئے تھے اور نبی کریم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے تعلیم دی تھی نتیجہ میں حضرت علی علیہ السلام کے تمام علوم اللہ تعالیٰ کی طرف سے تھے

''عَبْدِ اللهِ قَالَ حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ عِيسَى۔۔۔ عِلْمَ الْمَنَايَا وَ الْبَلَايَا وَ فَصْلَ الْخِطَابِ۔'' (13)

یعنی: ''اصبغ بن نباتا حضرت علی علیہ السلام سے حدیث بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت علیؑ کو کہتے ہوئے سنا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے حلال و حرام کے ہزار باب، جو کچھ تھا اور جو کچھ ہوگا تعلیم کئے ہیں۔۔۔۔۔۔۔''

پس اس حدیث کی روشنی میں حضرت علی علیہ السلام کا ہر قول درحقیقت حدیث کی ترجمانی ہے اس حیثیت سے نہج البلاغہ مکمل ایک حدیث کی کتاب ہے۔

احادیث کی اقسام

حضرت علی علیہ السلام احادیث کی اقسام بیان کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

"إِنَّ فِي أَيْدِي النَّاسِ حَقّاً وَ بَاطِلًا وَ صِدْقاً وَ كَذِباً وَ نَاسِخاً وَ مَنْسُوخاً وَ عَامّاً وَ خَاصّاً وَ مُحْكَماً وَ مُتَشَابِهاً وَ حِفْظاً وَ وَهْماً وَ لَقَدْ كُذِبَ عَلَى رَسُولِ اللهِ صلى الله عليه و آله عَلَى عَهْدِهِ حَتَّى قَامَ خَطِيباً فَقَالَ مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّداً فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ۔" (14)

یعنی: "لوگوں کے ہاتھوں میں حق اور باطل، صدق و کذب، ناسخ و منسوخ، عام و خاص، محکم و متشابہ، اور حقیقت و وہم سب کچھ ہے۔ اور کذب و افترا کا سلسلہ رسول اکرم ﷺ کی زندگی ہی سے شروع ہو گیا تھا، جس کے بعد آپ نے منبر پر اعلان کیا تھا کہ: جس شخص نے بھی میری طرف سے غلط بیانی کی اسے اپنی جگہ جہنم میں بنالینا چاہیے۔"

راویوں کی اقسام

حضرت علی علیہ السلام راویوں کی چار اقسام بیان کرتے ہیں جن میں سے صرف ایک کی روایت قابل قبول ہے باقی تین رواۃ کی احادیث قابل قبول نہیں ہیں:

"وَإِنَّمَا أَتَاكَ بِالْحَدِيثِ أَرْبَعَةُ رِجَالٍ لَيْسَ لَهُمْ خَامِسٌ۔" (15)

یعنی: "یاد رکھو کہ حدیث کے بیان کرنے والے چار طرح کے لوگ ہوتے ہیں جن کی پانچویں کوئی قسم نہیں ہے۔"

ان راویوں کے اوصاف اس طرح بیان کرتے ہیں:

پہلی قسم: منافق راوی

حضرت علی علیہ السلام احادیث کے راویوں کی چار اقسام بیان کرتے ہیں، ان میں سب سے پہلی قسم: منافق روایوں کی ہے، جس کے بارے میں فرماتے ہیں:

"رَجُلٌ مُنَافِقٌ مُظْهِرٌ لِلْإِيمَانِ مُتَصَنِّعٌ بِالْإِسْلَامِ۔۔۔ فَهَذَا أَحَدُ الْأَرْبَعَةِ۔" (16)

یعنی: "ایک راوی وہ منافق ہے جو ایمان کا اظہار کرتا ہے۔ اسلام کی وضع قطع اختیار کرتا ہے لیکن گناہ کرنے اور افتراء میں پڑنے سے پرہیز نہیں کرتا اور رسول اکرم ﷺ کے خلاف قصداً جھوٹی روایتیں تیار کرتا ہے۔ اگر لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ یہ منافق اور جھوٹا ہے تو یقیناً اس کے بیان

کی تصدیق نہ کریں گے لیکن مشکل یہ ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ صحابی ہے۔اس نے حضورؐ کو دیکھا ہے، آپؐ کے ارشاد کو سنا ہے اور آپؐ سے حاصل کیا ہے۔اس طرح اس کے بیان کو قبول کر لیتے ہیں، جب کہ خود پروردگار بھی منافقین کے بارے میں خبر دے چکا ہے اور ان کے اوصاف کا تذکرہ کر چکا ہے اور یہ رسول اکرم ﷺ کے بعد بھی باقی رہ گئے تھے۔ گمراہی کے پیشواؤں اور جہنم کے داعیوں کی طرح اسی غلط بیانی اور افتراء پردازی سے تقرب حاصل کرتے تھے۔ وہ انہیں عہدے دیتے رہے اور لوگوں کی گردنوں پر حکمراں بناتے رہے اور انہیں کے ذریعے دنیا کو کھاتے رہے اور لوگ تو بہر حال بادشاہوں اور دنیاداروں ہی کے ساتھ رہتے ہیں، علاوہ ان کے جنہیں اللہ اس شر سے محفوظ کر لے۔"

اس حصہ کی تشریح کرتے ہوئے مفتی جعفر حسینؒ لکھتے ہیں: "پہلی قسم یہ ہے کہ راوی خود سے کسی روایت کو وضع کرکے پیغمبر کی طرف منسوب کر دے۔ چنانچہ ایسی روایتیں گھڑ کر آپ کے سر منڈھ دی جاتیں تھیں اور بعد میں یہ سلسلہ جاری رہا اور نت نئی روایتیں معرض وجود میں آتی رہیں۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور اگر کوئی انکار کرتا ہے تو اس کی بنیاد علم و بصیرت پر نہیں بلکہ سخن پروری اور مناظرانہ ضرورت پر ہوتی ہے۔" (17)

بہر صورت یہ وہ لوگ تھے جن کے دلوں میں نفاق بھرا ہوا تھا اور دین میں فتنہ وانتشار پیدا کرنے اور کمزور عقیدہ مسلمانوں گمراہوں کرنے کے لئے من گھڑت روایات بناتے تھے اور جس طرح پیغمبر اکرم ﷺ کے زمانے میں لوگوں کے ساتھ گھلے ملے رہتے تھے۔ قرآن مجید میں ان کو ملعون کہا گیا ہے ارشاد ہے:

"مَّلْعُوْنِيْنَ ۚ اَيْنَمَا ثُقِفُوْٓا اُخِذُوْا وَقُتِّلُوْا تَقْتِيْلًا۔" (18)

ترجمہ: "(یہ منافقین) پھٹکارے ہوئے ہیں جہاں پائے جائیں پکڑے جائیں اور جان سے مار ڈالے جائیں"

اسی طرح آپؐ کے بعد ان میں گھلے ملے رہے، جس طرح اس وقت فساد و تخریب میں لگے رہتے تھے اسی طرح آپؐ کے بعد بھی اسلام کی تعلیمات کو بگاڑنے اور اس کے نقوش کو مسخ کرنے کی فکر سے غافل نہ تھے بلکہ پیغمبر اکرم ﷺ کے زمانہ میں تو ڈرے سہمے رہتے تھے کہ کہیں پیغمبر اکرم ﷺ انہیں بے نقاب کرکے رسوا نہ کردیں مگر آپؐ کے بعد ان کی منافقانہ سرگرمیاں بڑھ گئیں اور بے جھجک اپنے مفاد و

اغراض کے لئے پیغمبر اکرم ﷺ پر جھوٹ و افتراء باندھ دیتے تھے۔ان کے فتنہ و فساد اور فسق و فجور کو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اس طرح بیان کیا ہے:

''اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَ الْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمُنْكَرِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوْفِ وَ يَقْبِضُوْنَ اَيْدِيَهُمْ ؕ نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ ؕ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ۔'' (19)

ترجمہ: ''منافق مرد اور منافق عورتیں ایک دوسرے کے ہم جنس (یعنی ایک ہی طرح کے) ہیں کہ برے کام کرنے کو کہتے اور نیک کاموں سے منع کرتے اور (خرچ کرنے سے) ہاتھ بند کئے رہتے ہیں۔انہوں نے خدا کو بھلا دیا تو خدا نے بھی ان کو بھُلا دیا۔ بیشک منافق نافرمان ہیں۔''

ابن ابی الحدید اس کی وضاحت اس طرح بیان کرتے ہیں:

''لما ترکوا ترکوا وحیث سکت عنهم سکتوا۔۔۔ بذکرهم غرض دنیوی۔'' (20)

یعنی: ''جب انہیں کھلا چھوڑ دیا گیا تو انہوں نے بہت سی باتوں کو چھوڑ دیا اور جب ان سے خاموشی اختیار کر لی گئی تو انہوں نے بھی اسلام اور اہل اسلام کے بارے میں چپ سادھ لی مگر در پردہ فریب کاریاں عمل میں لاتے رہتے تھے۔ جیسے کذب تراشی کہ جس کی طرف امیر المؤمنینؑ نے اشارہ کیا ہے۔ کیونکہ حدیث میں جھوٹ کی بہت زیادہ آمیزش کر دی گئی تھی اور یہ فاسد العقیدہ رکھنے والوں کی طرف سے ہوتی تھی چنانچہ وہ اس کے ذریعہ سے گمراہی پھیلاتے، دلوں میں خدشے اور عقائد میں خرابیاں پیدا کرتے تھے اور بعض کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ وہ ایک جماعت کو بلند کریں کہ جس سے ان کی دنیوی اغراض وابستہ ہوتی تھی۔''

دوسری قسم: بھولنے والے راوی

دوسرے وہ راوی ہیں جو بھول جانے والے ہیں، جن کے بارے میں حضرت علی علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

''وَ رَجُلٌ سَمِعَ مِنْ رَسُولِ اللهِ شَيْئاً لَمْ يَحْفَظْهُ عَلَى وَجْهِهِ فَوَهِمَ فِيهِ وَ لَمْ يَتَعَمَّدْ كَذِباً فَهُوَ فِي يَدَيْهِ وَ يَرْوِيهِ وَ يَعْمَلُ بِهِ وَ يَقُولُ أَنَا سَمِعْتُهُ مِنْ رَسُولِ اللهِ صلى الله عليه و آله فَلَوْ عَلِمَ الْمُسْلِمُونَ أَنَّهُ وَهِمَ فِيهِ لَمْ يَقْبَلُوهُ مِنْهُ وَ لَوْ عَلِمَ هُوَ أَنَّهُ كَذَلِكَ لَرَفَضَهُ۔'' (21)

یعنی: ''دوسرا راوی شخص وہ ہے جس نے رسول اکرمؐ سے کوئی بات سنی ہے لیکن اسے صحیح طریقہ سے محفوظ نہیں کر سکا ہے اور اس میں غلطی کا شکار ہو گیا ہے۔ جان بوجھ کر جھوٹ نہیں

بولتا ہے۔ جو کچھ اس کے ہاتھ میں ہے اسی کی روایت کرتا ہے اور اسی پر عمل کرتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ یہ میں نے رسول اکرمؐ سے سنا ہے حالانکہ اگر مسلمانوں کو معلوم ہو جائے کہ اس سے غلطی ہو گئی ہے تو ہر گز اس کی بات قبول نہ کریں گے بلکہ اگر اسے خود بھی معلوم ہو جائے کہ یہ بات اس طرح نہیں ہے تو ترک کر دے گا اور نقل نہیں کرے گا۔"

تیسری قسم: اہل شبہ راوی

تیسری قسم کے راویوں کے بارے میں حضرت علی علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

"وَ رَجُلٌ ثَالِثٌ سَمِعَ مِنْ رَسُولِ اللهِ صلی اللہ علیہ و آلہ شَيْئاً يَأْمُرُ بِهِ ثُمَّ إِنَّهُ نَهَى عَنْهُ وَ هُوَ لَا يَعْلَمُ أَوْ سَمِعَهُ يَنْهَى عَنْ شَيْءٍ ثُمَّ أَمَرَ بِهِ وَ هُوَ لَا يَعْلَمُ فَحَفِظَ الْمَنْسُوخَ وَ لَمْ يَحْفَظِ النَّاسِخَ فَلَوْ عَلِمَ أَنَّهُ مَنْسُوخٌ لَرَفَضَهُ وَ لَوْ عَلِمَ الْمُسْلِمُونَ إِذْ سَمِعُوهُ مِنْهُ أَنَّهُ مَنْسُوخٌ لَرَفَضُوهُ۔" (22)

یعنی: "تیسری قسم اس راوی شخص کی ہے جس نے رسول اکرم ﷺ کو حکم دیتے ہوئے سنا ہے لیکن حضرت نے جب منع کیا تو اسے اطلاع نہیں ہو سکی۔ یا حضرت کو منع کرتے ہوئے سنا ہے لیکن جب آپ نے دوبارہ حکم دیا تو اطلاع نہ ہو سکی۔ اس شخص نے منسوخ کو محفوظ کر لیا اور ناسخ کو محفوظ نہیں کر سکا ہے اور اگر اسے معلوم ہو جائے کہ یہ حکم منسوخ ہو گیا ہے تو اسے ترک کر دے گا۔ اور اگر مسلمانوں کو معلوم ہو جائے کہ اس نے منسوخ کی روایت کی ہے وہ بھی اسے نظر انداز کر دیں گے۔"

تیسرے قسم کے وہ رواۃ ہیں جنہوں نے رسول اللہ ﷺ سے جو حدیث سنی اسے اسی طرح یاد رکھا اور عمل کیا لیکن حدیث کے ناسخ کو سننے کا موقعہ نہ مل سکا۔ اس نے صرف منسوخ پر اکتفا کر لیا۔

چوتھی قسم: صادق اور حافظ راوی

چوتھی قسم ان راویوں کی ہے جو صادق بھی ہیں اور حافظ بھی ہیں لہٰذا انہی کی احادیث کا اعتبار کیا جاتا ہے:

"وَ آخَرُ رَابِعٌ لَمْ يَكْذِبْ عَلَى اللهِ وَ لَا عَلَى رَسُولِهِ۔۔۔ الْمُتَشَابِهَ فَوَضَعَ كُلَّ شَيْءٍ مَوْضِعَهُ۔" (23)

یعنی: "چوتھی قسم اس شخص (راوی) کی ہے، جس نے نہ اللہ پر جھوٹ بولا ہے اور نہ ہی رسول اللہ ﷺ کے خلاف غلط بیانی سے کام لیا ہے اور وہ اللہ کے خوف کی وجہ سے اور رسول اللہ ﷺ کی تعظیم کی بنا پر جھوٹ کا دشمن بھی ہے۔ اور اس سے بھول چوک بھی نہیں ہوئی ہے، بلکہ جیسے رسول اکرم ﷺ نے فرمایا ہے ویسے ہی محفوظ کر لیا ہے اور اسی پر عمل کیا ہے نہ اس میں کسی طرح کا اضافہ کیا ہے اور نہ

کمی کی ہے۔ ناسخ ہی کو محفوظ کیا ہے اور اسی پر عمل کیا ہے۔ اور منسوخ کو یاد رکھا ہے لیکن اس سے اجتناب کیا ہے۔ خاص و عام اور محکم و متشابہ کو بھی پہچانتا ہے اور اسی کے مطابق عمل بھی کرتا ہے۔"

چوتھی قسم کے وہ راوی ہیں کہ جو عدالت سے آراستہ، فہم و ذکا کے مالک، حدیث کے مورد و محل سے آگاہ، ناسخ و منسوخ، خاص و عام، مقید و مطلق سے واقف، کذب و افتراء سے کنارہ کش ہوتے تھے ان کے حافظہ محفوظ رہتا تھا اور اسے صحیح صحیح دوسروں تک پہنچا دیتے تھے۔ انہی کی بیان کردہ احادیث اسلام کا سرمایہ غل و غش سے پاک اور قابل اعتماد عمل ہیں۔ خصوصا وہ سرمایہ احادیث جو امیر المؤمنین علیہ السلام سے امانتدار سینوں میں منتقل ہوتا رہا اور قطع و برید اور تحریف و تبدل سے محفوظ رہنے کی وجہ سے اسلام کو صحیح صورت میں پیش کرتا ہے۔(24)

حدیث کے دورخ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی احادیث کے کچھ رخ ہوتے ہیں، ان کو بیان کرتے ہوئے حضرت علی علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

"وَ قَدْ كَانَ يَكُونُ مِنْ رَسُولِ اللهِ صلى الله عليه و آله الْكَلَامُ لَهُ وَجْهَانِ فَكَلَامٌ خَاصٌّ وَ كَلَامٌ عَامٌّ فَيَسْمَعُهُ مَنْ لَا يَعْرِفُ مَا عَنَى اللهُ سُبْحَانَهُ بِهِ وَ لَا مَا عَنَى رَسُولُ اللهِ صلى الله عليه و آله فَيَحْمِلُهُ السَّامِعُ وَ يُوَجِّهُهُ عَلَى غَيْرِ مَعْرِفَةٍ بِمَعْنَاهُ وَ مَا قُصِدَ بِهِ وَ مَا خَرَجَ مِنْ أَجْلِهِ۔" (25)

یعنی: "لیکن مشکل یہ ہے کہ کبھی کبھی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادات کے دو رخ ہوتے تھے۔ بعض کا تعلق خاص افراد سے ہوتا تھا اور بعض کلمات عام ہوتے تھے اور ان کلمات کو وہ شخص بھی سن لیتا تھا جسے یہ نہیں معلوم تھا کہ اللہ اور رسولؐ کا مقصد کیا ہے اور اسے سن کر اس کی ایک توجیہ کر لیتا تھا بغیر اس نکتہ کا ادراک کئے ہوئے کہ اس کلام کا مفہوم اور مقصد کیا ہے اور یہ کس بنا پر صادر ہوا ہے۔"

حضرت علی علیہ السلام اپنے بارے میں ارشاد فرماتے تھے:

"وَ كَانَ لَا يَمُرُّ بِي مِنْ ذَلِكَ شَيْءٌ إِلَّا سَأَلْتُهُ عَنْهُ وَ حَفِظْتُهُ فَهَذِهِ وُجُوهُ مَا عَلَيْهِ النَّاسُ فِي اخْتِلَافِهِمْ وَ عِلَلِهِمْ فِي رِوَايَاتِهِمْ۔" (26)

یعنی: "یہ صرف میں تھا کہ میرے سامنے کوئی ایسی بات نہیں گزرتی تھی مگر یہ کہ میں دریافت بھی کر لیتا تھا اور محفوظ بھی کر لیتا تھا۔ یہ ہیں لوگوں کے درمیان اختلافات کے اسباب اور روایات میں تضاد کے عوامل و محرکات۔"

رئیس احمد جعفری اس خطبہ کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"حدیث نبوی کی روایت ودرایت کے سلسلہ میں، امیر المؤمنینؑ نے اس سوال کے موقعہ پر جو کلمات ارشاد فرمائے در حقیقت بعد کے زمانے میں تمام ائمہ فن حدیث کے لئے وہ راہ نما ثابت ہوئے۔ حقیقت یہ ہے کہ علم حدیث تمام تر انہیں اصولوں پر منضبط ہوا ہے جو امیر المؤمنینؑ نے بیان فرمائے ہیں۔" (27)

اسی طرح اس خطبہ کی وضاحت میں علامہ ذیشان حیدر جوادی لکھتے ہیں:

"امام علیہ السلام کے انہیں بیانات کی روشنی میں علماء روایات حدیث کے قبول کرنے کے اصول مرتب کئے ہیں اور یہ طے کر دیا ہے کہ راوی منافق اور کاذب ہے تو اس کی روایت بہر حال قابل اعتبار نہیں ہے۔ اس کے بعد راوی میں صحیح محفوظ کرنے کی صلاحیت نہیں ہے تو تنہا اس کی روایت بھی قابل اعتبار نہیں ہے۔ راوی ہر اعتبار سے معتبر ہے اور ناسخ و منسوخ سے بے خبر ہے تو اس کی روایت پر عمل کرنے کے لئے بھی دوسری روایات پر نظر کرنا ضروری ہے تاکہ اس کے ناسخ کو تلاش کیا جاسکے۔ راوی کے جامع الشرائط ہونے کے بعد روایت قابل اعتبار تو ہو جاتی ہے لیکن قابل عمل نہیں ہوتی جب تک کہ علم رجال سے گذر کر مفہوم حدیث کی بحثوں کی منزل سے نہ گذر جائے اور اس کے صحیح مفہوم کا تعین نہ کر لیا جائے۔" (28)

حضرت علی علیہ السلام کو رسول اللہ ﷺ سے خاص قربت حاصل تھی جو کسی اور کو میسر نہ ہو سکی۔ اسی کی طرف حضرت علی علیہ السلام نہج البلاغہ میں اشارہ کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

"وَ قَدْ عَلِمْتُمْ مَوْضِعِي مِنْ رَسُولِ اللهِ صلى الله عليه و آله وسلم بِالْقَرَابَةِ الْقَرِيبَةِ وَ الْمَنْزِلَةِ الْخَصِيصَةِ وَضَعَنِي فِي حِجْرِهِ وَ أَنَا وَلَدٌ يَضُمُّنِي إِلَى صَدْرِهِ وَ يَكْنُفُنِي فِي فِرَاشِهِ وَ يُمِسُّنِي جَسَدَهُ وَ يُشِمُّنِي عَرْفَهُ وَ كَانَ يَمْضَغُ الشَّيْءَ ثُمَّ يُلْقِمُنِيهِ وَ مَا وَجَدَ لِي كَذْبَةً فِي قَوْلٍ وَ لَا خَطْلَةً فِي فِعْلٍ۔" (29)

یعنی: "تم میرے اس مقام کو جانتے ہی ہو، جو رسول اللہ ﷺ سے قریب کی قرابت داری اور مخصوص منزلت کی وجہ سے ہے، میں بچہ ہی تھا کہ رسول ﷺ نے مجھے گود میں لیا تھا، اپنے سینے سے چمٹائے رکھتے تھے، بستر میں اپنے پہلو میں جگہ دیتے تھے، اپنے جسم مبارک کو مجھ سے مس کرتے تھے، اور اپنی خوشبو مجھے سنگھاتے تھے، پہلے آپؐ کسی چیز کو چباتے تھے، پھر اس کے لقمے بنا کر میرے منہ میں دیتے تھے، انہوں نے نہ تو میری کسی بات میں جھوٹ کا کبھی شائبہ پایا اور نہ میرے کسی کام میں لغزش و کمزوری دیکھی۔"

اسی طرح امام ترمذی نے اپنی سنن میں حضرت علی علیہ السلام سے ایک حدیث بیان کی ہے:

"كُنْتُ إِذَا سَأَلْتُ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَ آلِهِ أَعْطَانِي وَإِذَا سَكَتُّ ابْتَدَأَنِي۔" (30)

یعنی: ''جب میں رسول اللہ ﷺ سے سوال کرتا تھا تو آپؐ مجھے عطا کرتے تھے اور جب خاموش رہتا تھا تو آپؐ خود ابتدا کرتے تھے۔''

رسول اللہ ﷺ کا حدود و قصاص کا اجرا کرنا

حضرت علی علیہ السلام نبی کریم ﷺ کے حدود و قصاص کے اجرا کرنے کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

''وَقَدْ عَلِمْتُمْ أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ رَجَمَ الزَّانِيَ الْمُحْصَنَ۔۔۔يُخْرِجُ أَسْمَاءَهُمْ مِنْ بَيْنِ أَهْلِهِ۔'' (31)

یعنی: ''تم جانتے ہو کہ رسول اللہ ﷺ نے جب زانی کو سنگسار کیا تو نماز جنازہ بھی اس کی پڑھی اور اس کے وارثوں کو اس کا ورثہ بھی دلوایا۔ قاتل سے قصاص لیا تو اس کی میراث اس کے گھر والوں کو دلائی۔ چور کے ہاتھ کاٹے اور زنا غیر محصنہ کے مرتکب کو تازیانے لگوائے تو اس کے ساتھ انہیں مال غنیمت میں سے حصہ بھی دیا اور انہوں نے مسلمان عورتوں سے نکاح بھی کئے۔ اس طرح رسول اللہ ﷺ نے ان گناہوں کی سزا ان کو دی اور جو ان کے بارے میں اللہ کا حق تھا اسے جاری کیا مگر انہیں اسلام کے حق سے محروم نہیں کیا اور نہ اہل اسلام سے ان کے نام خارج کئے۔''

اس ایک ہی پیراگراف میں حضرت علی علیہ السلام نے، رسول اکرم ﷺ کی پوری زندگی جس میں آپؐ نے حدود اور قصاص کا اجرا کیا، ان سب کو بیان کیا ہے

رسول اکرم ﷺ کا طرز زندگی

امیر المؤمنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام نبی کریم ﷺ کے زہد و ورع کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

''قَدْ حَقَّرَ الدُّنْيَا وَصَغَّرَهَا وَأَهْوَنَ بِهَا وَهَوَّنَهَا۔۔۔وَخَوَّفَ مِنَ النَّارِ مُحَذِّراً۔'' (32) یعنی: ''آپ ﷺ نے اس دنیا کو ذلیل و خوار سمجھا اور پست و حقیر جانا اور یہ جانتے تھے کہ اللہ نے آپؐ کی شان کو بالاتر سمجھتے ہوئے اس دنیا کو آپ سے الگ رکھا ہے۔ اس دنیا کو گھٹیا سمجھتے ہوئے دوسروں کے لئے اس کا دامن پھیلا دیا ہے۔ لہٰذا آپؐ نے دنیا سے دل سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور اس کی یاد کو دل سے بالکل نکال دیا اور یہ چاہا کہ اس کی سج دھج نگاہوں سے اوجھل رہے کہ نہ اس سے عمدہ لباس زیب تن فرمائیں اور نہ کسی خاص مقام کی امید کریں۔ آپؐ نے پروردگار کے پیغام کو پہنچانے میں سارے عذر اور بہانے بر طرف کر دیئے اور امت کو عذاب الٰہی سے ڈراتے ہوئے نصیحت فرمائی۔ جنت کی بشارت سنا کر اس کی طرف دعوت دی اور جہنم سے بچنے کی تلقین کر کے خوف پیدا کرایا۔''

مقالہ نگار نے ، پی ایچ ڈی کے مقالہ میں نہج البلاغہ سے احادیث رسول ﷺ کی تخریج کی ہے جس کی تفصیل درج ذیل پیش کی جارہی ہے:

خطبات

نہج البلاغہ کا پہلا حصہ حضرت علی علیہ السلام کے "خطبات اور کلام" پر مشتمل ہے۔اس حصہ میں سے (64)احادیث کی تخریج کی ہے۔جن میں سے صحیح احادیث کی تعداد (43) ہے۔حسن احادیث کی تعداد (2) ہے۔حسن غریب کی تعداد (2) ہے۔کچھ احادیث کے دو حکم وارد ہوئے ہیں یعنی حسن اور صحیح یا حسن غریب اور صحیح ان کی تعداد (4) ہے۔(13) احادیث کا حکم معلوم نہ ہو سکا اور ضعیف احادیث اس حصہ میں نہیں ہیں۔مرفوع متصل احادیث کی تعداد (62) ہے، جبکہ مرفوع منقطع کی تعداد صرف دو ہے۔موقوف اور مقطوع احادیث اس حصہ میں موجود نہیں ہیں۔

مکتوبات

نہج البلاغہ کا دوسرا حصہ حضرت علی علیہ السلام کے "مکتوبات اور رسائل و وصایا" پر مشتمل ہے۔اس حصہ میں سے (19) احادیث کی تخریج کی ہے۔جن میں سے صحیح احادیث کی تعداد (11) ہے۔حسن صحیح احادیث کی تعداد (1) ہے اور ضعیف احادیث کی تعداد (2) ہے۔اسی طرح غریب احادیث کی تعداد بھی (2) ہے۔ (3) احادیث کا حکم معلوم نہ ہو سکا۔مرفوع متصل احادیث کی تعداد (16) ہے۔موقوف احادیث کی تعداد (3) ہے، جبکہ اس حصہ میں مقطوع احادیث موجود نہیں ہیں۔

کلمات قصار

نہج البلاغہ کا تیسرا حصہ حضرت علی علیہ السلام کے" حکم اور کلمات قصار" پر مشتمل ہے۔ اس حصہ میں سے (49) احادیث کی تخریج کی ہے۔جن میں سے صحیح احادیث کی تعداد (25) ہے۔حسن صحیح احادیث کی تعداد (2) حسن احادیث کی تعداد (1) ہے ، حسن غریب کی تعداد (1) ہے۔ ضعیف احادیث کی تعداد (7) ہے۔ غریب احادیث کی تعداد (2) ہے اور (11) احادیث کا حکم معلوم نہ ہو سکا۔مرفوع متصل احادیث کی تعداد (43) ہے۔موقوف احادیث کی تعداد (6) ہے۔جبکہ اس حصہ میں مقطوع احادیث موجود نہیں ہیں۔

اس مقالہ میں 132 احادیث کی تخریج کی گئی ہے، جن میں حصہ اول میں سے 64 احادیث نبویہ، حصہ دوئم میں سے 19 احادیث نبویہ اور حصہ سوئم میں سے 49 احادیث نبویہ کی تخریج کی گئی ہے۔ان کی تفصیل اس طرح ہے:

(الف) صحت وضعف کے اعتبار سے :

1) صحیح احادیث کی تعداد 82 ہے۔
2) حسن صحیح کی تعداد 2 دو ہے۔
3) چار 4 احادیث ایسی ہیں جن کے حکم میں اختلاف پایا جاتا ہے، ان کے بارے میں کہا گیا ہے کسی نے صحیح، کسی نے حسن اور کسی نے صحیح حسن کہا ہے۔
4) حسن احادیث کی تعداد تین 3 ہے۔
5) حسن غریب احادیث کی تعداد بھی 3 ہے۔
6) ضعیف احادیث کی تعداد 9 ہے۔
7) غریب احادیث کی تعداد 3 ہے۔
8) جن احادیث کا حکم معلوم نہ ہو سکا ان کی تعداد 26 ہے۔

(ب) سند کے اعتبار سے :

1. احادیث مرفوع متصل کی تعداد 121 ہے
2. احادیث مرفوع منقطع کی تعداد 2 ہے
3. احادیث موقوفہ کی تعداد 9 ہے۔

جبکہ اس میں کوئی بھی مقطوع حدیث موجود نہیں ہے۔

(ج) موضوع یا عدم موضوع کے لحاظ سے :

اس میں کوئی بھی موضوع حدیث موجود نہیں ہے۔

(د) تخریج کے لحاظ سے

دو احادیث کی تخریج تحقیق کے باوجود نہ ہو سکی۔ کیونکہ جن کتب میں یہ احادیث آئیں، ان میں نہج البلاغہ ہی کا حوالہ پیش کیا گیا ہے۔

نتیجہ : نتیجہ یہ ہے کہ قرآن کریم کو حدیث مبارکہ کے بغیر سمجھا نہیں جا سکتا کیونکہ حدیث قرآن کی تفسیر ہے۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ جب بھی کوئی حدیث بیان کی جائے تو اس حدیث کو عقل کی بنیاد پر پرکھا جائے تاکہ صحیح اور غیر صحیح، مقبول و مردود حدیث میں تمیز ہو سکے۔ تمام قسم کی احادیث حق و باطل، صدق و کذب، ناسخ و

منسوخ، عام و خاص، محکم و متشابہ، اور حقیقت و وہم موجود ہیں۔ ہر راوی کی حدیث کو قبول نہ کیا جائے کیونکہ روایوں چار اقسام ہیں جن میں منافق، اہل شبہ، خاطی اور وہم کرنے والے اور صادق ان میں سے صرف صادق اور قابل وثوق رواۃ کی حدیث کو ہی قبول کیا جائے گا لیکن اس کے باوجود بھی غور و فکر کی ضرورت ہے کیونکہ روای تو صادق ہے لیکن حدیث سے جو رسول اللہ ﷺ کی مراد اور مقصود ہے کو سمجھا بھی ہے یا نہیں۔ لہٰذا حدیث کو ان کے مقرر کردہ اصولوں پر رکھنا انتہائی ضروری ہے اور پرکھے بغیر کسی بھی حدیث کو قبول نہیں کیا جائے گا۔ اسی طرح اس مقالہ میں رسول اکرم ﷺ کے قول و فعل کو بطور حدیث واضح کیا گیا اسی طرح احادیث کی مجموعی تعداد بیان کی گئی جن کی پی ایچ ڈی کے مقالہ میں تخریج کی گئی تھی۔

*****

حوالہ جات

1۔ الباجی حافظ ابو الولید سلیمان ابن خلف (المتوفی: 474ھ)، التعدیل والتجریح، جلد 1، صفحۃ 21

2۔ ڈاکٹر خالد علوی، "اصول الحدیث"، ناشر: محمد فیصل، ندیم یونس پرنٹرز لاہور، طبع سال 1998م، جلد 1، صفحۃ 38

3۔ الشہید الثانی زین الدین ابن علی العاملی (المتوفی: 965ھ)، "منیۃ المرید فی ادب المفید و المستفید"، ناشر: مکتبۃ الاعلام الاسلامی، طبع اول سال 1409ھ، صفحۃ 369

4۔ قرآن الکریم، سورۃ النحل: آیت 40

5۔ مفتی جعفر حسین، **"مترجم نہج البلاغہ"**، ناشر: معراج کمپنی لاہور، طبع سوم 2013، باب مکتوبات ووصایا، وصیت 77، صفحہ 625

6۔ القرآن الکریم، سورۃ الحشر، آیت 7

7۔ نہج البلاغہ، خطبہ 208، صفحہ 454

8۔ نہج البلاغۃ قول 98، صفحہ 649

9۔ الکلینی الشیخ ابو جعفر محمد بن یعقوب بن اسحاق (المتوفی: 329ھ)، "الکافی"، ناشر: دار الکتب الاسلامیۃ تہران ایران، طبع سوم سال 1367ھ ش، جلد 1، صفحۃ 52

10۔ نہج البلاغہ، خطبہ 173، صفحہ 358

11۔ نہج البلاغہ، خطبہ 152، صفحہ 318

12۔ نہج البلاغہ، خطبہ 126، صفحہ 280

13۔ابن بابویہ محمد بن علی (المتوفی: 381)، کتاب: "الخصال"، تحقیق غفاری علی اکبر، ناشر جامعۃ المدرسین قم المقدس، طبع اول سال 1362ھ ش۔ جلد 2، صفحہ: 643

14 ۔ مفتی جعفر حسین، نہج البلاغہ، خطبہ 208، صفحہ 454

15۔ نہج البلاغہ، خطبہ 208، صفحہ 454

16۔ نہج البلاغہ، خطبہ 208، صفحہ 454

17۔ مفتی جعفر حسینؒ، نہج البلاغہ شرح خطبہ 210، صفحہ 456

18۔ سورۃ الاحزاب: 22

19۔ سورۃ التوبہ: آیت 67

20۔ شرح نہج البلاغہ لابن ابی الحدید، جلد 3، صفحہ 14

21۔ نہج البلاغہ، خطبہ 208، 455

22۔ نہج البلاغہ، خطبہ 208، 455

23۔ نہج البلاغہ، خطبہ 208، 455

24۔ مفتی جعفر حسین، مترجم نہج البلاغہ، ناشر: معراج کمپنی لاہور، طبع سوم 2013، صفحہ 460

25۔ نہج البلاغہ، خطبہ 208، 455

26۔ نہج البلاغہ، خطبہ 208، 456

27۔ رئیس احمد جعفری، مترجم نہج البلاغہ، صفحہ 512

28۔السید علامہ ذیشان حیدر جوادی، مترجم نہج البلاغہ، ناشر: عصمۃ پبلیکیشنز کراچی، طبع اول: آگست 2007، صفحہ 430

29۔ نہج البلاغہ، خطبہ 190، صفحہ 419

30۔ابو عیسی محمد بن عیسی بن سورۃ بن موسی بن الضحاک الترمذی (المتوفی: 279ھ)، **"سنن الترمذی الجامع الصحیح"**، ابواب المناقب عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم - باب، حدیث: 3740

31۔ خطبہ 125، صفحہ 278

32۔ خطبہ 107، صفحہ 249

قرآن وحدیث کی روشنی میں
اضطراب سے مقابلے کے طریقے (۱)

سید عقیل حیدر زیدی*
aqeel.zaidi1968@gmail.com

کلیدی الفاظ : اضطراب، بے چینی، آرام وآسائش، ایمان، توکل، آزمون، رزاقیت پروردگار، زہد، صبر، اجتماعی تعلقات۔

خلاصہ

انسان فطرتاً چاہتا ہے کہ وہ آرام وآسائش اور ہر قسم کے دردِ سر اور مشکلات سے دور زندگی گزارے۔ لیکن بعض انسان اپنی اس پاک فطرت و سرشت سے منحرف ہو کر اپنی آسائش اور آرام کو دوسری چیزوں میں تلاش کرتے ہیں، اس پہلو سے غفلت کرتے ہوئے کہ انسان کا آرام وآسائش خدا پر ایمان، اس کے وعدوں پر یقین اور اسلام کے زندگی ساز دستورات پر عمل پیرا ہونے اور خوشنودی پروردگار کے راستے میں قدم اُٹھانے میں ہے۔ بالخصوص اس وقت جب اضطراب کے عوامل کو خود انسان ہی ایجاد کرے اور پھر اس اضطراب وبے چینی سے نکلنے کے لئے راہِ حل تلاش کرے۔

دین مبین اسلام نے جامع اور کامل نظام بشری ہونے کے عنوان سے، انسان کو درپیش ہر قسم کے اسٹریس (Stress) اور اضطراب کا مقابلہ کرنے کے لئے بنیادی و اساسی روشیں اور طریقے بیان کئے ہیں کہ ان طریقوں پر عمل پیرا ہونا اس کی زندگی میں آرام وآسائش کا موجب اور ان روشوں سے دوری ہر قسم کے اضطراب کا سرمنشاء اور سبب ہے۔ یہ مقالہ ان بنیادی روشوں میں سے بعض کو آیات قرآنِ کریم اور احادیث آئمہ معصومین علیہم السلام کے استدلال کے ساتھ جاذب اور بہترین روش میں بیان کرتا ہے۔

*۔ پی۔ایچ۔ڈی اسٹوڈنٹ دانشگاہ علوم اسلامی رضوی، مشہد مقدس، اسلامی جمہوریہ ایران۔

مقدمہ

نفسیاتی دباؤ موجودہ زمانے کی رائج ترین بیماریوں میں سے ایک ہے، اس طرح سے کہ عالمی ادارۂ صحت (Unisafe) کے ماہرین کی تحقیقات کے مطابق دنیا کی تقریباً چھ فیصد (6%) آبادی نفسیاتی بیماریوں میں مبتلاء ہے اور نیز اسّی فیصد (80%) جسمانی بیماریوں کا آغاز نفسیاتی دباؤ (Mentely Presure) کے ساتھ ہی ہوتا ہے۔

علمِ نفسیات کے ماہرین نے نفسیاتی دباؤ سے مقابلہ کے لئے کئی روشیں اور طریقے پیش کئے ہیں اور اسلام بھی گزشتہ صدیوں میں کامیاب رہا ہے کہ لاکھوں افراد کو مختلف جغرافیای خطوں اور بہت سی نسلوں سے اپنی طرف جذب کرے اور اُن کی زندگی کا انداز تبدیل کرنے کے ساتھ، اُن کی اجتماعی اور انفرادی زندگی کے لئے قابلِ قبول قوانین وضع کرے۔

بے شک دین مبین اسلام نے ایسی روشوں کی پیروی کی ہے کہ حتیٰ اگر اُن کو کسی نفسیاتی انجمن یا نظام کا عنوان نہ بھی دیں، لیکن پھر بھی اپنے اندر مخصوص علم نفسیات کا ایک ایسا نظام رکھتا ہے کہ جس کا ابتدائی محور قرآنِ کریم ہے۔ اس لئے قرآنِ کریم کی طرف توجہ کو، اس طرح کی بیماریوں کو جڑ سے اُکھاڑنے میں، مؤثر ترین روش کے عنوان سے شمار کیا جاسکتا ہے اور یہ چیز خود قرآنِ کریم کی عظمت سے بالاتر ہو کر اس کے رفاہی اور طبّی اُمور میں معجزہ اور تاثیر گزار ہونے کو ظاہر اور آشکارا کرتی ہے۔ (1)

دوسری طرف آئمہ معصومین علیہم السلام کی روایات انسان کے بہتر زندگی گزارنے کے لئے مکمل سفارشات اور دستورات رکھتی ہیں، لیکن اس سے غفلت کرتے ہوئے کہ مسلمانوں نے ابھی تک ان روایات کو اپنی مشکل کے حل کے لئے کارساز نہیں جانا ہے اور فقط روایت کی حد تک ان سے اپنی زندگی کے بعض اُمور میں استفادہ کیا ہے۔

زیر نظر مقالہ اسلام کے ان دو غنی مأخذ کی طرف مکمل توجہ کے ساتھ، روحانی اور نفسیانی آرام و سکون تک پہنچنے کے لئے طریقوں، مہارتوں اور روشوں کو اپنی استعداد اور صلاحیت کی حد تک مورد تحقیق و جستجو قرار دیتا ہے۔

موضوع کی اہمیت

اضطراب اور بے چینی ہر انسان کی زندگی کے ایک حصے کے طور پر، تمام افراد میں اعتدال کی حد تک پایا جاتا ہے اور اس حدّ تک اس کا ہونا ضروری بھی تصور کیا جاتا ہے، اس طرح سے کہا جاسکتا ہے: کہ ''اگر اضطراب نہ ہوتا تو ہم سب اپنی میزوں کے پیچھے سو جاتے۔''

اضطراب اور بے چینی کا نہ ہونا، ممکن ہے ہمیں بہت سی مشکلات اور خطرات سے دُچار کرے، یہ اضطراب اور اسٹریس ہی ہے کہ جو ہم کو بہت سے اہم کاموں کی ترغیب دلاتا ہے، جیسے: بیماریوں کا علاج، بیوی بچوں کی تربیت، گناہوں سے دوری، عبادت وغیرہ۔

بنابرایں، اضطراب ہر انسان کی زندگی کے ایک حصے کے طور پر، اس کی شخصیت کے بنانے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اضطراب بعض مواقع پر، انسان میں خلّاقیت اور ایجاد کرنے کی صلاحیت پیدا کرتا ہے، موقعیت سے صحیح استفادہ کرنے اور اس پر مسلّط ہو جانے کا موقع فراہم کرتا ہے اور یا انسان کو اس پر اُبھارتا ہے کہ اہم مسئولیت، جیسے کسی امتحان کے لئے تیار ہونے یا ایک اجتماعی کام کو قبول کرنے کو حقیقی اور واقعی طور پر قبول کرے۔

لیکن اگر اضطراب اس حد سے تجاوز کر جائے اور انسان ساز حالت سے خارج ہو جائے تو ایک بیماری اور دائمی روگ کی صورت اختیار کر لیتا ہے، تو اس صورت میں اس کو شکست اور خطرات کا پیش خیمہ سمجھا جائے کہ جو انسان کو اس کے بہترین وسائل اور مواقع سے محروم کر دیتا ہے، اُس کی آزادی اور تاثیر کم ہو جاتی ہے اور اضطرابی کیفیت بڑھ کر اس کی روح و بدن کو ناکارہ کرتے ہوئے، اس میں غیر ضروری خوف اور وحشت کو ایجاد کرتی ہے۔

لہٰذا اس چیز کی طرف توجہ کرتے ہوئے اس طرح کے اضطراب اور نفسیاتی دباؤ سے مقابلہ کرنے کے لئے روشوں اور مہارتوں کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے؛ کیونکہ انسان، دنیا میں آرام و سکون اور آسائش چاہتا ہے اور اس قدر نفسیاتی اور روحانی دباؤ کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

تعریف

"اضطراب" عربی کلمہ ہے جو باب افتعال کا مصدر ہے اور حیران و سرگردان ہونا، حرکت کرنا، مختلف سمت میں زیادہ چلنا (اور بے چینی کا اظہار کرنا)، اس کے اُن معانی میں سے ہیں، جو لغت کی کتابوں میں اضطراب کے لئے بیان کئے گے ہیں۔ (2) "اضطراب" فارسی زبان میں پریشان ہونے، لرزنے، سراسیمگی، بے تابی، نگرانی، آشفتگی اور پریشان کرنے کے معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ (3) اور انگلش میں اُس کا معنی (Stress) ہے۔ اردو زبان میں بھی "اضطراب" فارسی زبان کی طرح بے تابی، بے چینی، نگرانی اور آشفتگی وغیرہ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ ماہرین علم نفسیات نے اسٹریس اور اضطراب کی مختلف صورتوں میں تعریف کی ہے:

الف) اضطراب، غالباً ایک ایسا بے تاب کر دینے والا انتظار ہے جو وسیع پیمانے پر نفسیاتی دباؤ اور خوف، کا باعث بنتا ہے اور معمولاً بغیر کسی نام کے ہوتا ہے۔

ب) نفسیاتی اور جسمانی پریشانی کہ جو کسی شخص میں نامعلوم خوف ،عدم تحفظ اور تاریک مستقبل کا احساس پیدا کر دیتی ہے۔

ج) اضطراب ایسی ہیجانی کیفیت ہے جو اس مادی دنیا کہ جس میں ہم زندگی گزار رہے ہیں، کی بے سروسامانی، نقائص اور بے معنی ہونے کی نسبت بطور مستقیم انسان کو لاحق ہوتی ہے۔

د) آئندہ کے خطرات اور بدبختیوں کی نسبت پہلے سے پریشانیوں کا لاحق ہونا، ساتھ ہی بے لذّتی اور بدمزگی کا احساس یا مستقبل کے خوف وخطر کی وجہ سے جسمانی دباؤ کی علامتوں کا اندرونی یا بیرونی طور پر ظاہر ہونا۔ (4)

مضطرب شخص اکثر اوقات اپنے اضطراب اور نفسیاتی دباؤ کے اسباب سے واقف نہیں ہوتا اور یہ نہیں جانتا کہ اس کی یہ اضطرابی کیفیت اندرونی عدم تحفظ کے احساس کی وجہ سے ہے یا بیرونی عوامل کی وجہ سے کہ جو اس کے دل میں خوف پیدا کر رہے ہیں۔ اسٹریس اور نفسیاتی دباؤ، پریشانی کی مانند زیادہ تر تخیّلات کی وجہ سے ہوتا ہے، لیکن دو جہات سے پریشانی سے مختلف ہوتا ہے:

۱۔ پریشانی کا تعلق خاص موقعوں اور مناسبتوں سے ہوتا ہے، جیسے: امتحانات، مالی مشکلات وغیرہ، جبکہ نفسیاتی دباؤ ایک ایسی اندرونی کیفیت ہے جو تمام اعضاء وجوارح پر مسلط ہوتی ہے۔

۲۔ پریشانی مشکلات کے وقت میں آنکھوں سے دیکھائی دیتی ہے درحالانکہ اضطراب اور نفسیاتی دباؤ ایک ذہنی مشکل کی وجہ سے وجود میں آتے ہیں۔ (5)

اسی طرح اضطراب ایک طرح کی اندرونی تشویش اور پریشانی ہے کہ جس کا منبع و مأخذ معلوم نہیں ہوتا ہے، اس نکتہ کی طرف توجہ بھی ضروری ہے کہ نفسیاتی دباؤ کی وجہ سے پیدا ہونے والا اضطراب، خوف سے مختلف ہے؛ کیونکہ خوف میں پریشانی کا منشاء معلوم ہوتا ہے، لیکن اضطراب میں اس طرح نہیں ہوتا، اضطراب عدمِ اطمینان، بے چارگی اور جسمانی طور پر بے قابو ہونے کے احساس کو شامل ہوتا ہے اور ایسا شخص نفسیاتی دباؤ، غیظ وغضب اور بے چینی کی شکایت کرتا ہے۔ (6)

نفسیاتی دباؤ سے مقابلے کے طریقے

۱۔ ایمان اور عقیدے کی تقویت

پہلا اور اہم ترین عامل جو نفسیاتی دباؤ اور اضطراب کے ایجاد کرنے میں بنیادی اور اساسی اثر رکھتا ہے وہ خداوند متعال اور اس کے وعدوں پر ایمان اور عقیدے کا ضعیف اور کمزور ہونا ہے۔ یقیناً فقط خدا ند عالم ہے جو انسانوں

کے خالق کے عنوان سے، انسان کے تمام وجودی زاویوں سے آگاہ ہے اور اس کے درد اور علاج کو بھی فقط خداوند اور اس کی برگزیدہ ہستیاں ہی جانتی ہیں۔ اگرچہ ممکن ہے کہ ان وجودی زاویوں میں سے بعض کو خود بشر بھی سمجھ لے، لیکن واضح ہے کہ بشر کا علم بھی محدود ہے اور اس میں خطا کا امکان بھی زیادہ ہے۔

دین مبین اسلام جو انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں پر محیط اور مشتمل ہے، اس کی اہم ترین تعلیمات میں سے خداوند پر ایمان اور اس کے وعدوں پر یقین رکھنا ہے۔ اس لئے توحید، اصول دین کا جزو شمار ہوتی ہے؛ کیونکہ تمام اسلامی تعلیمات کی بنیاد معرفتِ خدا اور خدا پرستی ہے۔ انسان کی تمام بدبختیاں، اس وقت شروع ہوتی ہیں جب وہ اس بنیادی اور اساسی اصل سے ہاتھ اُٹھا لیتا ہے اور خواہشاتِ نفس کی پیروی کرنے لگتا ہے۔ جی ہاں! اگر انسان نے اس دنیا میں اس انداز سے زندگی گزاری کہ "جو خداوند کہے گا اس پر عمل کروں گا" تو وہ کامیاب ہوگا اور بلند مرتبہ روحانی و نفسیاتی سلامتی کا مالک ہوگا۔ لیکن اگر اس کی تمام زندگی اس طرح ہوئی کہ "جو خواہشِ نفس ہوگی وہ کروں گا" تو ایسی زندگی پست نفسانی خواہشات کے گرد گھومے گی اور آہستہ آہستہ بدبختی کی وادی میں سقوط کر جائے گی۔

وہ چیز جس کو علم نفسیات کے ماہرین اپنے بہت سے اقوال اور کتابوں میں بیان کرتے ہیں، وہ یہ ہے کہ وہ زیادہ تر مادی علل و اسباب کے پہلوؤں پر اعتماد کرتے ہیں اور وہ خلقت کے ہدف اور اس کے خالق سے بالکل غافل ہوتے ہیں اور یہی امر باعث بنا ہے کہ علمِ نفسیات اپنی اس قدر پیشرفت کے برخلاف ابھی تک بشر کی واقعی مشکلات کا حل پیش کرنے سے عاجز رہا ہے۔ اس لئے آخری سالوں میں ہم اس چیز کا مشاہدہ کر رہے ہیں کہ ان میں سے بعض نے خداوند اور معنویت سے علاج کی طرف رُخ کیا ہے۔ (7) لیکن وہ اس سے غافل ہیں کہ علم نفسیات کی بہترین تعلیمات کو دین مبین اسلام نے سالوں پہلے صحیح اور واقعی صورت میں بیان کیا ہے۔

آج کل بھی بعض دانشمند اور علمِ نفسیات کے ماہرین اس عقیدہ پر پہنچے ہیں کہ "جو شخص واقعاً مذہب کا معتقد ہے ہرگز اعصابی امراض کا شکار نہیں ہوگا۔" (8) اور وہ لوگ خود "معنویت" کے مبلّغین میں سے ہو گئے ہیں۔ لیکن توجہ رکھنی چاہیے کہ وہ لوگ ہمیں اس جہت سے دینداری کی تشویق نہیں کرتے کہ ہم خداوند عالم پر ایمان لا کر موحّد اور خداپرست ہو جائیں اور آخرت کے حساب و کتاب پر اعتقاد پیدا کریں اور اُس عالم کی آتشِ جہنم سے رہائی حاصل کر لیں، بلکہ اِس دنیا کی آتش جہنم (یعنی نفسیاتی بیماریوں جیسے زخم معدہ اور اعصابی و نفسیاتی اور دیوانگی کے اختلالات کی جہنم) ہے کہ جس کی وجہ سے وہ معنویت سے گرویدہ ہونے کی سفارش کرتے ہیں۔

ویلیم جمیز" بابائے علمِ نفسیاتِ عملی" اپنے ایک دوست کو ایک خط میں لکھتا ہے کہ "میری زندگی کے جتنے بھی سال گزرتے جارہے ہیں معنویت اور دین پر اعتقاد کے بغیر زندگی گزارنا مشکل تر ہوتا جارہا ہے۔"

وہ دوسرے مقام پر اس طرح رقمطراز ہے:

"ایمان ایک ایسی طاقت ہے کہ بشر اس کی مدد سے زندگی گزارتا ہے اور اس (ایمان) کا کاملاً فاقد ہونا بشر کے (پستی میں) سقوط کے حکم میں ہے۔" (9)

کیوں دین پر ایمان رکھنا، ہمیں اس حد تک آرام، ٹھنڈا مزاج اور صبر و استقامت بخشتا ہے؟ ہم اس سوال کا جواب "ویلیم جمیز" کے الفاظ میں دیتے ہیں:

"سطحِ سمندر کی طلاطم خیز موجیں، ہرگز اس کی گہرائی کے آرام و سکون کو برباد نہیں کرتیں۔ وہ شخص جو بڑے عظیم و پائیدار حقائق پر دسترس رکھتا ہو، اس کی نظر میں زندگی کے ہر لمحے بدلتے نشیب و فراز، معمولی اور بے اہمیت چیزوں کی طرح جلوہ نما ہوتے ہیں۔ بنابرایں، ایک حقیقی متدیّن شخص، تزلزل ناپذیر اور ہر قسم کے جنجال اور تشویش سے بے نیاز ہوتا ہے اور روزگارِ زندگی میں پیش آنے والے ہر قسم کے ذمہ داری کی انجام دہی کے لئے بردباری و تحمل کے ساتھ آمادہ و تیار ہوتا ہے۔" (10)

البتہ اس نکتہ کی طرف توجہ بھی ضروری ہے کہ مسلمانوں کی ترقی و پیشرفت بھی انہی اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کی مرہونِ منت ہے۔ اب جو بھی ان تعلیمات پر عمل کرے گا کم از کم زندگی کے بعض اُمور میں ضرور موفق و کامیاب ہو جائے گا اور لازمی ہے کہ امام علی علیہ السلام کی اس تنبیہ کو مسلمانوں کے لئے خطرے کی گھنٹی سمجھا جائے کہ آپؑ نے فرمایا:

"وَاللّٰہَ اللّٰہَ فِی الْقُرْآنِ لَا یَسْبِقُکُمْ بِالْعَمَلِ بِہِ غَیْرُکُمْ" (11)

یعنی: "خدارا! خدارا! قرآن کے بارے میں، کہیں دوسرے اس کے دستورات اور تعلیمات پر عمل کرنے میں تم پر سبقت نہ لے جائیں۔"

انتہائی اہم نکتہ یہ ہے ہم مغربی علمِ نفسیات کے ماہرین کے مد نظر ایمان کا دقّت کے ساتھ مطالعہ کریں اور یہ جانیں کہ اُن کا پسندیدہ کونسا دین، کونسی معنویت، کونسا ایمان، کس طرح کا مومن ہونا و۔۔۔ ہے؟ وہ چیز جو بڑی دقّت کے ساتھ ہم اس میں پاتے ہیں وہ یہ ہے کہ اُن کا مقصود، آیاتِ الٰہی سے بہت مختلف ہے۔

خداوند عالم متعدّد آیات میں ایمانِ واقعی کو آرام و سکون کا ذریعہ اور اسٹریس و اضطراب سے دوری کا باعث قرار دیتا ہے۔ ہم اس بارے میں پڑھتے ہیں:

"وَكَيْفَ أَخَافُ مَا أَشْرَكْتُمْ وَلاَ تَخَافُونَ أَنَّكُمْ أَشْرَكْتُم بِاللهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهِ عَلَيْكُمْ سُلْطَانًا فَأَيُّ الْفَرِيقَيْنِ أَحَقُّ بِالأَمْنِ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ * الَّذِينَ آمَنُواْ وَلَمْ يَلْبِسُواْ إِيمَانَهُم بِظُلْمٍ أُوْلَئِكَ لَهُمُ الأَمْنُ وَهُم مُّهْتَدُونَ" (12)

ترجمہ: "اور میں کس طرح تمہارے خداؤں سے ڈر سکتا ہوں جب کہ تم اس بات سے نہیں ڈرتے ہو کہ تم نے ان کو خدا کا شریک بنادیا ہے جس کے بارے میں خدا کی طرف سے کوئی دلیل نہیں نازل ہوئی ہے تو اب دونوں فریقوں میں کون زیادہ امن و سکون کا حقدار ہے اگر تم جاننے والے ہو تو بتاؤ۔ جو لوگ ایمان لے آئے اور انہوں نے اپنے ایمان کو ظلم سے آلودہ نہیں کیا، ان ہی کے لئے امن و سکون ہے اور وہی ہدایت یافتہ ہیں۔"

یہ وہی مبارک وعدہ ہے کہ جس کے بارے میں خداوند متعال نے کئی بار قرآنِ کریم میں اشارہ فرمایا ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

"أَلاَ إِنَّ أَوْلِيَاء اللهِ لاَ خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلاَ هُمْ يَحْزَنُونَ" (13)

ترجمہ: "آگاہ ہو جاؤ کہ اَولیائے خدا پر نہ خوف طاری ہوتا ہے اور نہ وہ محزون اور رنجیدہ ہوتے ہیں۔"

نیز فرماتا ہے:

"إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ" (14)

ترجمہ: "بیشک جن لوگوں نے اللہ کو اپنا رب کہا اور اسی پر جمے رہے ان کے لئے نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ رنجیدہ ہونے والے ہیں۔"

خداوند عالم نے دوسری آیات میں مومنین کو آرام و سکون اور اضطراب سے دوری کا وعدہ دیا ہے۔ اس آیت میں خداوند متعال فرماتا ہے:

"هُوَ الَّذِي أَنزَلَ السَّكِينَةَ فِي قُلُوبِ الْمُؤْمِنِينَ لِيَزْدَادُوا إِيمَانًا مَّعَ إِيمَانِهِمْ" (15)

ترجمہ: "وہی تو وہ (خدا) ہے جس نے مومنین کے دلوں میں سکون نازل کیا ہے تاکہ ان کے ایمان میں مزید اضافہ ہو جائے۔۔۔"

امام جعفر صادق علیہ السلام اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

''هُوَالْاِيْمانُ'' (16) ''وہ آرام و سکون ایمان ہے۔''

حضرت علی علیہ السلام ایمان کی حقیقت کے بارے میں فرماتے ہیں:

''أَصْلُ الْإِيْمَانِ حُسْنُ التَّسْلِيْمِ لِأَمْرِاللهِ'' (17)

یعنی: ''ایمان کی اصل اور بنیاد (جڑ) فرمان خداوند کے سامنے عمدہ اور اچھا تسلیم ہونا ہے۔''

پیغمبر گرامی اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی ایک حدیث میں ارشاد فرماتے ہیں:

''اَفْضَلُ الْاِيْمَانِ اَنْ تُحِبَّ لِلّٰهِ وَتُبْغِضَ لِلّٰهِ وَتُعْمِلَ لِسَانَكَ فِي ذِكْرِ اللهِ عَزَّوَجَلَّ وَاَنْ تُحِبَّ لِلنَّاسِ مَا تُحِبُّ لِنَفْسِكَ وَتَكْرَهُ لَهُم مَا تَكْرَهُ لِنَفْسِكَ وَاَنْ تَقُوْلَ خَيْراً أَو تَصْمُتَ'' (18)

یعنی: ''افضل ترین ایمان یہ ہے کہ تو خدا کے لئے محبت کرے اور خدا ہی کے لئے دشمنی کرے اور اپنی زبان کو ذکر خداوند میں استعمال کرے اور لوگوں کے لئے وہ چیز پسند کرے جو اپنے نفس کے لئے پسند کرے اور ان کے لئے وہی ناپسند کرے جو اپنے لئے ناپسند کرے اور اچھی بات کرے یا خاموش رہے۔''

جی ہاں! اگر کوئی شخص اسی فکر میں ہو کہ خدا کے لئے دوستی کرے اور اسی کے لئے کسی سے دشمنی کرے، تو پھر غیر اخلاق اجتماعی تعلقات نہیں رکھے گا اور اسی سبب سے وہ معاشرہ میں نفسیاتی دباؤ کا شکار نہیں ہوگا، کیونکہ جس وقت بھی وہ کوئی ایسا کام کرنا چاہے گا کہ جس میں خدا کی رضا شامل نہ ہو اور طبیعتاً مضطرب و بے چین کرنے والا بھی ہو، تو وہ اس کام کو ہرگز نہ کرے گا اور یہی چیز سالم اجتماعی تعلقات کے لئے (بہترین) روکنے والا عامل ہے۔

توجہ طلب نکتہ یہ ہے کہ ایمان نہ صرف اس دنیا میں آرام و آسائش اور اضطراب سے دوری کا باعث بنتا ہے بلکہ روز قیامت بھی انسان کے آرام و سکون کا بہت اہم عامل ہے۔ مومن اور متقی قیامت کے دن اُن تمام حوادث اور مسائل کی نسبت، جو دنیوی مسائل سے ہزاروں گنا وحشت ناک تر اور اسٹریس و اضطراب میں ڈالنے والے ہوں گے، خاص آرام و سکون کا مالک ہوگا اور یہ سب کچھ ایمان کے سائے میں تحقّق پذیر ہوگا۔

قرآن کریم نے متعدّد بار اس مسئلہ کی طرف اشارہ کیا ہے: (19)

''يَا بَنِي آدَمَ إِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنكُمْ يَقُصُّونَ عَلَيْكُمْ آيَاتِي فَمَنِ اتَّقَى وَأَصْلَحَ فَلاَ خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلاَ هُمْ يَحْزَنُونَ * وَالَّذِينَ كَذَّبُواْ بِآيَاتِنَا وَاسْتَكْبَرُواْ عَنْهَا أُوْلَـئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ'' (20)

ترجمہ: ''اے اولاد آدم جب بھی تم ہی میں سے ہمارے پیغمبر تمہارے پاس آئیں اور ہماری آیتیں تم پر پڑھیں، تو جو بھی تقویٰ اختیار کرے گا اور اپنی اصلاح کرلے گا اس کے لئے نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ رنجیدہ ہوگا اور جن لوگوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی اور اکڑ گئے وہ سب جہنمی ہیں اور اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔''

یہ آیات ایمانِ واقعی اور جھوٹی معنویت کے اہم ترین فرق کو آخرت میں آرام و سکون گردانتی ہیں۔ وہی نکتہ کہ جو جھوٹے عرفان اور ایمان کی شناخت کے دقیق اور گہرے مطالعہ کا نیاز مند ہے۔

''بَلَى مَنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهُ أَجْرُهُ عِندَ رَبِّهِ وَلاَ خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلاَ هُمْ يَحْزَنُونَ'' (21)

ترجمہ: ''ہاں جس شخص نے اپنا رخ خدا کی طرف کرلیا اور وہ نیک عمل کرنے والا ہوا تو اس کے لئے پروردگار کے یہاں اجر ہے اور اُن پر نہ تو کوئی خوف ہوگا اور نہ ہی وہ غمگیں ہوں گے۔''

۲۔ نماز

''آرام دہی اور سکون آوری'' نفسیاتی بیماریوں کے علاج کے لئے بعض نفسیاتی معالجین کے نزدیک ایک قابل استفادہ طریقہ کار ہے اور انسان قدرت رکھتا ہے کہ اس چیز کو عملی مشق کے ذریعہ سیکھے۔ دن میں پانچ مرتبہ نماز کا پڑھنا، خود بہترین آرام و سکون آوری کا باعث ہے، کیونکہ نماز خداوند عالم سے ارتباط کا ایک اہم ترین پُل ہے اور یہی چیز انسان کے آرام و سکون اور اضطراب سے دوری کا باعث بنتی ہے۔ نماز اپنے مخصوص آداب کے ساتھ خداوند عالم سے ایک قسم کی مدد چاہنا ہے۔

ہم قرآن کریم میں پڑھتے ہیں:

''وَاسْتَعِينُواْ بِالصَّبْرِ وَالصَّلاَةِ وَإِنَّهَا لَكَبِيرَةٌ إِلاَّ عَلَى الْخَاشِعِينَ'' (22)

ترجمہ: ''صبر اور نماز کے ذریعہ مدد مانگو، نماز بہت مشکل کام ہے مگر ان لوگوں کے لئے جو خشوع و خضوع والے ہیں۔''

خداوندِ بے نظیر کے سامنے خضوع و سر تسلیم خم کرنا، انسان کو مشکلات کے حلّ کرنے میں مختلف پہلوؤں سے مدد دے سکتا ہے:

الف) جب انسان نماز کے لئے کھڑا ہوتا ہے تو وہ کوشش کرتا ہے کہ اس وقت تمام فکروں، یادوں، من جملہ نفسیاتی دباؤ اور سختیوں کو اپنے ذہن سے دور کرے اور فقط خداوند عالم کی طرف متوجہ ہو۔ یہی نفسیاتی دباؤ سے دوری کی کوشش، انسان کے آرام وسکون تک پہنچنے میں موثر ہے۔

ب) اس حالت (نماز) میں انسان اور خداوند عالم کے درمیان جو عاطفی رابطہ برقرار ہوتا ہے، وہ اس کی روح اور نفسیات کو تقویت دیتا ہے اور اس کے آرام وسکون کے احساس کا موجب بنتا ہے۔

ج) نماز اپنے ساتھ جو آداب رکھتی ہے وہ انسان کو آرام وسکون تک پہنچنے کا طریقہ سکھاتے ہیں۔

د) اذکارِ نماز کے معانی کی طرف توجہ بھی انسان کے آرام وسکون کے لئے نہایت موثر ہے۔ "اللہ اکبر" کہنے کے ساتھ انسان خداوند عالم کی عظمت کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور دوسری ہر چیز، من جملہ زندگی کی مشکلات اس کی نظر میں معمولی و حقیر ہو جاتی ہیں۔ "ایّاکَ نَعبُدُ وایّاکَ نَستَعینُ" کی تلاوت کے ساتھ خود کو یہ الہام بخشتا ہے کہ تمام اُمور میں خداوند عالم ہی سے مدد لینی چاہیے۔ (23)

خداوند قرآن کریم کے ایک دوسرے مقام پر فرماتا ہے:

"إِنَّ الَّذِينَ آمَنُواْ وَعَمِلُواْ الصَّالِحَاتِ وَأَقَامُواْ الصَّلاَةَ وَآتَوُاْ الزَّكَاةَ لَهُمْ أَجْرُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ وَلاَ خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلاَ هُمْ يَحْزَنُونَ" (24)

ترجمہ: "جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال انجام دیئے اور نماز قائم کی، زکات ادا کی، ان کے لئے پروردگار کے یہاں اجر ہے اور ان کے لئے کسی طرح کا خوف یا حزن وملال نہیں ہے۔"

اسی طرح ایک حدیث میں حذیفہ سے نقل ہوا ہے کہ:

"كانَ رسولُ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اذا حزبه امرٌ فَزَعَ إلى الصَّلاةِ" (25)

یعنی: "جب بھی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر کوئی کام دشوار ہوتا تو آپؐ نماز بجالاتے تھے۔"

۳۔ خدا کی یاد

انسان کی بنیاد میں ایسے فطری حقائق موجود ہیں کہ ہمیشہ انسان ان تک پہنچنے کے درپے رہتا ہے، اس طرح سے کہ اگر وہ ان تک نہ پہنچے یا ان تک پہنچنے کے راستے میں کوئی مانع یا رکاوٹ آجائے تو اس کی روح کی گہرائی میں بے قراری، اضطراب، نارضایتی اور گرہیں پیدا ہو جاتی ہیں کہ بطور مستقیم ہم اس کے علل واسباب سے آگاہ بھی نہیں ہیں۔ لیکن ان کے آثار خواستہ یا نخواستہ طور پر اس شخص کے اعمال ورفتار میں دیکھے اور محسوس کئے جاسکتے ہیں؛ من

جملہ یہ کہ اگر بشر اپنے محبوب اور معبود سے دور ہو جائے اور اس کے ساتھ ارتباط وانس پیدا نہ کرے، تو وہ مسلسل اضطراب اور ناراحتی میں زندگی گزارے گا اور کوئی دوسری چیز یا واقعہ اس کی جگہ نہیں لے سکتا ہے۔ (26)

خداوند عالم کی یاد سے دوری باعث بنتی ہے کہ انسان پُر اضطراب اور ناراحت کنندہ زندگی کا مالک ہو۔ خداوند اس بارے میں فرماتا ہے:

''وَمَنْ أَعْرَضَ عَن ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنكًا وَنَحْشُرُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَعْمَى'' (27)

ترجمہ: ''اور جو میرے ذکر سے اعراض کرے گا اس کے لئے زندگی کی تنگی بھی ہے اور ہم اسے قیامت کے دن اندھا بھی محشور کریں گے۔''

جاذبِ نظر نکتہ یہ ہے کہ انسان اپنی فطرت کے مطابق چاہتا ہے کہ ایسی ذات کے ساتھ مأنوس ہو جو فنا ناپذیر اور ہمیشہ رہنے والی ہے تاکہ وہ اس کی پشت پناہ اور تکیہ گاہ ہو۔ اس لئے ہر انسان اُس کی تلاش و جستجو میں ہے۔ لیکن اپنی خواہش کو حاصل نہ کرنے، اپنے پروردگار کے حضور شرفیاب نہ ہونے اور اپنے گمشدہ کو نہ پانے کی وجہ سے، اپنی فطری ضرورت اور نیاز کو پورا کرنے کی خاطر خطاء کا شکار ہو کر مادی اور ظاہری چیزوں کے سامنے، جو مجسّم حالت میں ہوتی ہیں، سر تسلیم خم کرتا ہے اور ان میں اپنی حقیقی خواہش اور واقعی گمشدہ کی جستجو وتلاش کرتا ہے اور کیونکہ اس قسم کی چیزیں اس کی واقعی خواہش نہیں ہوتیں اور اس کی اصلی ضرورت و نیاز کو بھی پورا نہیں کرتیں، اس لئے اس کو مطمئن نہیں کرتیں اور نہ ہی اس کو تشویش اور ناراحتی سے نجات دیتی ہیں۔

وہ اس وقت آرام وسکون کا احساس کرتا ہے جب اپنے مطلوب اور بنیادی وواقعی خواہش کہ جو در حقیقت خالق کی شناخت اور اس کی بارگاہ اقدس میں شرفیاب ہونا ہے، تک پہنچ جائے اور اسے اپنے دل کی آنکھوں سے دیکھ لے کہ یہی انسان کی خلقت کا مقصد اور تمام خوبیوں اور فضائل کا منشاء ہے۔ حقیقت میں اگر انسان خدا سے غافل ہو جائے اور اس کے حضور شرفیاب نہ ہو تو یہ تنگ و تاریک اور بے اعتبار دنیا اس کی نظر میں بے مقصد اور بُد ملال ہو جائے گی۔ اس صورت میں یقینی طور پر زندگی کے حقیر ہونے کا احساس اور اس کے نتیجہ میں نفسیاتی دباؤ، اضطراب اور غیر متعادل فکری و عملی حالت، انسان کے جسم کو بھی تحت تاثیر قرار دے کر، اس کو رنج و غم اور بیماری میں مبتلاء کر دے گی۔ (28) اس لئے خداوند عالم اس مشہور و معروف آیت میں فقط نام و ذکر خدا کو ہی دلوں کے آرام وسکون دینے والا قرار دیتا ہے، جیسا کہ فرماتا ہے:

''الَّذِينَ آمَنُوا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوبُهُم بِذِكْرِ اللَّهِ أَلَا بِذِكْرِ اللَّهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ'' (29)

ترجمہ: ''وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے ہیں اور ان کے دلوں کو یاد خدا سے اطمینان حاصل ہوتا ہے اور آگاہ ہو جاؤ کہ دلوں کو یاد خدا ہی سے اطمینان حاصل ہوتا ہے۔''

بنیادی طور پر مومن انسان ذکر خدا کے وقت یہ احساس کرتا ہے کہ وہ خداوند عالم سے قریب ہے اور اس کی حمایت و سرپرستی میں ہے اور یہی چیز اس میں اعتماد بالنفس، قدرت، اَمن واَمان، آرام و سکون اور خوش بختی کے وادار ہونے کا موجب بنتی ہے۔ اس لئے وہ اپنے تمام وجود کے ساتھ اس آیت شریفہ پر اعتقاد رکھتا ہے کہ:

''فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ'' (30)

ترجمہ: ''پس تم مجھے یاد کرو تاکہ میں تمہیں یاد کروں گا۔''

لہٰذا حضرت علی علیہ السلام سے ایک حدیث میں وارد ہوا ہے کہ ذکر اور یاد خدا محبت کا باعث بنتی ہے اور جیسا کہ ہم نے بیان کیا کہ یہ محبت و دوستی اُمید، اَمنیت کے احساس اور زیادہ آرام و سکون کا باعث بنتی ہے۔

''مُداوَمَةُ الذِّكرِ خُلصانُ الأَولِياءِ'' (31)

یعنی: ''ذکر (خدا) پر مداومت و ہمیشگی، اولیاء کی صمیمی محبت و دوستی کا باعث ہے۔''

ایک اور بڑی اُمید بخش حدیث میں، خداوند عالم نے اپنے بندوں سے اور وہ جو اس کو یاد کرتے ہیں، فرمایا ہے:

''أنا جَلِيسُ مَن ذَكَرَنِي'' (32)

ترجمہ: ''میں اُس کا ہمنشین ہوں جو مجھے یاد کرے۔''

دوسری طرف انسان ہمیشہ تمام اُمور میں موفقیت اور کامیابی کی تلاش میں ہے اور یہ مقصد روایات میں یاد اور نام خدا کے ثمرات سے شمار کیا گیا ہے:

''ذاكِرُ اللهِ مِنَ الفائِزِينَ'' (33)

ترجمہ: ''خدا کا ذکر (یاد) کرنے والا کامیاب لوگوں میں سے ہے۔''

اسی طرح امام جعفر صادق علیہ السلام سے ایک خوبصورت حدیث میں آیا ہے کہ خدا کو یاد کرنے والا اپنی زندگی میں مضطرب کرنے والے عوامل سے دور ہوتا ہے اور اسٹریس پیدا کرنے والے اُمور، جیسے حوادث روزگار اس کے دامن گیر نہیں ہوتے ہیں۔

''يَمُوتُ الْمُؤْمِنُ بِكُلِّ مِيتَةٍ يَمُوتُ غَرَقاً وَيَمُوتُ بِالْهَدْمِ وَيُبْتَلَى بِالسَّبُعِ وَيَمُوتُ بِالصَّاعِقَةِ وَلَا تُصِيبُ ذَاكِراً لِلّٰهِ عَزَّوَجَلَّ'' (34)

یعنی: ''مومن ہر قسم کی موت مرتا ہے، غرق ہوتا ہے، ملبہ تلے دبتا ہے، درندوں کا لقمہ بنتا ہے، آسمانی بجلی کی زد میں آتا ہے، لیکن خدا کو یاد کرنے والا ان مصیبتوں سے دُوچار نہیں ہوتا۔''

۴۔ توکّل

تمام انسان ہمیشہ اس چیز کے درپے ہوتے ہیں کہ اپنے معاملات میں عمدہ طریقہ سے پیشرفت کریں اور ہمیشہ اپنے کاموں میں کامیاب و کامران ہوں۔ اس لئے اپنی موفقیت اور کامیابی کے لئے ہر کام کر گزرتے ہیں اور جو بھی ان کی موفقیت میں موثر واقع ہو سکتا ہے اس سے مدد طلب کرتے ہیں۔ مضطرب لوگ بھی اسی قسم کے ہوتے ہیں، اس طرح کے لوگ جب کسی مشکل سے دُچار ہوتے ہیں، تو اس کو دور اور حل کرنے اور آرام و سکون کے حصول کے لئے ہر کسی سے رجوع کرتے ہیں اور اس سے مدد لیتے ہیں۔

اب ممکن ہے کہ اس کی نظر میں سب سے بڑا شخص ایک مدیر، ایک ماہر علم نفسیات، ایک سرمایہ دار، ایک وکیل، ایک صدرِ مملکت و۔۔۔ ہو؛ لیکن فرض کریں ایک شخص نے اپنے تمام اُمور کسی ایسے کے سپرد کئے ہوں جو ہر کام سے عہدہ برا ہو سکتا ہے اور اس کام کو بغیر کسی خرچ و اخراجات کے سرانجام دے سکتا ہے اور وہ کوئی اور نہیں سوائے ذات خالق متعال کے، جو تمام اُمور سے بخوبی واقف و آگاہ ہے۔

توکّل اور اپنے اُمور کا خداوند عالم کے سپرد کرنا، اس بات کا باعث بنتا ہے کہ انسان آسودہ خیالی کے ساتھ اپنے زندگی کے معاملات کو انجام دے اور اس کے لئے جو حوادث و نتائج پیش آئیں ان کی طرف سے مطمئن رہے۔ اب وہ نتائج ممکن ہے ظاہر میں اس کے لئے اچھے ہوں یا اچھے نہ ہوں، لیکن یہ اعتماد و توکّل انسان کو خاص آرام و سکون دیتا ہے۔

خداوند عالم اس بارے میں فرماتا ہے:

''الَّذِينَ اسْتَجَابُواْ لِلّهِ وَالرَّسُولِ مِن بَعْدِ مَآ أَصَابَهُمُ الْقَرْحُ۔۔۔ * الَّذِينَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ إِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُواْ لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ إِيمَاناً وَقَالُواْ حَسْبُنَا اللّهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ * ۔۔۔ *إِنَّمَا ذَلِكُمُ الشَّيْطَانُ يُخَوِّفُ أَوْلِيَاءهُ فَلاَ تَخَافُوهُمْ وَخَافُونِ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ'' (35)

ترجمہ: ''یہ (صاحبانِ ایمان) ہیں جنہوں نے (جنگِ اُحد میں) زخمی ہونے کے بعد بھی خدا اور رسولؐ کی دعوت پر لبیک کہا، ان نیک کردار اور متقی افراد کے لئے نہایت درجہ اَجر عظیم ہے۔ یہ وہ ایمان والے ہیں کہ جب ان سے بعض لوگوں نے کہا کہ لوگوں نے تمہارے لئے عظیم لشکر جمع

کرلیا ہے، لہٰذا اُن سے ڈرو، تو ان کے ایمان میں اور اضافہ ہوگیا اور انہوں نے کہا کہ ہمارے لئے خدا کافی ہے اور وہی ہمارا ذمہ دار ہے۔۔۔۔ یہ شیطان ہے جو صرف اپنے چاہنے والوں کو ڈراتا ہے، لہٰذا تم ان سے نہ ڈرو اور اگر مومن ہو تو مجھ سے ڈرو۔"

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ زندگی کے مسائل سے نبرد آزما ہونے اور موفقیت و کامیابی تک پہنچنے کے لئے ہمیں دو قسم کے عوامل کی ضرورت پڑتی ہے: الف: طبیعی اسباب کا فراہم اور مہیا ہونا؛ ب: خاص نفسیاتی شرائط۔ تاکہ ہم بہتر طریقہ سے مسائل کے ساتھ روبرو ہو سکیں۔ توکّل ان نفسیاتی شرائط کے مہیا ہونے کا باعث بنتا ہے۔ کبھی ارادے کی سستی، خوف، غم، اضطراب اور اوضاع و احوال پر مکمل احاطہ نہ ہونا، باعث بنتا ہے کہ ہم اپنی مطلوبہ شکل میں ممکنہ راہِ حل سے استفادہ نہ کر سکیں۔ توکّل ارادہ کی تقویت اور نفسیات میں خلل ڈالنے والے عوامل کے غیر موثر ہونے کا باعث بنتا ہے۔

اس طرح کے عقیدہ کے ساتھ اگر کوئی انسان کامیابی سے ہمکنار ہو اور اپنے ہدف و مقصد کو پالے، تو نفسیاتی اعتبار سے متعادل حالت تک پہنچ جائے گا اور اگر وہ شکست سے دُچار ہو جائے تو کیونکہ معتقد ہے کہ خداوند عالم انسانوں کی موفقیت و کامیابی کے اسباب فراہم کرنے پر بھی قادر ہے اور ان کی مصلحتوں کو بھی خود اُن سے بہتر جانتا ہے، لہٰذا قبول کرتا ہے کہ یہ ظاہری شکست خود اس کی بہتری اور فائدے میں تھی، اس لئے نتیجتاً نفسیاتی لحاظ سے کوئی ضرر و نقصان نہ ہوگا۔ بنابرایں، توکّل انسان کو زندگی کے مسائل حل کرنے اور متعادل و سازگار زندگی تک پہنچنے کی راہ میں سعی و کوشش کرنے میں مضبوط و قوی تر بنادے گا۔ وہ کبھی بھی زندگی کے پیچ و خم میں خود کو متوقف نہیں دیکھے گا؛ کیونکہ مادی و ظاہری اسباب کے ماوراء دوسری علتوں کا معتقد ہے۔

توکّل کے موثر ہونے کا طریقہ کار اس طرح سے ہے اگر انسان اُس حالت میں فقط مادّی و ظاہری اسباب کی طرف توجہ کرے، تو بڑی آسانی سے عمل سے ہاتھ کھینچ لیتا ہے اور نااُمیدی و مایوسی اُسے برباد کردیتی ہے؛ لیکن جو انسان خدا پر توکّل رکھتا ہے اور معتقد ہے کہ مادّی و ظاہری شرائط کا نہ ہونا کسی واقعہ کے متحقق نہ ہونے یا مشکل کے حل نہ ہونے کا موجب نہیں ہوتا؛ جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں اسی طرح سے تھا۔ کتنے ہی مواقع پر ایک چھوٹے سے مختصر گروہ نے ایک بڑے عظیم اور قدرتمند گروہ کے ساتھ مقاومت و استقامت کی اور کامیاب ہوا ہے۔ وہ جن اسباب پر توکّل کرتے تھے، نااُمید نہ ہوئے اور اپنی

تکالیف ادا کرنے سے کوتاہی نہ برتی۔ ایسے لوگ آئندہ کی فکر نہیں کرتے؛ کیونکہ ہر صورت میں اپنے وظیفہ پر عمل کرتے ہیں، بنابرایں ان کی نفسیاتی و جسمانی کمزوری وضعف بہت کم ہوگا۔ (36)

قرآن کریم نے ہر دو گروہ کے لئے، وہ جو کہ توکّل کا عقیدہ نہیں رکھتے اور ان کے مقابلہ میں، خداوند پر توکّل کرنے والے کہ جو نفسیاتی آرام و سکون کی حد کو پہنچے ہوئے ہیں، مثالیں ذکر کی ہیں۔ پہلا گروہ سرزمین فلسطین میں قوم بنی اسرائیل کا ہے جنہوں نے خداوند پر توکّل نہ کیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نصیحتوں پر کان نہ دھرا اور نااُمید ہوگئے اور خداوند عالم نے اُن کی مدد نہ کی اور وہ چالیس سال سرگرداں رہے۔ خداوند اس بارے میں فرماتا ہے۔ (37)

اس کے مقابلہ میں طالوت کی قوم اور ان کا جالوت کے لشکر سے جنگ کرنا اور جالوت کو شکست دینا ہے، کہ ان سب سختیوں کا تحمل کرنا، اضطراب کے لمحات سے گزرنا اور کامیابی سے ہمکنار ہونا، خداوند پر توکّل ہی کے سائے میں تھا۔ (38)

اسی طرح اگر کوئی شخص یہ اعتقاد رکھتا ہو کہ "اگر خدا کسی کی بھلائی چاہتا ہے تو کوئی دوسرا یہ قدرت وطاقت نہیں رکھتا کہ انسان سے اس بھلائی کو چھین لے اور انسان تک اس بھلائی کے پہنچنے سے مانع بن جائے، نیز اسی طرح اگر خداوند یہ چاہے کہ گناہوں اور انسان کی اُس سے دوری کی وجہ سے، کسی کو ضرر و زیان پہنچائے تو کوئی اس زیان کو روکنے کی طاقت نہیں رکھتا"، تو ایسا شخص سختیوں اور مشکلات سے دُچار ہوتے وقت اضطراب کا شکار نہیں ہوتا اور نیز دنیا کی مادیّات تک پہنچنے کی نسبت خود کو نگرانی و پریشانی میں مبتلا نہیں کرتا۔

خداوند عالم قرآنِ کریم میں صراحت کے ساتھ اس نکتہ کی تصریح فرماتا ہے:

"وَلاَ تَدْعُ مِن دُونِ اللّهِ مَا لاَ يَنفَعُكَ وَلاَ يَضُرُّكَ فَإِن فَعَلْتَ فَإِنَّكَ إِذًا مِّنَ الظَّالِمِينَ * وَإِن يَمْسَسْكَ اللّهُ بِضُرٍّ فَلاَ كَاشِفَ لَهُ إِلاَّ هُوَ وَإِن يُرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلاَ رَآدَّ لِفَضْلِهِ يُصِيبُ بِهِ مَن يَشَاء مِنْ عِبَادِهِ وَهُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ" (39)

ترجمہ: "اور خدا کے علاوہ کسی ایسے کو آواز نہ دو جو نہ فائدہ پہنچا سکتا ہے اور نہ نقصان؛ اگر تم ایسا کرو گے تو تمہارا شمار بھی ظالمین میں ہوگا اور اگر خدا تمہیں نقصان پہنچانا چاہے، تو اس کے علاوہ کوئی بچانے والا نہیں اور اگر وہ تمہاری بھلائی کا ارادہ کرلے تو اس کے فضل کو کوئی روکنے والا نہیں ہے، وہ جس کو چاہتا ہے اپنے بندوں میں سے بھلائی عطا کرتا ہے وہ بڑا بخشنے والا اور مہربان ہے۔"

اور دوسری آیت میں فرماتا ہے:

''إِن يَنصُرْكُمُ اللهُ فَلاَ غَالِبَ لَكُمْ وَإِن يَخْذُلْكُمْ فَمَن ذَا الَّذِي يَنصُرُكُم مِّن بَعْدِهِ وَعَلَى اللهِ فَلْيَتَوَكِّلِ الْمُؤْمِنُونَ'' (40)

ترجمہ: ''اگر خداوند تمہاری مدد کرے تو کوئی تم پر غالب نہیں آسکتا اور اگر وہ تمہیں چھوڑ دے تو اس کے بعد کون تمہاری مدد کرے گا اور صاحبانِ ایمان کو تو خدا ہی پر بھروسہ کرنا چاہیے۔''

اس بارے میں روایات بھی موجود ہیں جن کی طرف ہم اشارہ کرتے ہیں۔ امام علی علیہ السلام اپنی ایک حدیث میں توکّل کو نفسیاتی دباؤ، برائیوں اور مشکلات کے دور ہونے کا موجب سمجھتے ہوئے فرماتے ہیں:

''اَلتَّوَكُّلُ عَلَى اللهِ نَجَاةٌ مِنْ كُلِّ سُوءٍ وَحِرْزٌ مِنْ كُلِّ عَدُوٍّ'' (41)

ترجمہ: ''خداوند عالم پر توکّل اور بھروسہ کرنا، ہر برائی سے نجات اور ہر دشمن سے محفوظ رہنے کا باعث ہے۔''

پیغمبر گرامی اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی ایک خوبصورت حدیث میں قوت و قدرت کو توکّل کا نتیجہ سمجھتے ہیں، اب ممکن ہے یہ قوت و قدرت زندگی کے تمام اُمور میں ہو۔ قوت و قدرت سے مراد ممکن ہے کہ یہ ہو کہ ایسا شخص مشکلات اور سختیوں کے مقابلہ میں اسٹریس (اضطراب) سے دُچار نہیں ہوتا اور قوت و قدرت کے ساتھ اُن سے مقابلہ کرتا ہے۔

''مَنْ أَحَبَّ أَنْ يَكُونَ أَقْوَى النَّاسِ فَلْيَتَوَكَّلْ عَلَى اللهِ تعالى'' (42)

''جو شخص یہ پسند کرتا ہے کہ لوگوں میں قوی و طاقتور ترین ہو، اُسے چاہیے کہ خدا پر توکّل کرے۔''

اور ایک واضح تر حدیث میں امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

''مَن تَوَكَّلَ عَلى اللهِ ذَلَّتْ لَهُ الصِّعابُ وَتَسَهَّلَتْ عَلَيهِ الْأَسْبابُ'' (43)

یعنی: ''جس شخص نے خدا پر توکّل کیا اس کے لئے دشواریاں حقیر و معمولی اور اسباب سہل و آسان ہوگئے۔''

ایک اور حدیث میں بات کو تمام کرتے ہوئے توکّل کرنے والے شخص کو (ہر قسم کے) اضطراب، سختی اور اسٹریس سے دور قرار دیتے ہوئے، آپؑ فرماتے ہیں: ''لَيْسَ لِمُتَوَكِّلٍ عَناءٌ'' (44)

یعنی: ''کسی بھی توکّل کرنے والے کے لئے کوئی رنج و غم نہیں ہے۔''

لیکن حضرت علی علیہ السلام ایک دوسری روایت میں اس سے بھی بڑھ کر فرماتے ہیں:

''اَلاِتِّكالُ عَلَى القَضاءِ اَروَحُ'' (45)

یعنی: ''قضا و قدر (خداوند) پر توکّل و بھروسہ کرنا کس قدر راحت و سکون دینے والا ہے۔''

ایک دوسری حدیث میں اس اَمر کی تاکید کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''مَنْ وَثِقَ بِاللهِ أَرَاهُ السُّرُورَ وَمَنْ تَوَكَّلَ عَلَيْهِ كَفَاهُ الْأُمُورَ'' (46)

یعنی: ''جو بھی خدا پر اعتماد کرتا ہے خداوند اُسے خوشیاں دیکھاتا ہے اور جو اُس پر بھروسہ کرتا ہے خداوند اس کے کاموں کو پورا کر دیتا ہے۔''

۵۔ رزاقیت خداوند پر ایمان

آئندہ کا خوف اور ''روزی'' کے فراہم ہونے کی کیفیت، ایک عام پریشانی ہے۔ روزی انسان کی بنیادی ضروریات میں سے ایک ہے اور اس لحاظ سے، معمولاً یہ پریشانی پائی جاتی ہے کہ آئندہ کیا ہوگا؟ آیا کل روزی کا انتظام ہو جائے گا؟ ۔ ۔ ۔ اس حالت میں، آئندہ، تاریک اور مبہم نظر آتا ہے اور اسی کے ساتھ دوسری مشکلات، من جملہ اسٹریس اور اضطراب اور نتیجتاً خدا سے نااُمیدی اور کل کی فکر و پریشانی جنم لیتی ہیں۔

خوف اور پریشانی اگر ایک حد تک ہوں اور متعارف و رائج حد سے تجاوز نہ کریں تو یہ چیز کسبِ رزق کے لئے حرکت دینے والا عامل ہے۔ لاپرواہ انسان، کسب رزق کے لئے تلاش و کوشش نہیں کرے گا اور یہی چیز اس کی زندگی میں بہت سی مشکلات کے ظاہر ہونے کا موجب بنے گی۔ پس کسی حد تک پریشانی (اور روزی کی فکر کرنا) مفید ہے؛ لیکن اگر یہ پریشانی حد سے بڑھ جائے اور معمول کی حد سے تجاوز کر جائے، تو نفسیاتی دباؤ کے بڑھ جانے کا موجب بنتی ہے اور زندگی کو خطرے میں ڈال دیتی ہے۔ (47)

امام علی علیہ السلام لوگوں کے ہلاک کرنے والے عوامل میں سے ایک عامل فقر و تنگدستی کا خوف قرار دیتے ہیں۔

''أَهْلَكَ النَّاسَ اثْنَانِ: خَوْفُ الْفَقْرِ وَطَلَبُ الْفَخْرِ'' (48)

یعنی ''لوگوں کو دو چیزوں نے ہلاک کر دیا ہے: فقر و تنگدستی کا خوف اور فخر و برتری کا چاہنا۔''

بخل اور کنجوسی کرنا، اس خوف کے نتائج میں سے ایک ہے۔ انسان، یہ خیال کرتا ہے کہ اگر اپنے مال کو بخش دے گا تو فقیر ہو جائے گا اور یہی پریشانی، بخل و کنجوسی کا موجب بنتی ہے، وہ اس سے غافل ہوتا ہے کہ وہ اپنے اس عمل سے فقر کی طرف جلدی کر رہا ہوتا ہے؛ کیونکہ بخیل شخص، کبھی فقیر ہونے کے خوف سے، اپنے مال و ثروت سے فقیر افراد کی حد تک ہی استفادہ کرتا ہے! یہ وہی فقر و تنگدستی کی طرف جلدی کرنا ہے، یعنی تنگدستی باوجود مال و ثروت کے۔

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں: "مَن قَبضَ یَدَهُ مَخافَةَ الْفَقْرِ فَقَد تَعْجَلُ الْفَقْرَ" (49)

یعنی: "جو شخص فقر کے خوف سے اپنا ہاتھ بند کر لے، تو اس نے فقر کی طرف جلدی کی ہے۔"

آئندہ کی روزی کا خوف، مال کے نہ ہونے یا کم ہونے کی وجہ سے نہیں ہے، قرآن کریم فرماتا ہے:

"قُل لَّوْ أَنتُمْ تَمْلِكُونَ خَزَآئِنَ رَحْمَةِ رَبِّي إِذًا لَّأَمْسَكْتُمْ خَشْيَةَ الإِنفَاقِ وَكَانَ الإِنسَانُ قَتُورًا" (50)

ترجمہ: "آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کہہ دیجئے کہ اگر تم لوگ میرے پروردگار کے خزانوں کے مالک ہوتے تو خرچ ہو جانے کے خوف سے سب روک لیتے اور انسان تو تنگ دل ہی واقع ہوا ہے۔"

معلوم ہوتا ہے کہ اس خوف کی بنیاد کو بیرونی عامل میں نہیں تلاش کرنا چاہیے؛ بلکہ یہ ایک ایسی نفسیاتی کیفیت اور حالت ہے کہ جس کی بنیاد معرفت و شناخت پر استوار ہے۔ بخل کرنے سے بڑھ کر، بیٹیوں کے زندہ در گور کرنے کی رسم بھی روزی کے خوف کی بنیاد پر رہی ہے۔ خداوند متعال فرماتا ہے:

"وَلاَ تَقْتُلُواْ أَوْلادَكُمْ خَشْيَةَ إِمْلاقٍ نَّحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَإِيَّاكُم إنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْءًا كَبِيرًا" (51)

ترجمہ: "اور اپنی اولاد کو فقر و فاقہ کے خوف سے قتل نہ کرو کہ ہم انہیں بھی رزق دیتے ہیں اور تمہیں بھی رزق دیتے ہیں بے شک اولاد کا قتل کرنا بہت بڑا گناہ ہے۔"

جاہلی ثقافت اور رسم و رواج میں، بیٹیوں کو زندہ در گور کر دیتے تھے؛ کیونکہ انہیں روزی مَصرف کرنے والے خیال کرتے تھے اور یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ یہ چیز فقر و تنگدستی کا سبب بنتی ہے! اسی وجہ سے، جب بھی انہیں بیٹی ہونے کی خوشخبری دی جاتی، تو ان کے چہرے بگڑ جاتے اور وہ بہت زیادہ ناراحت ہوتے تھے۔ کبھی فقر و تنگدستی کا خوف، اس قدر زیادہ ہو جاتا ہے کہ انسان بچہ دار ہونے سے بھی ناراحت و پریشان ہو جاتا ہے اور یہ ایک شخص کے اضطراب کی انتہاء ہے۔ اسی وجہ سے ہے کہ فقر و تنگدستی سے ڈرانا، شیطان کی چالوں میں سے ایک چال ہے۔

"الشَّيْطَانُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ" (52)

ترجمہ: "شیطان تمہیں فقر و تنگدستی سے ڈراتا ہے۔"

اس کے باوجود کہ انسان کی روزی فراہم کی گئی ہے۔ خداوند متعال نے ضمانت دی ہے کہ انسان کی روزی ہر حالت میں فراہم کرے گا۔ روزی فراہم کرنے والا، وہی ہے جو ان کی خلقت کا مالک ہے اور روزی کی ضمانت دینے والا، وہ ہے کہ جو صاحب قدرت اور شکست ناپذیر ہے اور یہی اعتقاد، خدا پر ایمان اور خدا پرستی ہے کہ جو انسان سے فقر کا خوف اور آئندہ کی پریشانی دور کرتے ہیں۔ قرآن کریم فرماتا ہے:

"إِنَّ اللهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِينُ" (53)

ترجمہ: "بیشک رزق دینے والا، صاحبِ قوت اور زبردست صرف اللہ ہے۔"

جب انسان یہ جان لے کہ اس کی روزی صاحب قدرت (پروردگار) کے ہاتھ میں ہے، تو اطمینان اور آرام و سکون کا احساس کرتا ہے۔ روئے زمین پر کوئی رینگنے والی مخلوق نہیں ہے مگر یہ کہ اس کی روزی خدا کے ذمہ ہے۔ بلکہ وہ رینگنے والی مخلوق جو اپنی روزی حاصل کرنے کی طاقت نہیں رکھتی، خداوندان کو بھی روزی دیتا ہے۔ خداوند فرماتا ہے:

"وَمَا مِن دَآبَّةٍ فِي الأَرْضِ إِلاَّ عَلَى اللهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا كُلٌّ فِي كِتَابٍ مُّبِينٍ" (54)

ترجمہ: "اور زمین پر چلنے والی کوئی مخلوق ایسی نہیں ہے جس کا رزق خدا کے ذمہ نہ ہو۔ وہ ہر ایک کے سونپے جانے کی جگہ اور اس کے قرار کی منزل کو جانتا ہے اور سب کچھ کتاب مبین میں محفوظ ہے۔"

انسان کی روزی بھی وہی خدا فراہم کرتا ہے جو ہر جاندار (مخلوق) کو روزی دے رہا ہے۔ قرآن کریم فرماتا ہے:

"وَكَأَيِّن مِن دَآبَّةٍ لاَ تَحْمِلُ رِزْقَهَا اللهُ يَرْزُقُهَا وَإِيَّاكُمْ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ" (55)

ترجمہ: "اور زمین پر چلنے والے بہت سے ایسے بھی ہیں جو اپنی روزی کا بوجھ نہیں اُٹھا سکتے ہیں لیکن خدا انہیں اور تمہیں سب کو رزق دے رہا ہے وہ سب کی سننے والا اور سب کے حالات کا جاننے والا ہے۔"

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اُنْظُرُوا إِلَى النَّمْلَةِ فِي صِغَرِ جُثَّتِهَا وَلِطَافَةِ هَيْئَتِهَا لاَ تَكَادُ تُنَالُ بِلَحْظِ الْبَصَرِ (النظر) ۔۔۔ مَكْفُولٌ بِرِزْقِهَا مَرْزُوقَةٌ بِوَفْقِهَا لاَ يُغْفِلُهَا الْمَنَّانُ وَلاَ يَحْرِمُهَا الدَّيَّانُ وَلَوْ فِي الصَّفَا الْيَابِسِ وَالْحَجَرِ الْجَامِسِ" (56)

یعنی: "ذرا اس چیونٹی کے چھوٹے سے جسم اور اس کی لطیف ہیئت کی طرف نظر تو کرو جس کا گوشۂ چشم سے دیکھنا بھی مشکل ہے۔۔۔ اس کے رزق کی کفالت کی جاچکی ہے اور اسی کے مطابق اسے برابر رزق مل رہا ہے، نہ احسان کرنے والا خدا اسے نظر انداز کرتا ہے اور نہ صاحب جزا و عطا اسے محروم رکھتا ہے، چاہے وہ خشک پتھر کے اندر ہو یا جمے ہوئے سنگ خارا کے اندر۔"

پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ابن مسعودؓ سے فرماتے ہیں:

"يَابْنَ مَسعُودٍ! لاَ تَهتَمَّ لِلرِّزْقِ فَإِنَّ اللهَ تَعالى يَقولُ: "وَمَا مِن دَآبَّةٍ فِي الأَرْضِ إِلاَّ عَلَى اللهِ رِزْقُهَا" وقالَ: "وَفِي السَّمَاءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوعَدُونَ" (57) و (58)

یعنی: ''اے ابن مسعودؓ! روزی کے لئے غمگیں نہ ہو جاؤ؛ کیونکہ خداوند متعال فرماتا ہے: ''اور زمین پر چلنے والی کوئی مخلوق ایسی نہیں ہے جس کا رزق خدا کے ذمہ نہ ہو'' اور فرماتا ہے: ''اور تمہارا رزق اور جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے سب کچھ آسمان میں موجود ہے۔''

انسان کی خود اپنی حالت بھی تعجب آور ہے۔ ہم اس وقت اپنی روزی کی فکر میں ہیں درحالانکہ اس سے پہلے تین مرحلے تھے (رحم مادر، شیر خوارگی کا زمانہ اور اس کے بعد کا زمانہ)، لیکن خداوند عالم نے کسی اطلاع کے بغیر ہماری (مناسب) روزی ہمیں پہنچائی ہے، اس لئے سزاوار و مناسب نہیں ہے کہ اس وقت بھی خداوند عالم کی نسبت کوئی بدگمانی رکھیں۔ لیکن یہی انسان جب بڑا اور عاقل ہو جاتا ہے اور اپنے لئے کام کرتا ہے تو اوضاع واحوال اس پر سخت ہو جاتے ہیں اور خدا کی نسبت بدگمانی کرنے لگتا ہے اور وہ مالی حقوق اور واجبات، جو اس کے ذمہ عائد ہوتے ہیں، ان کا انکار کرنے سے لگتا ہے اور خود اپنے اُوپر اور اپنے اہل خانہ پر سخت گیری کرتا ہے۔ یہ سب روزی کے تنگ ہو جانے کے خوف اور خداوند متعال کی نسبت بدگمانی کی وجہ سے ہے۔ (59) پیغمبر اکرم ﷺ خالد کے دو بیٹوں سے فرماتے ہیں:

''لَا تَأْيَسا مِنَ الرِّزقِ ما تَهَزهَزَت رُؤُوسُكُما فَإِنَّ الْإِنْسانَ تَلِدُهُ أُمُّهُ أَحمَرَ لَيسَ عَلَيهِ قِشرَةٌ ثُمَّ يَرْزُقُهُ اللهُ عَزَّوَجَلَّ'' (60)

یعنی: ''جب تک تمہارے سر حرکت کر رہے ہیں، روزی سے نااُمید نہ ہو جاؤ؛ کیونکہ انسان کو اس کی ماں سرخ اور کھال کے بغیر پیدا کرتی ہے، پھر خداوند عزّوجلّ اس کو روزی دیتا ہے۔''

اگر خدا روزی دینے والا ہے، تو خداوند کی نسبت بدگمانی اور آئندہ کی روزی کی نسبت مایوسی و نااُمیدی اور اس کے نتیجہ میں دنیا کے حصول اور اس کی حرص میں زیادہ روزی کی تلاش میں سرگردانی بے مقصد ہے۔ کیونکہ اس صورت میں جو وہ چاہتا ہے اس تک بھی نہ پہنچے گا اور یہ چیز اضطراب اور نفسیاتی دباؤ کا باعث بنے گی۔ جب انسان کسی بھی چیز سے آگاہ نہیں تھا، اس کی روزی فراہم ہوئی اور اس کی زندگی گزر گئی، اس کی آج کی زندگی بھی اسی قاعدہ کے مطابق ہے۔ واقعیت اور حقیقت حال بدلی نہیں ہے۔ پس وہ چیز جو پریشانی کا باعث بنتی ہے ہماری فکر ہے اور ہماری فکر کا اشتباہ یہ ہے کہ روزی کی واقعیت کو نہیں پہچانتے اور اس پر ہمارا یقین نہیں ہے اور روزی کی واقعیت اور حقیقت سوائے خداوند عالم پر اطمینان کے کوئی اور چیز نہیں ہے؛ کیونکہ یہ ایک اصل ہے کہ انسان کی روزی کو خداوند نے معین کر دیا ہے اور کوئی اس میں رکاوٹ بننے کی طاقت نہیں رکھتا۔

پیغمبر اکرم ﷺ اس بیان شدہ حقیقت کے بارے میں اس طرح اطمینان دلاتے ہیں:

"لَو أَنَّ جَمِيعَ الْخَلائِقِ اجْتَمَعُوا عَلَى أَنْ يَصْرِفُوا عَنْكَ شَيْئاً قَد قُدِّرَ لَكَ لَمْ يَسْتَطِيعُوا وَلَو أَنَّ جَمِيعَ الْخَلائِقِ اجْتَمَعُوا عَلَى أَنْ يَصْرِفُوا إِلَيْكَ شَيْئاً لَمْ يُقَدَّرْ لَكَ لَم يَسْتَطِيعُوا" (61)

یعنی: "اگر تمام مخلوقات جمع ہو جائیں کہ تجھ سے اس چیز کو، جو تیرے لئے مقدّر ہو چکی ہے، پھیر دیں تو اس کی قدرت نہیں رکھتے اور اگر تمام مخلوقات جمع ہو جائیں کہ تجھے اس چیز کو دے دیں، جو تیرے لئے مقدّر نہیں ہوئی، تو وہ اس کی بھی قدرت نہیں رکھتے۔"

یہ روزی کے نظام کی واقعیت ہے۔ اگر اس واقعیت و حقیقت پر یقین رکھتے ہوں گے تو راحت و سکون کے ساتھ زندگی گزاریں گے۔ اگر ہم جان لیں کہ ہماری روزی معین ہو چکی ہے اور کوئی بھی اسے کم نہیں کر سکتا اور کوئی طاقت اس میں رکاوٹ نہیں بن سکتی، تو اُس وقت راحت کا احساس کریں گے اور اپنی زندگی سے لذّت اُٹھا سکیں گے اور یہ وہی اضطراب، اسٹریس اور نفسیاتی دباؤ سے خالی زندگی ہے کہ جس کی ہم تلاش میں ہیں۔

دوسرا نکتہ جس کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے یہ ہے کہ انسان اپنے لئے طولانی عمر کو نظر میں رکھتا ہے اور پھر اس بارے میں سوچتا ہے کہ کس طرح (تمام عمر) کی روزی کو فراہم کرے۔ اس کی غلط فہمی یہ ہے کہ خیال کرتا ہے اس کی تمام عمر کی روزی اسی وقت موجود ہونی چاہیے، تاکہ راحت و سکون سے زندگی گزارے، نہیں تو آئندہ کی فکر اس کے دامن گیر رہے گی۔ وہ یہ سوچتا ہے کہ روزی کا فراہم ہونا، یعنی تمام عمر کی روزی کا حال حاضر میں اسی وقت موجود ہونا ہے! درحالانکہ انسان کی روزی کے فراہم ہونے سے مراد، تمام روزی کا اسی وقت موجود ہونا نہیں ہے۔ روزی کے قوانین میں سے ایک قانون یہ ہے کہ روزی "روز بہ روز" پہنچتی ہے۔

حوالہ جات

1۔ نجاتی، محمد عثمان، قرآن و روانشاسی، ترجمہ: عباس عرب، مشہد، بنیاد پژوہش ہای اسلامی آستان قدس رضوی، ۱۳۷۶ شمسی، ص ۱۰-۵۸

2۔ حسن مصطفوی، التحقیق فی کلمات قرآن الکریم، وزارتِ ارشاد اسلامی، ۱۳۶۵ شمسی، ج ۷، ص ۲۳، مادہ "ضرب"؛ ابن منظور، لسان العرب، ج ۸، ص ۳۵؛ بیروت، دار احیاء التراث العربی، طبع سوم، معجم مفردات الفاظ القرآن، راغب اصفہانی، تحقیق: صفوان عدنان داوودی، قم، طلیعۃ النور، ۱۴۲۶ھ ق، ص ۳۰۴

3۔ محمد معین، فرہنگِ معین، تہران، امیر کبیر، طبع بیست وسوم ۱۳۸۵ شمسی، ج۱، ص ۲۹۵

4۔ ڈاکٹر پریرخ دادستان، روانشناسی مرضی تحولی از کودکی تا بزرگسالی، تہران، سازمان مطالعہ وتدوین کتب علوم انسانی دانشگاہ ہا(سمت)، طبع سوم ۱۳۷۸ شمسی، ص ۶۱

5۔ ڈاکٹر نوائی نژاد، رفتارہای بہنجار و نا بہنجار در کودکان و نوجوان، شکوہ، سازمان انتشاراتی و فرہنگی ابتکار ہنر، طبع چہارم ۱۳۷۰ شمسی، ص ۳۷

6۔ سید داوود حسینی نسب و اصغر علی اقدم، فرہنگ واژہ ہا، تعاریف و اصطلاحات تعلیم و تربیت، تبریز، احراز، ۱۳۷۵ شمسی، ص ۶۳۷

7۔ اگرچہ معنویت کے ساتھ ان بیماریوں کے علاج میں بہت سے اشکالات اور اعتراضات پائے جاتے ہیں، کیونکہ جو معنویت ان کے مدِ نظر ہے وہ اسلام میں بیان کردہ معنویت سے بہت زیادہ مختلف ہے۔ وہ لوگ معنویت کو فرقوں اور جھوٹے عرفانوں، جیسے: بودا اور ان کے پیش کردہ فرضیوں میں سمجھتے ہیں کہ جس میں خدا اور آخرت کا کوئی تصور دیکھائی نہیں دیتا مگر فقط چند موارد میں۔

8۔ توکّلی، غلام حسین، رویکردی انتقادی بہ خاستگاہِ دین از نگاہ فروید، تہران، دفتر پژوہش ونشر سہروردی، ۱۳۷۸ شمسی

9۔ ڈیل کارنگی، ترجمہ: جہانگیر افخمی، آئین زندگی، تہران، ارمغان، ۱۳۷۶ شمسی

10۔ ویکتور فرانکل، ترجمہ و توضیح: ابراہیم یزدی، خدادر ناخود آگاہ، تہران، خدمات فرہنگی رسا، ۱۳۷۵ شمسی

11۔ سید رضیؒ، ترجمہ: محمد دشتی و فیض الاسلام، نہج البلاغہ، مکتوب ۴۷ (ضربت لگنے کے بعد امام حسنؑ اور امام حسینؑ کو وصیت)

12۔ سورۂ انعام، آیت ۸۱-۸۲

13۔ سورۂ یونس، آیت ۶۲

14۔ سورۂ احقاف، آیت ۱۳

15۔ سورۂ فتح، آیت ۴

16۔ الکلینی الرازیؒ، محمد بن یعقوب بن اسحاق، الکافی ج ۲، ص ۱۵، حدیث ۴، تحقیق: علی اکبر غفاری، تہران، دار الکتب الاسلامیہ، ۱۳۸۹ھ ق

17۔ عبدالواحد الآمدی التمیمیؒ، غرر الحکم ودرر الکلم، حدیث ۳۰۸۷، تحقیق: محدث ارموی، جامعہ طہران، ۱۳۶۰ شمسی

18۔ علاء الدین علی المتقی ابن حسام الدین الھندی، کنز العمال فی سنن الاقوال و الافعال، ص ۶۷، بیروت، مکتبۃ التراث الاسلامی، الطبعۃ الاولی ۱۳۹۷ھ ق

19۔ہاشمی رفسنجانی اکبر و محققان مرکز فرہنگ و معارف قرآن کریم، فرہنگ قرآن، ج۱، ص۲۲۷، قم، مؤسسہ بوستان کتاب قم، ۱۳۸۶ شمسی

20 ۔ سورۂ اعراف، آیت ۳۵-۳۶

21 ۔ سورۂ بقرہ، آیت ۱۱۲

22 ۔ سورۂ بقرہ، آیت ۴۵

23۔ام۔رابین دیماتئو، روانشناسی سلامت (۲)، ص۷۶۱-۷۶۲، بغیر تاریخ و ناشر

24۔ سورۂ بقرہ، آیت ۲۷۷

25۔ابن کثیر، اسماعیل بن عمرو ابن کثیر دمشقی، محمد حسین شمس الدین، تفسیر القرآن العظیم، ج۱، ص۱۵۵، (نقل از الطبری، ج۱، ص۲۹۸)

26۔ سید مہدی صانعی، بہداشت روان در اسلام، ص۴۹، بغیر تاریخ و ناشر

27۔ سورۂ طہ، آیت ۱۲۴

28۔ بہداشت روان در اسلام، ص۱۷-۱۸، بغیر تاریخ و ناشر

29۔ سورۂ رعد، آیت ۲۸

30۔ سورۂ بقرہ، آیت ۱۵۲

31۔ عبدالواحد الآمدی التمیمیؒ، غرر الحکم و درر الکلم، حدیث ۹۷۵۷، تحقیق: محدث ارموی، جامعہ طہران، ۱۳۶۰

32۔ محمد باقر مجلسیؒ، بحار الانوار الجامعۃ لدرر اخبار ائمۃ الاطہارؑ، ج۹۳، ص۱۵۳، حدیث ۱۱، بیروت، دار احیاء التراث، ۱۴۱۲ھ ق

33۔ عبدالواحد الآمدی التمیمیؒ، غرر الحکم و درر الکلم، حدیث ۵۱۶۴، تحقیق: محدث ارموی، جامعہ طہران، ۱۳۶۰ غرر الحکم

34۔ محمد باقر مجلسیؒ، بحار الانوار الجامعۃ لدرر اخبار ائمۃ الاطہارؑ، ج۹۳، ص۱۶۲، حدیث ۴۲، بیروت، دار احیاء التراث، ۱۴۱۲ھ ق

35۔ملاحظہ فرمائیں: سورۂ آل عمران، آیت ۱۷۲و۱۷۳و۱۷۵

36۔ام۔رابین دیماتئو، روانشناسی سلامت (۲)، ص۷۵۷-۷۵۸، بغیر تاریخ و ناشر

37۔ملاحظہ فرمائیں: سورۂ مائدہ، آیت ۲۰و۲۳و۲۴و۲۶

38۔ سورۂ بقرہ، آیت ۲۴۶-۲۵۱

39۔ سورۂ یونس، آیت ۱۰۶-۱۰۷

40۔ سورۂ آل عمران، آیت ۱۶۰

41۔ محمد باقر مجلسیؒ، بحار الانوار الجامعۃ لدرر اخبار ائمۃ الاطہارؑ، ج۷۸، ص۷۹، حدیث ۵۶ بیروت، دار احیاء التراث، ۱۴۱۲ھ ق

42۔ محمد محمدی ری شہری، میزان الحکمۃ، ج ۱۳، ص ۴۱۶، حدیث ۲۲۵۲۳، قم، دار الحدیث، ۱۴۱۶ھ ق

43۔ عبدالواحد الآمدی التمیمیؒ، غرر الحکم و درر الکلم، حدیث ۹۰۲۸، تحقیق: محدث ارموی، جامعہ طہران، ۱۳۶۰ شمسی

44۔ ایضاً، حدیث ۷۴۵۱

45۔ ایضاً، حدیث ۱۳۱۸

46۔ محمد محمدی ری شہری، میزان الحکمۃ، ج ۱۳، ص ۴۱۸، حدیث ۲۲۵۳۶، قم، دار الحدیث، ۱۴۱۶ھ ق

47۔ عباس پسندیدہ، رضایت از زندگی، ص ۵۸، قم، دار الحدیث، طبع پنجم ۱۳۸۶ شمسی

48۔ شیخ صدوقؒ، محمد بن علی بن حسین بن بابویہ قمی، الخصال، ص ۶۸، حدیث ۱۰۲، تحقیق: علی اکبر غفاری، بیروت، مؤسسہ الاعلمی للمطبوعات، ۱۴۱۰ھ ق

49۔ ابو الحسن علی بن محمد اللیثی الواسطیؒ، عیون الحکم و المواعظ، ص ۴۳۰، تحقیق: حسین حسنی بیر جندی، قم، دار الحدیث، ۱۳۷۶ شمسی

50۔ سورۂ اسراء، آیت ۱۰۰

51۔ سورۂ اسراء، آیت ۳۱

52۔ سورۂ بقرہ، آیت ۲۶۸

53۔ سورۂ ذاریات، آیت ۵۸

54۔ سورۂ ہود، آیت ۶

55۔ سورۂ عنکبوت، آیت ۶۰

56۔ نہج البلاغہ، خطبہ ۱۸۵

57۔ سورۂ ذاریات، آیت ۲۲

58۔ فضل بن حسن الطبرسیؒ، مکارم الاخلاق، ج ۲، ص ۳۵۶، حدیث ۲۶۶۰، تحقیق: علاء آل جعفر، قم، مؤسسہ نشر اسلامی، ۱۴۱۴ھ ق

59۔ قطب الدین راوندی، سعید بن عبداللہ، قصص الانبیاءؑ، ص ۱۹۷، حدیث ۲۴۹، تحقیق: غلام رضا عرفانیان، مشہد مقدس، مرکز پژوہش ہای اسلامی آستان قدس رضوی، ۱۴۰۹ھ ق

60۔ ابوالحسین ورّام بن ابی فراس، تنبیہ الخواطر و نزہۃ النواظر (مجموعۃ ورام)، ج ۱، ص ۱۶۸، بیروت، دار التعارف، بغیر تاریخ

61۔ محمد بن حسن الطوسیؒ، الأمالی، ص ۶۷۵، مؤسسہ البعثۃ، قم، دار الثقافۃ، ۱۴۱۴ق

اسلامی اور مغربی تعلیم و تربیت کے فلسفی مبانی

سید علی جواد ہمدانی*

alihamadani@gmail.com

کلیدی کلمات: تعلیم، تعلیم و تربیت، فلسفی مبانی، اسلام اور مغرب

خلاصہ

انسانی نشو و نما میں تعلیم و تربیت ایک اہم ترین عنصر ہے۔ اسی لئے تمام ادیان اور مکاتب فکر اس پر انتہائی تاکید کرتے ہیں۔ اسلام بنی نوع بشر کے لئے آخری اور کامل ترین دین ہونے کے ناطے بشری زندگی کے تمام شعبوں کے لئے حقیقی اور مکمل دستور العمل اور قواعد و ضوابط کا حامل ہے۔ اب یہ مسلمانوں کا فریضہ ہے کہ ہر شعبے کے لئے اُن کی بنیاد پر مکمل منصوبہ بندی سے تفصیلی لائحہ عمل تیار کریں۔ بد قسمتی سے اس وقت کسی بھی شعبہ زندگی میں ایسا نظر نہیں آتا۔ آج ہمارا تعلیم و تربیت کا شعبہ مکمل طور پر مغربی الحادی افکار کی بنیاد پر استوار ہے۔ اس مختصر مقالے کا ہدف تعلیم و تربیت کے حوالے سے اسلام اور مغرب کی پیش کردہ اساسی اور آفاقی فکری بنیادوں کے عمیق اختلاف کی طرف توجہ مبذول کروانا ہے۔

اسلامی اور مغربی تعلیم و تربیت کی یہ اساسی اور آفاقی فکری بنیادیں جنہیں یہاں فلسفی مبانی کا نام دیا گیا ہے، چار اہم گروہوں میں زیر بحث لائے گئے ہیں: ۱) تعلیم و تربیت کے علمیاتی (Epistemological) مبانی، ۲) تعلیم و تربیت کے تصور کائنات سے مربوط (Ontological) مبانی، ۳) تعلیم و تربیت کی اقدار (Axiological) کے نظام کے بارے میں مبانی، ۴) اور تعلیم و تربیت کے انسانی (Anthropological) مبانی۔

ان بنیادی تصورات یا مبانی کا اسلامی اور مغربی مکاتب میں اختلاف کا مطالعہ، ہمارے لئے اپنی تعلیم یافتہ نسل کی دین سے دوری کے عوامل کی پہچان، ان کی روک تھام اور اُس کی صحیح سمت میں رہنمائی اور تربیت کی طرف پہلا قدم، نیز ایک اسلامی نظام تعلیم کی تشکیل کی ابتدائی تدبیر ہے۔

---

*۔ اسٹوڈنٹ ایم فل اسلامک فلاسفی، جامعۃ المصطفیٰ العالمیہ، قم، ایران۔

موضوع کی ضرورت اور اہمیت:

ہر قسم کی علمی ترقی در حقیقت فکری ارتقاء میں پوشیدہ ہے اور تمام انسانی علوم شعوری یا لاشعوری طور پر کسی نہ کسی خاص فلسفے پر مبنی ہیں۔ انہی فلسفوں کا باہمی تضاد ہی انسانی علوم میں موجود نظریات و تصورات کے اختلاف کا باعث بنتا ہے۔ جیسے مادہ پرستانہ فلسفی نظام (Materialism) کے تابع ہر مکتب فکر محسوسات سے ماوراء کسی غیبی حقیقت کو قبول نہ کرے گا، یا جو عدمیّت (Nihilism) کے فلسفے کے زیر اثر ہوگا تو وہ انسانی اقدار کو کوئی اہمیت نہ دے گا اور ہر موقعے کو لذتیّت (Epicureanism) کے لئے استعمال کرے گا۔

مندرجہ بالا پس منظر کے ساتھ ہمیں اپنے افکار و تصورات کی صحیح فلسفی فکر کے ذریعے پرورش کی ضرورت ہے۔ یہی فلسفہ نہ صرف انسان کی علمی، فکری اور سماجی شخصیت کی بنیاد فراہم کرتا ہے، بلکہ پورے انسانی نظام فکر و عمل پر بھی اثرانداز ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے دنیا میں تمام تربیتی مکاتب فکر (Educational Schools of Thought) انسانی خلقت کے ہدف اور اس کے اعلیٰ ترین مرتبہ کمال و سعادت کے بارے میں اپنا خاص تصور اور نکتہ نظر پیش کرتے ہیں۔ تصورات کے اس مجموعے سے ہر مکتب کی تہذیب و تمدن اور تعلیم و تربیت کی بنیاد پڑتی ہے اور اس بنیاد پر زندگی کے مختلف شعبوں کے اصول و مبادیات تشکیل پاتے ہیں اور مربوط شعبے کے عملی میدان میں ان اصولوں کو مد نظر رکھتے ہوئے طریقہ کار اپنائے جاتے ہیں۔ ان بنیادی ترین تصورات کو یہاں ہم نے "مبانی" کا نام دیا ہے۔ گویا مبانی، اصول و مبادی کی بنیاد ہیں۔ چونکہ ہر مکتب تمام شعبہ ہائے زندگی کے بارے میں اپنی خاص نگاہ رکھتا ہے لہٰذا انسانی علوم کے تمام مسائل اس مکتب کے فلسفی مبانی سے مربوط ہوتے ہیں۔

انسانی علوم کا موضوع بلاواسطہ یا بالواسطہ انسان ہی ہوتا ہے اور تعلیم و تربیت براہ راست انسان سے وابستہ ہے۔ انسان کس طرح نشوونما پاتا ہے؟ پلنے اور بڑھنے کے ہر مرحلے (بچپن، بلوغ، نوجوانی، جوانی۔۔) میں اس کے اندر کس قسم کی روحانی، نفسیاتی اور عملی صفات وجود میں آتی ہیں؟ انسان کی پسند و ناپسند، احساسات، جذبات اور طور طریقے کس رخ میں پروان چڑھتے ہیں اور کس ڈگر پر ان کی نشوونما ہونی چاہیے؟ عورت اور مرد کی شخصیت، ان کے فطری و حیاتیاتی فرق کو کس مرحلے میں مدّنظر رکھا جائے؟۔۔۔ وغیرہ کے بارے میں اصول و مبادیات اور طریقہ کار، تربیتی مبانی کے ذریعے واضح ہوتے ہیں۔

انسانی عقل و تصور کے اجزاء اور نظام کس طرح کا ہے اور کیسے عمل کرتا ہے؟ انسان اپنے ارد گرد کی اشیاء کو کس طرح درک کرتا ہے؟ اس کا اپنے ماحول کی نسبت عکس العمل کس قسم کا ہوتا ہے؟ اس لامتناہی اسرار سے بھرے

موجود کو کس تعلیمی اور تربیتی پروگرام کے کنٹرول میں قرار دیا جائے؟۔۔۔ جیسے بے شمار سوالوں کی تشریح و تفصیل اور حل تعلیم وتربیت کے بنیادی ترین اصولوں یعنی مبانی میں پوشیدہ ہے۔ جب تک ان سوالوں کا بنیادی ترین تسلی بخش جواب واضح نہ ہو، انسانی تعلیم اور تربیت کی صحیح اور قابل ستایش منصوبہ بندی نہیں ہو سکتی۔

تعلیم وتربیت یا تعلیمی نظام کے مبانی سے آشنائی کی ضرورت اور اہمیت اس مثال سے واضح ہو سکتی ہے۔ فرض کریں ہم ایک شاندار عمارت تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔ یقینی طور پر اس عمارت کی بنیادوں اور ان پر وجود میں آنے والی تعمیرات کو ایک ماہرانہ اور تفصیلی نقشے کے تحت اول سے آخر تک پایۂ تکمیل کو پہنچائیں گے۔ اگر یوں نہ کریں تو کبھی بھی اس مقصد میں کامیاب نہ ہو سکیں گے۔ اگر ہم زیر زمین بنیادوں کو تو ایک ماہر تعمیرات کے نقشے کے تحت تیار کروایں، جبکہ اوپر کھڑی ہونے والی عمارت کو کسی دوسرے ماہر تعمیر کے نقشے کے تحت بناوائیں، جسے زیر زمین بنیادوں کے ڈیزائن کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہو تو آپ خود اندازہ لگائیں اس قسم کی عمارت جس کی بنیادوں اور اوپر تعمیر کی گئی عمارت میں ہم آہنگی نہ ہو، کتنی پائیدار ہو گی!

بالکل اسی طرح اگر کسی معاشرے کے تربیتی مبانی تو اسلامی ہوں جبکہ جن تربیتی اہداف، عمومی اصول و مبادی، طریقہ کار اور انسانی قابل تربیت پہلوؤں کا انتخاب کیا جائے وہ مغربی تربیتی مبانی کے تحت ہوں، تو جو نسل ہم معاشرے کو پروان چڑھا کر پیش کریں گے اس کی شخصیت کتنی پائیدار اور بااعتماد ہو گی؟ نیز وہ نسل انسانی، دینی، سماجی اقدار، اجتماعی تصوارت اور اخلاقی نظریات کی کتنی پاسداری کرنے والی ہو گی؟

انسان جب کوئی اصول بناتا ہے تو اس کے پیچھے لازمی طور پر اقدار، اخلاق، معاشرت اور تمدن کا کوئی خاص نقشہ (تصور و نظریہ حیات) کارفرما ہوتا ہے، جس کے مطابق وہ اپنی زندگی ڈھالنا چاہتا ہے۔ اسی طرح جب وہ اپنے کسی اصول یا قدر کو پایمال کرتا ہے تو دراصل اپنے نظام اقدار اور نظام حیات کے اُن بنیادی تصورات کی نفی کرتا ہے جن پر وہ اصول اور اقدار قائم تھیں۔

آج مسلمانوں کا المیہ یہ کہ ان کا تعلیمی اور تربیتی نظام، اہداف اور طریقۂ کار، اسلام کے سنہری اصولوں، تعلیمات اور بنیادی تصورات سے ہماہنگ نہیں ہے۔ اور یہی تضاد، ان کے تعلیمی اور تربیتی نظام کی جڑیں کھوکھلی کرنے کا باعث بن رہا ہے۔ آج مسلمان نسل کا ایک بہت بڑا حصّہ مسلمان ممالک میں پائے جانے والے ناقص تعلیمی اور تربیتی نظام کی وجہ سے شکست خوردہ اور احساس کمتری کا شکار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ طبقہ مغربی تعلیم کے ساتھ وہاں کی تہذیب اور فلسفۂ حیات اور مبانی کو بھی بعینہٖ قبول کر رہا ہے۔

ذرائع ابلاغ کے اس جدید ترین دور میں ہماری تہذیب، ثقافت اور دینی و انسانی اقدار، مغربی تہذیب کی یلغار کی زد پر ہیں۔
ہماری مزید غفلت ہمیں تہذیبی عالمگیریت (Cultural Globalization) کی سیاست کے بھنور میں ایسا لے ڈوبے گی کہ ہم اپنی تہذیب و ثقافت اور اسلامی شناخت سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔ لہٰذا اسلامی تعلیم و تربیت کے موضوع پر بحث کی ضرورت اور اہمیت کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ یہاں اسلامی اور مغربی تعلیم و تربیت کے فلسفی مبانی کے باہمی مقایسہ کی اہمیت بھی اجاگر ہو جاتی ہے۔ کیونکہ تاریخی طور پر انسانوں کے لئے کسی بھی چیز کی قدر و قیمت کے جانچنے اور سمجھنے کے لئے موازنہ اور مقایسہ انتہائی اہم اور موثر طریقہ شمار ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ عین ممکن ہے کہ ہم اس تطبیقی مطالعہ اور مقایسہ کے ذریعے اپنی تعلیمی اور تربیتی نظام کے انحطاط اور تنزلی کی وجوہات کو بہتر سمجھ پائیں اور ان کی روک تھام کے لئے صحیح سمت میں قدم اٹھا سکیں۔

موضوع سے مربوط چند کلیدی الفاظ اور مفاہیم:

ا۔ تربیت: تربیت عربی میں۔ "ربو" بمعنی زیادہ ہونا سے لیا گیا ہے۔ "ربا الشئی :ای زاد و نما" (1) یعنی چیز زیادہ ہوئی اور پروان چڑھی۔ اور انسانی تربیت سے مراد، انسانی استعداد کی پرورش یعنی ایک شخص کی استعداد کو پروان چڑھانے کے لئے وسائل کی فراہمی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو لغت میں تربیت کا معنی تعلیم، تادیب، اخلاق و تہذیب کی تعلیم، سکھانا، سدھانا، (اور) پرورش بیان ہوا ہے (2)۔
البتہ تربیت کے بارے میں مختلف افراد نے اپنی مخصوص علمی قابلیت اور تجربہ کی بنیاد پر اور حیات انسانی سے مربوط اپنے تصورارت و نظریات کی رو سے مختلف تعریفیں پیش کیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ تعریفیں زیادہ تر کوئی خاص انسانی پہلو اجاگر کرتی ہیں اور ایک مکمل اور جامع تعریف کے زمرے میں شمار نہیں ہوتیں۔ مثلا تعلیمی میدان میں مصلحت اندیشانہ (Pragmatism) فلسفی نظام فکر کے پیرو معروف اور با اثر امریکی مفکر جان ڈیوی (John Dewey) (3) کے مطابق، بچوں کو آغاز سے ہی ڈیمو کریسی کی مشق کرانی چاہیے، جبکہ جان شاتو (Jean Chateau) (4) کی نظر میں تربیت یعنی ایک آزاد اور منظّم شخصیت اور بااخلاق فرد بننے کے لیئے بچے کی مدد کرنا ہے۔

قرآن وحدیث میں تربیت کے لفظ کی جگہ زیادہ تر تزکیہ اور تأدیب کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ تزکیے اور تربیت کا مشترک معنی پرورش اور پروان چڑھانا ہی ہے۔

۲۔ تعلیم: عربی لغت میں، التعیلم :اختص بما یکون بتکریر و تکثیر حتی تحصل منه اثرفی نفس المتعلم(5)؛ یعنی: تعلیم مخصوص ہے ایک عمل کی تکرار اور کثرت سے تاکہ سیکھنے والے کے نفس پر اس کا اثر حاصل ہو۔

اردو لغت میں: (بھی) تعلیم سے مراد علم پڑھنا (حاصل کرنا)، ہدایت، کسی کو کچھ سکھانا، پڑھانا، (اور) تہذیب بیان ہوا ہے۔ قرآن وحدیث کی روشنی میں علم کی ماہیت ایک نور کی مانند ہے جو خداوند متعال کی جانب سے خاص شرائط میں قابل اور باصلاحیّت نفوس کو عطا ہوتا ہے، لہٰذا حقیقی معلم ذات خداوند متعال ہے جو علمی کمالات کو با استعداد انسانی نفوس کو عطا فرماتا ہے۔ تربیت کی طرح تعلیم کے بارے میں بھی مختلف تصورات اور نظریات کے تحت کئی تعریفیں موجود ہیں۔

۳۔ تعلیم اور تربیت کا آپس میں رابطہ:

اردو زبان میں بعض اوقات تعلیم کی جگہ تعلیم اور تربیت اکٹھے (مترادف) استعمال ہوتے ہیں جبکہ اوپر بیان کی گئی (تعریفوں) تعریف میں تعلیم کے اور تربیت کے علیحدہ علیحدہ اردو اور عربی میں اور آیات وروایات کے مطابق، نیز بعض دوسرے مفکرین کی نظر میں تعلیم اور تربیت کے معنی علیحدہ علیحدہ بیان کیے گئے ہیں۔

عمومی طور پر "تربیت" کا مفہوم، "تعلیم" کے مفہوم سے وسیع تر ہے، اور جب تعلیم وتربیت اکٹھے استعمال ہوتے ہیں تو یہ اصطلاح (مرکب) تربیت کے معنی میں ہی استعمال ہوتی ہے۔ بعض مغربی زبانوں میں ایجوکیشن (Education) کا لفظ اسی مفہوم کا ہم معنی ہے۔ کیونکہ خود لفظ ایجوکیشن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ دو دیگر لاطینی الفاظ سے مشتق ہے:

الف: Educare (لاطینی: ایدوکارے)　　**ب**: Educere (لاطینی: ایدوچرے)

پہلے لفظ Educare کا وسیع معنی ہے جو حیوان اور انسان دونوں کے بارے میں استعمال ہوتا ہے، جس کے معنی پروان چڑھانا اور شکل وصورت دینا (تہذیب) ہیں۔ جبکہ دوسرے لفظ Educere کے معنی باہر کی طرف ہدایت کرنا اور پرورش کرنا اور انسان کی بالقوہ توانائیوں کو عملی کرنا ہے؛ اس لحاظ سے اس انسانی پہلو سے دوسرے لفظ کی اہمیت اور حیثیت زیادہ ہے۔ لیکن یہ دونوں معنی Education کے لفظ میں پوشیدہ ہیں۔

(Craft (1984) noted that there are two different Latin roots of the English word "education." They are "educare," which means to train or to mold, and "educere," meaning to lead out. While the two meanings are quite different, *they are both represented in the word "education."* Thus, there is an etymological basis for many of the vociferous debates about education today. The opposing sides often use the same word to denote two very different concepts. One side uses education to mean the preservation and passing down of knowledge and the shaping of youths in the image of their parents. The other side sees education as preparing a new generation for the changes that are to come:
http://eric.ed.gov/?id=EJ724880)

یہاں تعلیم یا تعلیم و تربیت مترادف ہے Education کے، اس لحاظ سے اس میں استاد کا عمل اور اقدامات شامل ہیں جن کا مطلوبہ نتیجہ اور اثر شاگرد پر پڑتا ہے۔ لہٰذا نظام تعلیم میں استاد کے کردار سے جو ضروری شرائط اور ابتدائی مراحل کی تیاری میں انتہائی اہم ہے، کوئی غافل نہیں ہو سکتا(6)۔

اس تحقیق میں تعلیم وتربیت کے اسی معنی و مفہوم کے تحت اسلامی اور مغربی نظام تعلیم کا مطالعہ کریں گے۔

یہاں یہ بھی وضاحت کر دیں کہ علم کی بھی رائج عام تعریف ہی مدّنظر ہے؛ یعنی Knowledge اور Science جو درج ذیل ہے:

Knowledge: facts, information, and skills acquired by a person through experience or education.

Science: a systematically organized body of knowledge on a particular subject.

جبکہ اسلام میں علم کی حقیقت اس سے مکمل طور پر مختلف ہے؛ پیغمبر اکرم ﷺ کی فرمایش کے مطابق:

العلم نور یقذفه الله فی قلب من یشاء؛ علم ایک نور ہے جسے خداوند متعال جس کے قلب میں چاہے ڈال دیتا ہے۔ البتہ اس علم کا معیار حق تعالی کی معرفت اور آگاہی ہے۔ اگر یہ آگاہی حق تعالی کے فعل سے مربوط ہو جیسے فطرت کے جاری قوانین اور علتوں کا جاننا، تو اس کی ایک مثال قرآن میں حضرت سلیمانؑ کے حواری آصف برخیا ہیں، جن کے پاس کتاب کا کچھ علم تھا تو بلقیس کے تخت کو آنکھ جھپکنے میں یمن سے بیت المقدس لے آتے ہیں۔ یہ حقیقی علم ہے جو عالم ملک کی تکوینیات پر تصرف ہے جسے یقذفه الله فی قلب من یشاء کہتے ہیں اور اس کے حصول کا ایک پہلو شرعی تزکیہ ہے۔

اور اگر معرفت حق تعالی کے قول سے آگاہ ہونا ہو تو یہ عالم ملک و ملکوت پر دسترسی ہے، جیسا کہ ارشاد باری تعالی ہے: و کذلك نری ابراهیم ملکوت السموات و الارض؛ بہرحال حق تعالی کے قول و فعل ایک دوسرے کے مصدّق ہیں۔ اور ہر جہالت گمراہی اور تاریکی ہے جو معرفت اور آگاہی کے نور سے فنا ہوتی ہے۔

نتیجہ یہ کہ علم و معرفت نور ہے لیکن حق تعالی کی معرفت کے ہمراہ، کہ ان سب کے مراتب ہیں اور یہ نور سوائے بے عیب فطرت کے حاصل نہیں ہوتا۔ تحریر حاضر میں علم کا عام رائج معنی پیش نظر رکھتے ہوئے بحث کی گئی ہے، کیونکہ اسلامی نکتہ نظر سے علم اس رائج تعریف سے اعلی درجے کی حقیقت ہے اور اس کی تعلیم اور حصول کے مبانی، اصول اور طریقہ کار یکسر مختلف ہیں۔

۴۔ مبانی، اصول و مبادی اور طریقہ کار

مبانی:

تربیتی علوم کی اصطلاح میں مبانی اور اصول و مبادیات کے لئے مختلف معانی ذکر ہوئے ہیں بعض کے مطابق: تعلیم اور تربیت کے مبانی، انسان کی موقعیت، امکانیات اور حائل روکاٹوں اور انسانی زندگی کی اہم ضروریات سے متعلق بحث کرتے ہیں(7)۔ ایک تعریف میں مبانی سے مراد ان نظری علوم کا سلسلہ ہے جن کا موضوع انسان ہے، جس میں تصور کائنات، تصور انسان اور نظریہ علم (علمیات) شامل ہیں۔ ان معارف کا تعلق انسانی فکر و عقیدے اور تصور حیات کے اصولوں سے ہے(8)۔

جبکہ شہید مرتضی مطہری اس ضمن میں فرماتے ہیں: جو کچھ حکماء اور فلاسفر حکمت کی تقسیم بندی میں حکمت نظری (Theoretical Wisdom) اور حکمت عملی (Practical Wisdom) میں پیش کرتے ہیں، اسے ہی ایک دوسرے پہلو سے مبانی اور اصول کہہ سکتے ہیں(9)۔ حکمت نظری (مبانی) یعنی "کائنات کا ادراک (تصوّر کائنات) ایسے جس طرح کہ موجود ہے" اور حکمت عملی (اصول) یعنی "طرز حیات کا ادراک (تصوّر حیات) جیسے کہ ضروری اور لازمی ہونی چاہیے"۔ اصول ہمیشہ مبانی سے طے پاتے ہیں اور مبانی کے تابع ہوتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں ملزومات (لازمی ہونا) ہمیشہ موجودات (ہستی) کا منطقی نتیجہ ہیں۔ اس لحاظ سے مبانی جس قدر حقیقت سے نزدیک تر ہوں گے اصول اور مبادیات اتنا ہی موثر اور قابل اعتماد ہوں گے، چونکہ اصول اور مبادیات ایسے قواعد اور ضوابط ہیں کہ جن کی ہر علمی اور عملی میدان کے ماہرین اور صاحب نظر افراد پابندی کرنا فرض سمجھتے ہیں۔

مبادی:

اردو لغت میں مبادی (کسی موضوع یا علم کے) ابتدائی امور، بنیادی باتیں ہیں(10)۔ علمی اصطلاح میں مبادیات کی تصوری اور تصدیقی مبادی میں تقسیم کی جاتی ہے اور ہر علم کے اہم مفاہیم کی تعریف اور اس سے متعلق اصول متعارفہ اور اصول موضوعہ وغیرہ بیان کئے جاتے ہیں۔

اصول:

بنیادیں باتیں جن سے ضمنی مسائل یا فروعات پیدا ہوں خصوصا کس علم یا فن کے کلیات و مسلمات۔ تربیت سے مربوط علمی اصطلاح میں اصول وہ تصورات، نظریات اور عمومی قواعد ہیں جو تربیتی امور کے زیادہ تر موارد میں صادق ہوں اور تربیتی اساتذہ کے تمام امور میں راہنمائی کریں (11)۔ بعض اوقات کسی موضوع یا مضمون میں مبادی اور اصول میں کسی تفریق کے بغیر دونوں کو مترادف صورت میں استعمال کیا جاتا ہے۔ جبکہ اصول جب مبادیات کے ہم پلہ قرار پاتے ہیں تو ان سے مراد بنیادی اصول ہوتے ہیں اور جب یہ لفظ مبادی کے معنی سے ہٹ کر استعمال ہوتا ہے تو اس سے مراد عمومی اصول یا کلیات منظور ہوتے ہیں جو مبادیات اور بنیادی اصولوں کی بنیاد پر بنائے اور مرتب کیئے جاتے ہیں۔ جبکہ خود مبادیات کا تعین مبانی سے کیا جاتا ہے اور یوں مبانی، مبادیات کے مبادیات کا درجہ رکھتے ہیں اور ہر خاص مکتب کے نظریات اور تصورات کا ماحاصل ہوتے ہیں۔

طریق کار:

کام کرنے کا طریقہ، راستہ، طرز یا روش۔ تربیتی طریق کار، طرز عمل یا روش وہ دستور العمل ہیں جو ہمیں اپنے مورد نظر ہدف اور مقصد تک پہنچنے کے لئے یہ بتاتے ہیں کہ کب، کیا اور کیسے کرنا چاہیے۔ در واقع طریق کار، اصولوں کی نسبت جزئی تر قواعد و ضوابط ہیں جو اصولوں پر مبنی ہونے کے ساتھ ساتھ تربیتی مبانی، اقدار، ماحول، موجودہ شرائط اور اہداف کے تناظر میں معین، مکمل اور مفصل تر دستور العمل ہیں۔ تربیتی طریق کار نظام تربیت کا وسیع ترین حصّہ ہونے کے ساتھ تربیت کا انتہائی مشکل اور اہم ترین مرحلہ بھی ہے، صحیح اور موثر طریق کار اور روش کا انتخاب صرف وہی استاد اور تربیت کرنے والا کر سکتا ہے جو تربیت کے اہداف اور اصولوں سے پوری طرح آگاہ اور ماہر ہو۔

۵۔ مغرب سے مراد:

جس تہذیب کو آج کل ہم مغرب سے نسبت دیتے ہیں وہ اس کا منفی پہلو ہے، لیکن اس بات پر توجہ رکھنی چاہیے جس منفی پہلو کو ہم مغرب کی طرف نسبت دیتے ہیں وہ مغربی تمدن میں پیدا ہونے والے دین مخالف اور خدا مخالف (سیکولر) تاثرات ہیں، البتہ یہ چیز نہ تو مغرب کے جغرافیائی محل وقوع تک محدود ہے اور نہ ہی وہاں کی تمام تاریخ پر حاوی ہے اور نہ ہی وہاں کے تمام افراد سے متعلق ہے۔ یعنی ایسی سیکولر سوچ مغرب کے جغرافیائی حدود سے باہر بھی ہو تو وہ بھی اسی عنوان میں شامل ہو گی۔ دوسری بات یہ کہ ایسی فکر نہ تو تاریخی طور پر اس خطہ میں ہمیشہ رائج رہی ہے اور نہ ہی وہاں رہنے والے ہر شخص کو اس فکر کا ہم نوا کہہ سکتے ہیں۔ آج بھی مغربی سرزمین پر

ایسے لوگ موجود ہیں جو اس فکر اور تہذیب کے خلاف ہیں جیسا کہ گذشتہ زمانوں میں بھی مخالفت کرنے والے موجود رہے ہیں۔ جس فلسفے کی ہم مزمت کرتے ہیں وہ مغربی تہذیب اور ثقافت کا وہ فلسفہ ہے، جس کی جڑیں مادہ پرستی (Materialism) اور انسان پرستی (Humanism) میں گڑھی ہوئی ہیں (12)۔

لہٰذا مغرب سے مراد وہ فلسفہ، تہذیب اور نظریاتی مبانی ہیں جو مادہ پرستی کی بنیاد پر خدا دین اور الوہی اخلاق کی تکذیب پر مبنی ہے، اس لحاظ سے مشرقی اشتمالیت (کیمونزم) اور مغربی لیبرل ازم میں کوئی فرق نہیں، کیونکہ دونوں کی ہی بنیاد خدا اور دین کے انکار پر رکھی گئی ہے اور ایک ہی ملحدانہ سکّے کے دو رخ ہیں۔ اس تحقیق میں مغرب سے مراد، عصر حاضر کا مسلط ترین مغربی مکتب "لیبرل ڈیموکرسی" اور اس سے منسلک نظریات ہیں جن کا اسلامی مکتب سے تعلیم و تربیت کے ضمن میں تقابلی جائزہ مورد نظر ہے۔

۲۔ تعلیم و تربیت کے فلسفی مبانی کی وضاحت:

تعلیم و تربیت کا موضوع چونکہ "انسان" ہے، اس لئے تمام نظریاتی مکاتب انسانی تربیت کے ضمن میں انسان کی ماہیت، اس کی خلقت، کائنات میں اس کے مقام، حیات کے آغاز، ہدف اور حیات کے اختتام سے متعلق دوسرے مکاتب کی نسبت مکمل اور بہتر جواب دینے کی تگ و دو میں رہتے ہیں۔ انسان جب اپنے اطراف میں نگاہ دوڑاتا ہے تو کئی بنیادی سوالات جنم لیتے ہیں، جیسے ارد گرد نظر آنے والے موجودات، آیا یہ بہت سے وجودات ہیں یا ایک وجود؟ اگر وجودات کی کثرت ہے، تو کیا ان کا آپس میں کوئی رابطہ ہے یا نہیں؟ اگر رابطہ ہے تو کیا یہ ایک نقطہ پر ختم ہوتا ہے یا نہیں؟ اگر ایک نقطہ پر ختم ہوتا ہے تو کیا وہ نقطہ مادی ہے یا غیر مادی؟ ہر مکتب کا تصوّر کائنات (جہان بینی) ان سوالات سے مربوط ہوتا ہے، اور جو علم ان سوالات کے جوابات فراہم کرتا ہے اسے فلسفہ کہتے ہیں۔ تصوّر حیات یا نظام زندگی (ایڈیولوجی) اسی تصوّر کائنات کی بنیاد پر تشکیل پاتا ہے اور انسانی عملی زندگی کی اساس مہیا کرتا ہے۔

تعلیم و تربیت کے فلسفی مبانی کی بحث، تعلیم و تربیت کے کلیات پر مبنی بنیادی نظریاتی مباحث کی اہم ترین بحث ہے۔ جیسا کہ مبانی کی تعریف میں ذکر ہوا ہے کہ مبانی انسان کی موقعیت اور امکانیات کو اس کی زندگی اور روز مرہ رویّے کے لئے واضح کرتے ہیں۔ لہٰذا تعلیم و تربیت کے فلسفی مبانی تعلیم و تربیت کے موضوع یعنی "انسان" کی خلقت اور ہستی میں مقام، روابط اور خصوصیات کی حقیقی تعریف و تفصیل کی تشریح کرتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر تربیت کے عمومی اہداف، اصول اور طریق کار جو کہ تربیتی لوازمات کا ایک سلسلہ ہیں وہ بھی ہر مکتب کے فلسفی مبانی سے ہی متاثر اور واضح ہوتے ہیں۔

مندرجہ بالا وضاحت کی روشنی میں فلسفی مبانی کے ذیل میں، نہ صرف تعلیم وتربیت بلکہ تمام انسانی علوم کے لیئے، درج ذیل چار پہلووں کو مرکزی حیثیت حاصل ہے، لہٰذا اسلامی اور مغربی تعلیم وتربیت کے فلسفی مبانی کا مندرجہ ذیل انہی چار پہلووں کو مد نظر رکھتے ہوئے موازنہ کریں گے۔

۱۔ تعلیم وتربیت کے علمیات (نظریہ علم) سے متعلق (Epistemological) مبانی

۲۔ تعلیم وتربیت کے تصور کائنات سے متعلق (Ontological) مبانی

۳۔ تعلیم وتربیت کے نظام اقدار سے متعلق (Axiological) مبانی

۴۔ تعلیم وتربیت کے تصور انسان سے متعلق (Anthropological) مبانی

انسان سے مربوط کئی دوسرے عوامل نفسیات، معاشرت، شہریت، ثقافت۔۔۔ وغیرہ بھی انسانی علوم کے ذیل میں تعلیم وتربیت پر اثر انداز ہوتے ہیں، لیکن اوپر ذکر کیئے گئے چار نسبتاً کلی اور بنیادی امور کی بہ نسبت باقی سب جزئی اور فرعی شمار ہوتے ہیں۔ اس لئے اپنی بحث میں تعلیم وتربیت کے فلسفی مبانی میں انہی چار کلی اور بنیادی امور کے بارے میں مغربی اور اسلامی طرز فکر و نظر کا مختصراً تقابلی جائزہ لیں گے، اور آخر میں نتیجہ پیش کریں گے۔ لہٰذا ذیل میں پہلے تعلیم وتربیت سے متعلق مغربی نکتہ ہائے نظر سے بحث کا آغاز کرتے ہیں۔

مغربی تعلیم وتربیت کے فلسفی مبانی

ہر فکری اور نظری مکتب انسانی ماہیت اور شخصیت، آغاز خلقت، اختتام اور دنیاوی زندگی کے بارے میں اٹھنے والے سوالات کے جواب میں یہی کوشش کرتا ہے کہ دیگر مکاتب سے بہتر اور مکمل تر جواب پیش کرے، جبکہ یہ بھی حقیقت ہے کہ ان تمام مکاتب کے جوابات میں سے صرف ایک ہی مکمل طور پر انسانی حقیقت سے متعلق درست ہو سکتا ہے، چونکہ کسی بھی موجود کی معروضی حقیقت ایک سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔ مغربی مکاتب فکر کی اکثریت انسان کی پیدائش، ذات اور تعریف اور اس طرح اس کے تعلیم و تربیت سے متعلق تصورات اور نظریات روحانی اور ماوراء طبیعت سے قطع نظر صرف مادیّت پر ستانہ تفسیر پر منحصر ہیں۔ اسی لئے مغربی تربیتی فلسفے جو تعلیم وتربیت کے موضوع پر خدا اور دین کے بارے میں اگر کسی بھی قسم کے منفی یا مثبت عقیدے کا اظہار نہ بھی کر رہے ہوں، تو پھر بھی عملاً، عمدی یا غیر عمدی طور پر، دین کا انکار اور سیکولر نظریات کی ترویج کرتے نظر آتے ہیں اور انکے تربیتی اہداف وانسانی کمال صرف اسی مادی دنیا تک محدود ہیں۔

نفی دین کے علاوہ کئی مغربی مکاتب نے انسانی قدر و منزلت کو اسی عالم میں حد سے بڑھا کر پیش کیا تو کسی نے اس کی انتہائی پست حیثیت پیش کی۔ وہ مکاتب جنہوں نے انسان کی افراطی شناخت کروائی، ان میں مکتب اصالت

ہستی (Existentialism) جس کے بانی "کی یر کگارد" (Kegaard Kier) اور "نطشے" (Nietzsche) مانے جاتے ہیں اور عصر حاضر کے انسان پرستانہ نظریات (Humanism) نے انسان کو اس عالم کا محور اور خدا قرار دیا، جبکہ تفریطی مکاتب نے انسانی منزلت کو اپنے مقام سے گھٹایا، تو انہوں نے یا تو انسان کو مشین میں لگے پرزے کی مانند شمار کیا جو نہ کسی ارادے اور نہ ہی اختیار کا حامل ہے یا انسان کی خواہشات، ضروریات اور شوق و رغبت اور احساسات کو دیگر حیوانات کی مانند فرض کیا، جن میں "فرویڈ" کا مکتب نفسی تحلیل (Psycho-Analysis) "جرمی بنٹام" کا مکتب افادیّت (Utilitarianism) "اپیکور" کا مکتب لذّیّت (Epicureanism) وغیرہ شامل ہیں۔ ان تمام مکاتب نے انسانی نظریات، وقت اور سرمایے کو کسی ایک خاص جزئی انسانی پہلو کی طرف متوجہ رکھا اور اس کے برتر اور بلند مرتبہ پہلوؤں سے غفلت برتتے رہے (13)۔

مغربی تعلیم و تربیت کے فلسفی مبانی کے جائزے میں صرف عصر حاضر کے اہم ترین اور رائج نظریہ انسان پرستی (Humanism) پر توجہ مرکوز رکھیں گے جو تقریباً سولہویں صدی سے بقیہ تمام اخلاقی، ہنری، ادبی، سیاسی، تربیتی اور عقیدتی تصورات پر خدا محوری کی بجائے انسان محوری کے عنوان سے حاوی چلا آرہا ہے اور سیکولزم کے ساتھ مل کر یہ دو نظریے مغربی لیبرل ڈیموکریٹک سرمایہ دارانہ نظام کے دو پروں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس مکتب فکر سے منسلک عصر حاضر کے مفکر "فرانسس فوکویاما" کے بقول: نظریّاتی لحاظ سے مغرب جہاں پہنچ چکا ہے وہاں فکری ارتقاء کے حوالے سے انسانی تاریخ اپنی انتہاء کو پہنچ چکی ہے! (14)

۱۔۲) مغربی تعلیم و تربیت کے علمیاتی مبانی:

ہمارے وجود سے ہٹ کر ہمارے ارد گرد بہت سے دوسرے حقائق موجود ہیں جن کی ہم سے اور ہمارے اعمال سے علیحدہ اور مستقل حیثیت ہے۔ ہمارا ان معروضی حقائق کے ساتھ استوار روابط میں سے ایک رابطہ ان حقائق کی پہچان اور ان سے آگاہی کا رابطہ ہے۔ علمیات فکری اور نظری عمل کا ایسا علم ہے، جو موضوع انسانی اور اس کے تصوراتی نظام اور معروضی حقائق کے رابطے کے بارے میں سوچ و بچار کے عمل کی حیثیت کا جائزہ لیتا ہے۔ اس علم میں جن سوالات کے جوابات تلاش کیئے جاتے ہیں، ان سوالات و جوابات کا مجموعہ اس علم کے مسائل کو تشکیل دیتا ہے؛ جیسے: آیا حقیقت موجود ہے؟ کیا حقیقت قابل دسترسی ہے؟ اگر قابل دسترسی فرض کر لیں تو کیا اسکا حصول یقینی اور حتمی ہے؟ اس کے یقینی حصول کی صورت میں، اس کے حصول کے ذرائع کون سے ہیں؟ آیا یہ یقینی پہچان اور آگاہی حقائق کے مطابق ہے؟ مطابقت کا معیار اور صحیح معنی کیا ہے؟ تعلیم و تربیت کے بنیادی ترین ارکان میں معروضی حقائق کی تسلی بخش

آگاہی اور شناخت اہم ترین رکن ہیں۔ اس لئے علم و آگاہی کے حصول کے امکان، وسائل، منابع اور موضوعات کے مجموعے کو تعلیم وتربیت کے علمیاتی یا نظریہ علم (Epistemological) کے مبانی کے عنوان کے تحت مورد مطالعہ قرار دیا گیا ہے۔

یہاں اہم ترین سوال یہ ہے کہ کیا معروضی حقائق تک اپنے نفس، انا اور تعصب کے دخل اندازی کے بغیر، واقعی اور معروضی حقائق تک انسان کی رسائی ممکن ہے تاکہ تعلیم و تربیت کے ذریعے حقائقِ اشیاء کی دریافت اور قوانین قدرت تک رہنمائی اور صداقتوں تک رسائی حاصل کرنے کی راہ بھی ہموار ہوسکے۔

ایپسٹی مالوجی یونانی "ایپس ٹے مے" بمعنی علم، "لوگس" بمعنی بحث سے مشتق ہے۔ اس مرکب لفظ کا صحیح ترجمہ مبحثِ علم یا علمیات سے موسوم ہے۔ علمیات کی ابتداء ان شکوک اور اوہام سے ہوئی جو ہمارے طریق علم اور علمی نتائیج کے معتبر اور صحیح ہونے پر کئے گئے تھے (15)۔ تاریخی طور سے مغرب کی علمی میراث قدیم یونانی فلسفے کی مرہون منت ہے، اور جہاں تک کی تاریخ کے باقاعدہ آثار موجود ہیں (تقریباً ۶۰۰ سال قبل عیسوی) مغربی فکر الوہی عقل سے دوری کی بناء پر ابتداء ہی سے "آرخہ" (یعنی کائنات کے مادۃالمواد یا عنصر اولیہ) پر اختلاف کی وجہ سے سوفسطائیوں کی شکیّت (ارتیابیت Scepticism) اور استقرائی و تجریبّت کے بھنور میں غرق معروضی حقائق اور حقیقت کی شناخت سے کوسوں دور دیکھائی دیتی ہے، جس سے آج تک وہ چھٹکارہ نہیں پا سکی۔

عہد وسطیٰ کی آخری صدی میں پورے یورپ میں کافی ساری تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ دوسری طرف خدا اور وحیانی عقل سے جدائی نے مغربی فکر و نظر کے سامنے آہستہ آہستہ مشکلات کا ایک ڈھیر لگا دیا۔ اس اکھاڑ پچھاڑ میں جس میں لوگوں کی فکری اور فلسفی بنیادیں ڈھیر ہوئیں اور عقاید اور ایمان کی تبدیلی رونما ہوئی متفکرین اور محققین کے ذہنوں میں اس شبہ نے جنم لیا کہ کیسے اطمینان اور یقین حاصل ہو کہ ہمارے حالیہ عقاید اور تصوّارات بھی غلط نہیں ہیں؟ اور ایک دن وہ بھی باطل ثابت نہ ہوں گے؟ اور کیسے پتا چلے کہ جدید علمی دریافتیں بھی "بطلیموسی" نظام کی طرح ایک دن اسی بطلان کا شکار نہیں ہوں گی؟ یہاں تک کہ کئی بڑے مفکرین نے تو علم و دانش کی صحت کا سرے سے انکار کرتے ہوئے واضح لکھا کہ کس طرح یقین پیدا کریں کہ ایک دن "کیپلر اور کوپرنیکس" کے نظریات بھی باطل نہ ہوں گے؟

انہوں نے ایک بار پھر قبل از مسیح کے سوفسطائیوں اور شکاکوں کے شبہات کو نئے پیرائے میں بیان کرتے ہوئے ارتیابیت (Scepticism) کا بھرپور دفاع شروع کر دیا اور ساتھ ہی اسی زمانے میں فرانسس بیکن نے

اسی شکاکانہ ذہنیت کو دور کرنے کے لیئے تجربیت (Empiricism) کی بنیاد رکھی اور انسان میں ہر قسم کے فطری علم کی موجودگی کا انکار کیا۔ یوں سولہویں صدی کے شروع میں مغرب میں شکّیت (ارتیابیّت) اور تجربہ پسندی کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا (16)۔

'' میں شک کر رہا ہوں پس میں ہوں Cogito ergo sum ''، یہ جملہ تھا معروف فرانسیسی فلاسفر ڈکارٹ کا جس نے اس متزلزل فکری دور میں فلسفی مسائل کے حل کے لئے سر توڑ کوششیں کی، لیکن ڈکارٹ کی فطرت سے متعلق میکینکل فلسفی تفسیر (Mechanical Philosophy) اور فطری آگاہی کے تصوّر، اور ساتھ ہی اس زمانے کے حالات جن کے تحت عمومی طور پر علمی حلقے فلسفیانہ مسائل اور ماوراء طبیعت سے بے توجہ، صرف حسی اور تجربی علوم میں ذوق و شوق کا اظہار کر رہے تھے، نے یورپ میں کسی باقاعدہ تسلی بخش فلسفی مکتب کو وجود میں نہ آنے دیا۔ آہستہ آہستہ اس حسی اور تجربی علوم کے شوق نے افراطی شکل (Scientism) اختیار کر لی اور معروضی حقائق سے آگاہی کا معیار مادی و حسی تجربہ قرار پایا۔

فکر و نظر کے اس بنتے بگڑتے دور میں جب سترویں صدی میں کوپرنیکس اور کیپلر کے نظریات نیوٹن کے جدید نظریات نے توڑے تو ماوراء طبیعت اور روحانی اساس سے جدا تجربی علوم میں منہمک مفکرین کے لئے ایک اور زبردست دھچکا تھا۔ اس کے نتیجے میں مغربی معاشرے میں شکّیت کی تیسری لہر سترویں صدی کے اواخر سے اٹھارویں صدی تک حس اور تجربہ پرست تصوّر کے حامل تین انگریز فلاسفروں بالترتیب جان لاک، بارکلے اور ڈیوڈ ہیوم کے ذریعے ایک مرتبہ پھر اٹھی۔ ماوراء طبیعت پر شکوک اور شبہات میں رہتی کسر ہیوم کے بعد جرمنی فلاسفر ایمانویل کانٹ نے اپنے عینیّت (Subjectivism) کے نظریے سے پوری کر ڈالی۔

کانٹ کے نظریے کے مطابق علم محض اندرونی چیز ہے اور مکمل حقیقت کا کوئی ظاہری معیار نہیں ہے۔ اس کے بقول جو چیز آگاہی کے لیئے ذہن پر عکس باندھتی ہے یا ظاہر ہوتی ہے (Phenomenon)، اور جو چیز معروضی طور پر حقیقتاً موجود ہے (Noumenon)، ایک سی نہیں ہیں۔ اشیاء جس طرح موجود ہیں (Objective) اصلاً قابل شناخت نہیں ہیں۔ ساتھ ہی کانٹ نے کسی حد تک پایمال ہوتی اخلاقی اقدار کو زندہ کرنے میں اہم کردار ادا کیا مگر دوسری طرف فلسفہ ماوراء طبیعیت (Metaphysics) کی بنیادوں کو صفحہ ہستی سے مٹانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔

عصر حاضر کے امریکی مصلحت اندیشانہ مکتب (Pragmatism) کے جان ڈیوی جنہیں افلاطون اور ''روسو'' کے بعد تعلیم و تربیت کے میدان میں اہم ترین فلاسفر شمار کیا جاتا ہے، آگاہی کے بارے میں انکا تصوّر، ڈاوین

کے ارتقائی نظریّے (Evolution Theory) اور نفس شناسی پر مبنی ہے، ساتھ ہی تجرباتی فطرت (Empirical Naturalism) پر اعتقاد کے ناطے خدا، دین اور اخلاق کے منکر ہیں۔

در حقیقت نظریہ علم یا علمیات (Epistemology) اسی مغربی متزلزل ذہنیت اور شکّیت کی بناء پر یورپ میں ہی تشکیل پایا، جہاں مادی عقلیّت (Rationalism) نے بشری زندگی کی راہ و روش کی پہچان کے لئے وحی کی جگہ سنبھالی ہوئی ہے اور علم کی پوجا (Scientism) نے دین کی مخالفت کا پرچم بلند کر رکھا ہے۔ حتی خود عقل کو بھی ۱۷ اور ۱۸ صدی میں جو برتری حاصل تھی، وہ بھی ۱۹ اور ۲۰ ویں صدی کے بعد حس اور تجربہ پرستی (Empiricism) نے لے لی ہے۔ نتیجتاً آج مغرب میں حقیقی علم اور آگاہی کے حصول کا کوئی ایک معیار نہیں۔ کوئی حقیقت کو ہر وہ فکر قرار دیتا ہے جو انسان کے لئے مفید ہو، کسی کے نزدیک حقیقت حس اور تجربے سے ثابت ہونے والی آگاہی ہے، کسی کے نزدیک ہر وہ چیز جو عمومی طور پر ایک عقلمند قبول کرے حقیقت ہے، تو کہیں حقیقت ہر ایک کی فہم کے مطابق ایک اضافی (Relative) امر ہے (17)۔ خلاصہ یہ کہ جب معروضی حقائق کی یقینی معرفت کے حصول کے کوئی متفقہ باوثوق مبانی یا ذرائع ہی نہ ہوں تو انسانی تربیتی اصولوں کے وضع کرنے کا کونسا منبع اور طریقہ قابل اطمینان قرار پا سکتا ہے؟

۲۔۲) مغربی تعلیم و تربیت کے تصوّر کائنات سے متعلق مبانی:

مغرب زمین پر نشاۃِ ثانیہ (Renaissance) اور خاص طور سے جدیدیت (Modernism) کے دور میں کئی فلسفی مکاتب نے جنم لیا اور ہر ایک نے اپنے تصوّر کائنات کی تفسیر سے ملحدانہ تہذیب کے پھیلاؤ میں موثر کردار ادا کیا۔ جیسے ڈکارٹ اور اس کے طرف داروں کا عقل پسندانہ مکتب، بیکن، جان لاک، ہیوم وغیرہ کا حس اور تجربہ پرستانہ مکتب، بنتھام اور جان اسوارٹ میل کا خالص افادیت پسند مکتب یا کانٹ کا عینیت پسند مکتب جو عقل پرستی اور تجربہ پسندی کا آمیزہ ہے، ھیگل کا ڈایالیکٹک اور مارکس کا ملحدانہ مادی پرستانہ مکتب، ویلیام جیمز اور جان ڈیوی وغیرہ کا مصلحت پسندی کا مکتب یا کی کیگور کا وجودیت پرستانہ مکتب۔۔۔ ان میں سے ہر ایک نے مختلف زمان و مکان میں ظاہر ہو کر دین کی مخالفت اور ملحد تہذیب کے فروغ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

ان مکاتب کے باہمی اختلافات کے باوجود، جیسے ان میں سے بعض کے رہنما مذہبی تھے اور بعض کے مادہ پرست اور بعض موارد میں تو ان کے اختلافات انتہای بنیادی نوعیت کے بھی تھے، مگر سب کے سب ایک مسئلہ میں متحد اور متفق تھے، اور وہ کلیسا اور دین کی حکمرانی کی مخالفت تھی، چاہے جو اس منحرف عیسائی دین میں

اصلاح کے خواہشمند تھے یا دین کو خرافات اور معاشرے کے لئے نشہ قرار دیتے تھے، سب ہی نے ملحدانہ اور مغربی انسان پرستانہ تہذیب کے پھیلنے کے اسباب مہیا کیے (18)۔

آج یہی انسان پرستی اپنی جدید شکل میں انسان کے خدا کو خود انسان قرار دیتی ہے۔ یہاں تک کے مذہبی امور میں بھی اس طرح انسان پرستانہ تصورات کی تلقین کی جاتی ہے، کہ مرنے کے بعد تدفین کے موقع پر بھی دفن کے مراسم کے لئے ایسا لیٹریچر تیار کیا گیا ہے جس کی چھوٹی سی عبارت میں بھی خدا کی طرف اشارہ موجود نہیں۔ جدید دور کے انسان پرستوں نے انسان کی ابدی زندگی اور موت کے بعد حیات کے انکار جیسی کوششوں سے انسانی ضمیر کو صرف اسی چند سالہ زندگی تک محدود کرنے اور اسپر راضی رکھنا چاہا ہے اس تناظر میں انسان پرستانہ مکتب میں تعلیم وتربیت کا نظام اس کے اصول، طریقہ کار اور نصاب (Syllabus) ایک خاص شکل اختیار کر جائیں گے۔

تعلیم و تربیت کی حدود اس مادی جہان تک محدود ہو کر رہ جائیں گی، اور انسان کی مادی ضرور یات اور رجحانات کی سطح سے آگے نہ بڑھ پائیں گی۔ لہٰذا انسان اس طرح تعلیم حاصل کرے گا اور تربیت پائے گا کہ فقط اپنی ضروریات کی فراہمی اور اپنی ہر خواہش کی تسکین حاصل کر پائے اور یہی مغربی انسانی تعلیم وتربیت کے مراحل میں سب سے اعلی کمال کا مرحلہ ہے۔ مختصر یہ کہ مغربی تربیتی نظام کے ہستی شناسانہ تصورات میں انسان پرستی (Humanism) اور دین سے جدائی (Secularism) یا سیکولرازم دو اہم ترین محور ہیں۔ جنکا مختصر تعارف ذیل میں پیش کیا جارہا ہے (19)۔

الف: انسان پرستی (Humanism) :

انسان پرست، انسان اور اس میں موجود توانائیوں کی طرف افراطی توجہ کی بناء پر تمام الوہی اور ماوراء طبیعی اقدار کا انکار کرتے ہیں اور اس جہان ہستی کا محور اور معیار انسان کو قرار دیتے ہیں، دراصل انہوں نے انسان کو خدا کی جگہ لا بٹھایا ہے۔ یہ تصورات دراصل عہد وسطی میں بادشاہوں، زمینداروں (فیوڈلز) اور عیسائی پادریوں (علماء) کے ظالمانہ رویوں کے خلاف رد عمل کے طور پر ابھرے تھے۔ پہلے پہل اس تحریک کا آغاز ادبی اور ثقافتی حلقوں میں، عہد وسطی سے پہلے کے یونانی اور قدیم رومی ادب کی تجدید کے ذریعے انسانیت کو زندہ کرنے کے لئے ہوا، بعد کے مراحل میں اس ادبی تحریک نے سیاسی رنگ اختیار کیا اور پھر اگلے مرحلے میں دین، معنویت، وحی وآخرت اور کلیسا کی مخالفت کا رخ اختیار کر لیا۔

انسان پرستی کے تاریخی اعتبار سے مختلف معنی اور تفسیریں موجود ہیں اس تحریک نے پوری مغربی سرزمین کو متاثر کیا۔ انسان پرستانہ فکر کے درج ذیل اہم اصول ہیں:

۱۔انسان محوری　　۲۔انسانی آزادی اور اختیار پر تاکید
۳۔انسانی عقلیت پسندی پر افراطی عقیدہ　　۴۔فطرت پرستی (بجائے دین)
۵۔پلورالیزم (کثرتیت یعنی ہر انسان کا عقیدہ اسی کے لیئے درست ہے)

ب: سیکولرازم:

انگریزی زبان میں Secular بمعنی دنیوی دراصل لفظ Sacred یعنی مقدس (دین سے مربوط) کے مقابل ہے۔ لہٰذا سیکولر، یعنی جو کچھ اس جہان سے متعلق ہے اتنا ہی خدا اور الوہیت سے دور ہے۔ اصطلاحی معنی میں یہ عقیدہ کہ تعلیم وتربیت، اخلاقیات اور سیاست وغیرہ کو مذہب سے جدا ہونا چاہیے (20)۔
مغربی معاشرے کے صاحبان اختیار نے جدید تہذیب اور تمدن کی بنیادوں میں ایک طرف تو دین عیسائیت سے بے توجہی برتی تو دوسری طرف فکری اور نظری نظام کی تشکیل میں سیکولرازم کو اہمیت دی، اور سیکولرازم کی تقویت کا باعث بننے والے اصول اور قواعد بنائے جو دراصل مندرجہ بالا انسان پرستانہ تصورات کے ہی ثمرات ہیں۔ بطور مختصر سیکولرازم کی فکری اساس درج ذیل عناصر پر مشتمل ہے۔

۱۔انسان پرستانہ معیار　　۲۔عقلیّت پسندی (Rationalism)
۳۔علم محوری (Scientism)　　۴۔آزادی (Liberalism)
۵۔جدیدیّت بمعنی نفی دین (Modernism)

عصر حاضر میں جدید مغربی تہذیب یعنی لیبرل ڈیموکریسی کی تمام تر اساس یہی ہیومنزم اور سیکولرازم ہیں۔ لیبرالیزم ایک زمانے میں ظالمانہ حکمرانی کے خلاف اہم ترین نظریہ خیال کیا جاتا تھا لیکن انیسویں صدی میں لیبرل حکومتوں کے وجود میں آنے کے بعد معاشرے کے طاقتور طبقے کا ضعیف طبقے پر حکمرانی کے لئے ایک ہتھیار اور وسیلے کی شکل اختیار کر چکا ہے۔
مغربی تعلیم وتربیت کے تصوّر کائنات سے متعلق (ہستی شناسانہ) مبانی انہی بنیادی نظریّات کا ماحاصل ہیں۔ نتیجتا تربیتی امور پر حاکم اصول، اہداف اور طریق کار انہی مبانی کے بل بوتے پر تشکیل پاتے ہیں۔

۳۔۲) مغربی اخلاقیّت سے متعلق مبانی:

نظام اقدار یا اخلاقیّت سے مراد اخلاقی قواعد و ضوابط، معیار اخلاق، نظام اقدار (21)، یعنی انسانی طور طریقے اور اقدار کن بنیادی معیاروں یا مبانی پر تشکیل پائے ہیں۔ اقدار اور اخلاق کے مبانی کی مکمل وضاحت اور تفسیر

کے بعد ہی ایک جامع اور مستحکم بنیادوں پر تربیتی نظام تشکیل پا سکتا ہے جس کا براہ راست تعلق تعلیم و تربیت یا Education سے ہے۔

ایک معقول اخلاقی نظام کے حصول کے لئے ایک ایسا ہدف ضروری ہے جو ذاتاً قدر و قیمت رکھتا ہو۔ اس ہدف کے تعین میں جو اہم ترین مسئلہ ہے وہ انسان، اس کی قابلیت اور اس کے وجودی امکانیات کی پہچان ہے۔ گذشتہ مباحث میں مختلف مغربی مکاتب فکر کے جائزے میں واضحت کی گئی ہے کہ انسانی قدر و منزلت کا معیار اور پیمانہ ہر مکتب اپنے تصوّر کائنات اور تصوّر انسان کے اعتبار سے متعین کرتا ہے، مثلا بعض مکاتب انسان کو جب ایک حیوان کے مساوی دیکھتے ہیں تو بلند ترین انسانی ہدف بھی حیوانات کے ہدف حیات کے مساوی قرار دیتے ہیں، یا جب اس جہان میں مادہ پرستانہ تصورات سے زیادہ معرفت کو ممکن نہیں سمجھتے تو انسانی ہدف بھی ان کامادیات سے بڑھ کر متعین نہیں ہو سکتا۔

یہی وجہ ہے عصر حاضر کے معروف ترین امریکی ماہر تعلیم اور عملیت پسند فلسفی جان ڈیوی تعلیم و تربیت کا ہدف ایک جمہوری شہری کی تیاری قرار دیتے ہیں۔ جان ڈیوی کے انسان سے متعلق نظریات ڈارون کے ارتقائی نظریے اور میکاولی کے ہدف کی خاطر ہر وسیلے کی مشروعیت کے نظریے سے متاثر ہیں۔ یہی وجہ ہے اپنے آپ کو جمہوری فلسفی کہلانے والے جان ڈیوی معاشرے کی ہر مشکل کا حل تحقیق اور سوچ بچار کے ذریعے حل کرنے کے معتقد ہیں۔ اور ہر اس چیز کو جو ہدف تک پہنچنے میں مدد کرے اسے اپنی نظر سے قبول کرتے ہیں۔ مثلا خدا کو ایک ماورائے طبیعت الوہی وجود کے قبول نہیں کرتے، لیکن خدا کا معنی آئیڈل (تخلیل پرستی) اور عمل کے درمیان موجود رابطے کو قرار دیتے ہیں۔ لہٰذا خدا کے لفظ کو انسان کے قابل حصول اہداف اور تخیلات کی وحدت کے معنی میں قبول کرتے ہیں (22)۔

نتیجتاً اگر کسی مکتب کے، انسان کے بارے میں بلکہ ہستی کے بارے میں فکر و نظر مستحکم اور پائیدار بنیادوں پر مبنی نہ ہو تو اس کے اخلاقی نظریات بھی کمزور اور بے ثمر ہوں گے۔ اسی لئے مختلف اخلاقی مکاتب میں سے ہر ایک نے انواع واقسام کے اخلاقی اقدار کے نظام میں ہماہنگی پیدا کرنے کے لئے جو ایک مرکزی محور اخلاق پیش کرنے کی کوشش کیں ہیں، اس میں انہیں کوئی خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ حتی اب تک پیش کئے گئے محوروں میں سے کوئی ایک بھی محور صرف اسی مکتب کی تمام اقدار کو اس محور سے ہماہنگ نہیں کر پایا۔ مثلافردی یا سماجی خواہشات یا شخصی اور اجتماعی لذّات یا مفادات وغیرہ میں سے کسی ایک کو بھی اخلاقیات کا اصل معیار اور محور مانا جائے، تو ان میں سے کوئی بھی یہ قابلیت نہیں رکھتا کہ تن تنہا ایک ثابت معیار قرار پا سکے۔

اسی لئے ان مکاتب کے مفکرین اور پیروکار اس معیار کے جو مصداق پیش کرتے ہیں ان میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے، اور شرایط کی تبدیلی کے ساتھ تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ ان کا اطلاق کسی معروضی حقیقت اور سچائی پر نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے مغربی معاشرے میں اخلاق کے معیار بغیر کسی سہارے کے اور ہر علاقے کی شرایط اور افراد کے ارادے کے تابع ہیں، یعنی اخلاق ایک اضافی اور نسبتی مفہوم ہے (23)، جس کا لازمی نتیجہ تربیت کے غیر معین اصولوں پر مرتب ہوگا۔

۴۔۲) مغربی تعلیم و تربیت کے تصوّر انسان سے متعلق مبانی:

مجموعی طور پر انسان شناسی انسانی ماہیت اور ذات کی پہچان، نظام کائنات میں انسان کے مقام، انسان کے وجودی پہلوؤں، قابلیتوں، توانائیوں، رجحانات اور معلومات جیسی مباحث پر مشتمل ہے۔ انسان کے اس عالم میں ممتاز اور عظیم کردار کی بنا پر اس کی شناخت اور پہچان اہم ترین امور میں سے ہے۔ ساتھ ہی علوم انسانی اور خاص طور سے تعلیم و تربیت کا موضوع ہونے کے ناطے انسان شناسی کی اہمیت دو چندان ہو جاتی ہے۔ ہر تربیتی مکتب کے انسان شناسانہ مبانی اس کے تصوّر کائنات (جہان بینی) سے منسلک ہیں۔ اور ہر جہان بینی اور نظری اور فکری نظام کی قدر و قیمت اس جہاں بینی اور فکری نظام کے حیات انسانی پر اثرات اور اس سے تشکیل پانے والی اقدار سے وابستہ ہے۔ اس درمیان انسانی ذات سے متعلق مسائل کا جواب انسان شناسانہ مبانی کے دائرے میں آتا ہے۔

عصر حاضر کی مغربی تہذیب میں تعلیم و تربیت کے انسانی ماہیت اور حقیقت سے متعلق مبانی ان کی تجربیّت اور حسیّت (Empiricism) پر مبنی طریقہ کار پر منحصر ہے۔ انسانی تعلیم و تربیت کے موضوع پر نفسیاتی علوم کی بھر مار ہے جن کا نظری اور فکری انحصار انسان پرست اور مادہ پرست فلسفیوں کی آراء اور نظریات پر ہے، جن کی اکثریت ماورائے طبیعت اور کسی الوہی نظام پر اعتقاد نہیں رکھتی۔ لہٰذا اس مادہ پرستانہ نگاہ میں ایک جہتی انسان کی ماہیت زمینی، زندگی زمینی اور اسکا اختتام اور ہدف بھی زمینی ہے۔ اسی تصوّر کی بدولت مغربی انسان شناسی (انتھروپولوجی) انسان کے جسمانی اور تمدنی حالات کی بحث تک ہی محدود ہے، اور اس کا غیر جسمانی، روحانی اور الوہی پہلو مورد بحث قرار نہیں پاتا۔

عصر حاضر کی مغربی تعلیم و تربیت کے پیچھے عہد وسطیٰ کے بعد کے ڈکارٹ کا مادی جسمانی انسانی تصوّر، جان لاک کی انسانی میکانیکی تفسیر، جرمن بوخند اور ہیگل کی مادہ پرست انسانی تفسیر، کانٹ، شلینگ، شوپنہاور وغیرہ کے رمانوی نظریات، جن کی ابتداء جان ژاک روسو نے کی اور بعد میں فرویڈ اور آڈلر کے "ناخودآگاہ ضمیر"، پاولوف اور واٹسن کے انسانی اور حیوانی حرکات و سکنات کا مشترکہ مطالعہ (24)۔۔۔ وغیرہ میں انسان کی ایک مشینی پرزے سے لے کر دیگر حیوانات جیسے برہنہ بندر (Naked ape) تک جیسی ماہیت اور ذات والی مختلف تفسیریں موجود ہیں۔

لیکن انسانی علوم میں ان تمام تر مختلف تفسیروں کے باوجود انسان اور کائنات کے بارے میں ایک اشتراک اور وحدت پائی جاتی ہے، اور وہ ہے انکی انسان پرستانہ (Humanistic) اور مادہ پرست (Materialistic) تفسیر تک محدودیت اور روحانی اور الوہی جہت (میٹافزکس) سے مکمل غفلت۔ اختصار کی وجہ سے جن مکاتب فکر کا فقط اس پورے جائزے میں نام لینے پر اکتفاء کیا ہے قارئیں ان مکاتب فکر کے مفکروں اور فلسفیوں کے انسان کے بارے میں نظریات کا مطالعہ کریں، حتی ان مکاتب کا بھی جو دینی رنگ لئے ہوئے ہیں، ذرا دیکھیں کہ ان کے انسان کی ماہیت اور حقیقت کے بارے میں کیا تصورات ہیں (25)۔

اسلامی تعلیم وتربیت کے فلسفی مبانی

مکتب اسلام کے بارے میں اگر کہا جائے کہ تعلیم و تربیت اس کے اساسی ترین امور میں سر فہرست ہے، تو کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔ قرآن کریم میں تزکیے اور تعلیم کو انبیاء کی بعثت میں شامل امور میں سے سر فہرست قرار دیا گیا ہے۔ اور تین مقامات پر (26) اس طرح فرمایا:

هوَالَّذِی بَعَثَ فِی الْأُمِّیِّینَ رَسُولًا مِنْهُمْ یَتْلُوعَلَیْهِمْ آیَاتِهِ وَیُزَکِّیهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْکِتَابَ وَالْحِکْمَةَ۔

یعنی: ''بعثت انبیاء لوگوں کے تزکیے (روحانی تربیت) اور تعلیم و حکمت کے لئے ہے۔''

یعنی جب انسان اپنا تزکیہ شروع کرے گا تو اسے حقیقی علم اور حکمت حاصل ہو گی، جو سراسر نور اور ہدایت ہے۔ تمام تر انسانیت کے لیئے یہی انبیاء کی بعثت کا ہدف ہے کہ انسانیت اپنے معبود کا قرب (تزکیے اور تربیت سے) اختیار کرے اور یہ قرب صرف واجبات عبادی کے ذریعے ہی نہیں، بلکہ انسانیت کی ہر خدمت کے ہمراہ حاصل ہو سکتا ہے۔ لہٰذا تعلیم دراصل تربیت (تزکیہ) ہے، اور ایک تزکیے کا حامل، تربیت حاصل کیا ہوا انسان ہی معاشرے کی بہترین خدمت کر سکتا ہے۔

تعلیم وتربیت کے ضمن میں اسلامی مکتب اتنا عمیق اور حکمت آمیز ہے کہ اسکے اپنے مخصوص الفاظ، موضوعات اور اصطلاحیں ہیں۔ ان کا اسلامی تہذیب اور تعلیمات سے اتنا گہرا تعلق ہے کہ اگر انہیں اسی اسلامی تعلیمات اور ثقافت کے دائرے اور تناظر میں نہ سمجھا جائے تو انکا مترادف دنیا کی کسی دوسری زبان میں ملنا ناممکن ہے۔ حتی جو الفاظ جن پیرائے میں اسلام نے عربی زبان کے انتخاب کرکے استعمال کئے ہیں ان کے معانی اور مفاہیم اسلامی تعلیمات میں جذب ہونے کے بعد عرب جاہلانہ دور کے استعمال سے بھی مختلف ہو گئے ہیں۔

اسی قسم کے وسیع مفاہیم لفظ عقل، جہل، تذکیہ، حکمت،...وغیرہ اور ہر اس لفظ کے بارے میں جو اسلام میں اپنی تعلیمات اور مفاہیم کے لئے انتخاب ہوئے ہیں، بھی ملتے ہیں۔ لہٰذا اسلامی تعلیمات میں تعلیم و تربیت

جیسی اہم ترین بحث کے بیان کے لئے جو مخصوص الفاظ قرآن اور روایات میں استعمال ہوئے ہیں ان کا تفصیلی اور گہرا مطالعہ کرنے کی اشد ضرورت ہے تاکہ اسلامی نظام تربیت کی تلاش اور جستجو میں ہر قسم کی لغزشوں سے امان میں رہیں (27)۔

اس مختصر تشریح سے سمجھ سکتے ہیں کہ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں اسلامی تعلیم وتربیت کے مبانی بیان کرنا کوئی آسان کام نہیں، جو انسانی روحی اور نفسیاتی رازوں، انسانی ماہیت، انسانی جذبات، رجحانات اور احساسات؛ عورت اور مرد کی ذات اور شخصیت کے ایک دوسرے سے فرق، ان کی فطری ضروریات اور مشکلات سے آشنائی، ان کے نشوونما کے مختلف مراحل اور ہر مرحلے میں تاثیر حاصل کرنے کی استعداد، انسانی وجود میں پرستش اور ماوراء طبیعت ادراک کا نظام واضح کریں۔ یہاں تعلیم وتربیت سے متعلق فلسفی مبانی کا اسلامی نکتہ نگاہ سے جائزہ پیش کریں گے۔

۱۔۳) اسلامی تعلیم وتربیت کے علمیاتی مبانی:

اسلامی فلسفے میں عقل کے پائیدار اور غیر متزلزل مقام کی بناء پر علم اور آگاہی سے مربوط مسائل کسی منظّم صورت میں علیحدہ عنوان کے تحت بیان نہیں کئے گئے، بلکہ آگاہی سے متعلق بعض مسائل فلسفے اور منطق کی کتابوں میں ہی مختلف ابواب میں ضرورت کے لحاظ سے زیر بحث لائے گئے ہیں۔

لیکن آج کل جبکہ مغربی ثقافت اور خاص طور پر وہاں علم سے مربوط مباحث ہمارے معاشروں میں پوری طرح سرایت کر چکی ہیں اور الوہی فلسفے کے بہت سارے مسلمات پر انہوں نے اعتراضات کی بوچھاڑ اور انکار تک کر رکھا ہے، تو ہمیں بھی اپنی فلسفی مباحث کو انہی کی زبان میں جواب کے لئے روایتی طرز فکر سے ہٹ کر نئے پیرائے میں بیان کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ ایک تو اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ دوسرے مکاتب سے میل جول سے خود ہم اپنی گراں بہا اسلامی تعلیمات کو مختلف پہلوؤں سے مقابلے اور اعتراضات کے مدلل اور ٹھوس جوابات کے لئے پیش کر سکیں گے جو علمی رشد اور ترقی کا باعث ہے، اور دوسرا ہم اپنے اس روشن فکر طبقے کے لئے جو مغربی افکار اور تصورات کے زیر سایہ نئے نئے اعتراضات اور نظریوں سے آشنا ہوئے ہیں، اسلامی تعلیمات اور خاص طور سے اسلامی فلسفے کو ان نئی جہتوں سے روشناس کروا کر انہیں اسلامی تعلیمات سے بدظن اور دور ہونے سے بچا سکتے ہیں۔

علمیات یا نظریہ علم (Epistemology)، جیسے کہ پہلے بیان کیا گیا، یہ موضوع انسان سے متعلق اس کے تصوراتی نظام اور معروضی حقائق کے رشتے کے بارے میں آگاہی یا پہچان کے بارے میں علم ہے۔ اس علم میں انسانی آگاہی (معرفت) اس کی قدر و قیمت اور درستی یا نادرستی کے معیار تعین کرنے سے متعلق مباحث شامل ہیں (28)۔

انسان کو اس جہان عالم کے معروضی حقائق کشف کرنے کے لئے یقینی علم اور آگاہی کی ضرورت ہے، جو نہ صرف اس کے عقل و شعور میں اضافے کا باعث بنتا ہے بلکہ اس کے لئے حقیقت بھی مکمل طور پر عیاں ہوتی ہے۔ اسلامی تعلیمات قرآن اور حدیث کی روشنی میں اور اسی طرح بیدار انسانی فطرت اس اہم نکتے کی طرف راہنمائی کرتے نظر آتے ہیں کہ انسان کو معروضی حقائق کے بارے میں علم اور آگاہی کے لئے صرف حسی، سطحی اور ظاہری معلومات پر اکتفاء نہیں کرنا چاہیے جس کا اکثر و بیشتر نتیجہ لاادری گری اور شکّیت (ارتیابیت) کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ بلکہ حس، تجربے، عقل و معقولات، تاریخ، روایات، سنت، وحی اور قرآن کے ظاہر اور باطنی تمام وسائل کو اپنی آگاہی کے لئے استعمال کرنا چاہیے، کیونکہ یہ تمام منابع انسانی فکر و نظر کی تعمیر اور ہدایت کے لئے موثر ہیں۔

البتہ ان تمام وسائل میں کوئی بھی وحی اور نبوت کے ذریعے حاصل ہونے والے علم اور آگاہی جیسے یقین اور اعتماد کی منزل تک نہیں پہنچتا۔ ان تمام علمیاتی وسائل میں سے فقط وحی ہے جو ہر قسم کی خطا اور لغزش سے مبراء ہے (29)۔ وحی اور اس کے ساتھ عقل، اسلامی علمیات سے متعلق مبانی کے اہم ترین اور مخصوص ارکان ہیں۔ اس کی دلیل قرآن میں عقل اور فکر پر کی گئی تاکید ہے، جو مغرب کے "دین اور عقل" یا "وحی اور عقل" کے تعارض اور اختلاف کے تصوّر کے برعکس ہے۔ کیونکہ مغربی دین منحرف عیسائیت ہے، جس کے انحراف سے عہد وسطیٰ کے تقریباً ۱۰۰۰ سال انسانیت سوز مظالم اور عقل کی شدید مخالفت سے بھرے ہوئے ہیں۔ اس منحرف دین کا جو عقل کا مخالف ہے اور دین اسلام جو عقل اور فکر و نظر کی تاکید کرتا ہے، کا آپس میں کوئی تعلق نہیں۔ لہٰذا اسلام عقل کی پرورش اور نشوونما کے لیئے اور اسے انحراف اور خطا سے محفوظ رکھنے کے لئے وحی کے ذریعے اس کی رہنمائی کرتا ہے۔

اس بحث سے واضح ہے کہ دین مبین اسلام میں معروضی حقائق اور حقیقت سے مربوط علم کا امکان ایک یقینی امر ہے۔ اس کا تعلیم و تربیت پر انتہائی مثبت اور مفید اثر مرتب ہوتا ہے، کیونکہ جتنا انسانی شعور اور آگاہی مکمل ہو گی اتنا ہی اس کی حقیقت تک رسائی کا امکان زیادہ ہوگا اور جس قدر وہ حقیقت سے نزدیک ہوگا اس کا خداوند سے معنوی اور روحی رابطہ بڑے گا اور اس کے نتیجے میں حقیقی تربیت کے لئے بہترین اور زیادہ مساعد مواقع فراہم ہوں گے (30)۔ اسلامی علمیات کے مندرجہ ذیل اہم پہلو ہیں؛

الف: حقیقی دین کی پہچان اور اس راہ میں تربیت:

جب یقینی علم ممکن ہو، تو اس کے نتیجے میں ایک حقیقی دین کی پہچان بھی ممکن ہے اور اس دین کی حقانیت پر ایمان بھی لایا جاسکتا ہے۔ پس اسلامی تعلیم و تربیت کے نصاب اور نظام کی تشکیل ایک دین کی بنیاد پر ہے جو حق

ہے اور دیگر تمام ادیان سے برتر اور خاتم ادیان اور مکمل ترین دین ہے اور ہر قسم کی ارتیابیت، اخلاقی اضافیّت (Ethical Relativism) اور دینی کثرتیّت (Religious Pluralism) کی نفی کرتا ہے۔

ب: تعلیم وتربیت میں وحی کا کردار:

جیساکہ مقدمے میں بیان ہوا خداوند تعالی نے اپنے منتخب پیغمبروں کی تربیت کا ذمہ خود اٹھایا اور انہیں وحی اور نبوت کی بھاری ذمہ داری اٹھانے کی توفیق اور صلاحیت عطا فرمائی تاکہ خداوند کے بتائے دستورالعمل کے ذریعے اس کے اولیاء اور بندوں کی تربیت کر سکیں اور یہی سلسلہ آگے چلتا رہے۔اس لحاظ سے اسلامی تعلیم وتربیت کے علمیاتی اصول اور مبانی مختلف جہتوں سے وحی اور نبوت پر منحصر ہیں اور پیغمبروں کی تعلیمات نہ صرف تعلیم و تربیت کے نظام اور (نصاب) کو الوہی اور دینی بناتی ہیں بلکہ تعلیم وتربیت کے حصول کے جذبے، جہت اور ماہیت کو بھی خدایی رنگ عطا کرتی ہیں اور تربیت یافتہ انسان کے لئے دنیا اور آخرت کی سعادت کی ضمانت فراہم کرتی ہیں۔

۲۔۳) اسلامی تعلیم وتربیت کے تصوّر کائنات سے متعلق مبانی:

خدا شناسی اور خدا اور قیامت پر یقین اسلامی تعلیم و تربیت کے تصوّر کائنات سے متعلق مبانی میں بنیادی ترین اور ناقابل تردید محور ہے۔ 'اُس' سے اور 'اسی' کی طرف؛ انا للہ وانا الیہ راجعون؛ اس ساری بحث کا خلاصہ ہے۔ لہٰذا تعلیم و تربیت کے تمام قاعدے، قوانین اور معیار اس کے تشریعی ارادے کے تحت انسان کے لئے تربیت و تزکیے کے ساتھ اس کی طرف پلٹنے کے لئے ہیں۔

اسلامی تصورات کائنات کا تقاضہ ہے کہ تمام ہستی کو خدا تعالی کی مخلوق اور حقیقی و تکوینی مالکیت مانیں۔ اسلامی نکتہ نظر سے اعتقادی نظام، تربیّتی اور اخلاقی نظام سے جدا نہیں ہے۔ بلکہ اعتقادی نظام، تربیتی اور اخلاقی نظام کا مبداء اور منشاء ہے۔ لہٰذا خداوند متعال جو تمام کائنات اور عالم ہستی کے حقیقی مالک اور تکوینی اور تشریعی رب ہیں، کی اجازت کے بغیر ہم کسی بھی قسم کی شیء یعنی اپنے اور دوسرے انسانوں سمیت، کسی پر کسی بھی قسم کا تصرف اور دست اندازی نہیں کر سکتے۔اس بحث کا خلاصہ مندرجہ ذیل چار اہم امور ہیں۔(31)

۱۔ حیات بخش خالق واحدِ کائنات　　۲۔انسان کا وابستہ وجود

۳۔ تمام امور میں خدا محوری　　۴۔ قیامت پر اعتقاد

پس بطور خلاصہ اسلامی تعلیم وتربیت کے تصور کائنات سے متعلق مبانی اس نظام کو ایک طرف تو مبداء سے مربوط کرتے ہیں، یعنی ربّ و خالق واحد سے، اور دوسری طرف چونکہ خداوند تعالی نے اس جہان اور انسانوں

کو ایک خاص مقصد کے تحت خلق کیا ہے تو معاد سے جوڑتے ہیں۔ چونکہ انسانی حیات کی آخری منزل اور تمام افعال کہ حد قیامت ہی ہے تو اس کے نتیجے میں اس نظام حیات کا ''الوہی حکمت'' سے ناطہ جوڑتے ہیں۔ الوہی حکمت کا تقاضہ یہی ہے کہ ایک مکمل نظام برقرار ہو اور انسان اس طرح تربیت ہوں اور ایسی سمت اختیار کریں کہ بہترین انفرادی اور اجتماعی کمالات متحقق ہوں۔

یوں اسلامی تربیتی نظام، اسلامی تصور کائنات کے ساتھ خاص طور سے اس کے نظام زندگی سے اس طرح جڑا ہوا ہے کہ خداوند تعالی کا حقیقی وجود تمام زندگی کے ہر ہر پہلو میں اور خاص طور سے تعلیم و تربیت میں نمایاں طور سے ہدایت، تربیت، راستہ متعین کرنے اور اس کو رخ دینے میں نظر آتا ہے۔

۳۔۳) اسلامی تعلیم و تربیت کے نظام اقدار سے متعلق مبانی:

تعلیم و تربیت ان امور میں سے ہے جن کا براہ راست تعلق انسان سے ہے اس ناطے تعلیم و تربیت کے مبانی میں سے ایک، حقیقی الہی اقدار (اخلاق) کی پہچان ہے جس کا تربیتی اصولوں پر گہرا اثر پڑتا ہے۔ ایک صحیح اخلاقی نظام کی تشریح اور علم اخلاق کے مبانی کا جائزہ اور تشریح فلسفہ اخلاق میں بیان کی جاتی ہے اور تربیتی قواعد اور اصولوں اور اہداف متعین کرنے میں اس کا انتہائی اہم کردار ہے (32)۔ اسلامی نظام اقدار گو کہ انسان شناسی کی مباحث سے جدا نہیں (33) ہے اور اسلامی تعلیم و تربیت کے انسان شناسانہ مبانی نظام اقدار کی بحث سے کسی طرح مبرا نہیں، لیکن چونکہ مغرب زمین کے اہم فلسفی مکاتب اخلاقی اضافیت (Moral Relativism) کا پرچار کر رہے ہیں، جس کی وجہ سے اخلاقیات کی بحث کو انسان شناسانہ مبانی سے جدا بیان کیا جا رہا ہے۔ بطور مختصر یہاں دو اہم موارد قابل بحث ہیں:

الف: اقدار کا حقیقی اور غیر حقیقی ہونے کا معیار　　**ب:** اضافیت اخلاق

الف) اقدار کا حقیقی اور غیر حقیقی ہونے کا معیار (34)

فلسفہ اخلاق کی اہم ترین مباحث میں ایک یہ ہے کہ اخلاقی جملوں کی حقیقت ان کا اخباری جملے (Declarative) ہونا ہے یا انشائی جملے (Imperative) ہونا؟

یعنی مراد یہ ہے کہ، کیا اخلاقی جملے معروضی حقائق کی بنا پر بیان کیے جاتے ہیں، حتی اگر وہ انشائی جملوں کی صورت میں بھی ہوں؟ یا اخلاقی جملوں کی حیثیت صرف انشائی ہے اور ان جملوں کو بولنے والے کے مطمع

نظر کوئی معروضی حقائق نہیں ہوتے حتی اگر ان جملوں کو خبری انداز میں بیان کریں؟ بلکہ ان کا منشا بولنے والے کے رجحانات اور خواہشات کے سوا کچھ نہیں۔

مثلاجب کوئی کہتا ہے کہ ''جھوٹ نہ بولیں''، یا ''جھوٹ نہیں بولنا چاہیے''، تو کیا اس جملے یا قول کے پیچھے کوئی حقیقت پوشیدہ ہے؟ یا بولنے والے نے انفرادی، ذاتی، سماجی یا دیگر مفادات کے مد نظر یہ جملے کہے ہیں؟

یہاں اس بحث کے دو طرح جواب دیئے جا سکتے ہیں۔ ایک تو مربوط ہو جائے گا انسان شناسی سے، یعنی انسان کو اگر صرف ایک مادی موجود خیال کیا جائے اور اس کی کسی بھی قسم کی دوسرے جہتوں اور رابطوں کی نفی کی جائے، تو اس ایک جہتی انسان کے لئے ان جملوں کے پیچھے کسی بھی قسم کے معروضی حقائق اور بیرونی حقیقت کو ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اس انسان کو اگر دو جہتی موجود، مادی جسم اور مجرد روح کی حیثیت سے تصوّر کیا جائے تو ان جملوں کی معروضی حقیقت اس کی روح سے منسلک نظر آئے گی۔

مغربی شکّاکانہ افکار اور تصورات میں انسان ایک مادی جسم کے سوا کسی دیگر وجود کا حامل نہیں مانا جاتا، تو اس صورت میں اخلاقیات کا عدمیّت (Nihilism) کے علاوہ اور کوئی نظام تشکیل نہیں پا سکتا۔

دوسرا جواب انسانی پہلوؤں کے بجائے، اس کے اہداف سے مربوط ہے، کیونکہ اخلاقی مسائل انسان کی اختیاری حرکات و سکنات سے مربوط ہیں، اس لیئے جب وہ کسی عمل کو اختیار کرتا ہے تو لازمی طور سے اس اختیار اور ارادہ کے پیچھے کوئی ہدف موجود ہوتا ہے جو اسے اس عمل کی طرف رغبت دلاتا ہے۔ لہٰذا اس کی حرکات و سکنات، افعال و کردار کی قدر بھی اس ہدف کے تحت متعین ہوتی ہے، ہدف جتنا بلند اور اعلیٰ ہو گا اتنا ہی اس تک پہنچنے کا وسیلہ جو انسانی کردار ہے، باارزش اور قابل قدر ہو گا۔

ہدف کا تعین اور انتخاب ہمارے اس مسئلے کا حل ہے۔ آیا وہ ہدف جس کے حصول کے لئے انسان کوشش کرتا ہے صرف اپنی طبیعت، دنیوی اور حیوانی خواہشات کی تکمیل ہے؟ یا سماجی مفادات اور مصلحتوں کے تابع ہے، اور معاشرے میں بد نظمی سے پرہیز کے لئے ہیں؟ یا دنیوی مفادات کے ہمراہ معنوی اور روحی کمال اور ابدی خوش بختی اس کا ہدف ہے؟

مادہ پرست انسان کی مادی عقل ہر قسم کے نظام اقدار اور اخلاقی اصولوں کے تعین کے لیئے پہلے دو سوالوں کے جواب تہیہ کرنے کی تگ و دو میں مشغول عارضی قرار دادیں منعقد کرتی نظر آتی ہے۔ جبکہ مبداء و معاد (خدا و قیامت) سے جڑے، مادے کے علاوہ روحانی انسان کی وحی کے زیر سایہ قدسی عقل نظام اقدار اور اخلاقی اصولوں کے تعین کے لیئے آخری سوال کے جواب کو تلاش کرتی نظر آئے گی۔ یوں دنیوی اور حیوانی خواہشات یا

سماجی مفادات سے ہٹ کر معنوی اور روحی کمال اور ابدی حیات کے حصول کے معیار اس کے اقدار اور اخلاق کے نظام کو متعین کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ اسلامی نظام اقدار اور اخلاقی اصولوں کے معیار اور بنیادیں قابل استدلال عقلی برہان ہیں۔ البتہ اس ضمن میں مکمل بحث کا فلسفہ اخلاق میں تفصیل سے جائزہ لیا جا سکتا ہے جو یہاں ممکن نہیں۔

ب) اضافیّتِ اخلاق:

اخلاقی اضافیت بھی فلسفہ اخلاق کی اہم ترین بحثوں میں سے ہے۔ جس کے کئی اہم فکری اور عملی نتائج سامنے آتے ہیں۔ اخلاقی جملوں کو انشائی قرار دینے اور انہیں انسانی خواہشات اور رجحانات سے اور سماجی قرار دادوں (Social Contracts) سے منسوب کرنے کے نتیجے میں نظام اقدار میں اضافیّت کا نظریہ وجود میں آیا ہے۔ البتہ اس کا بڑا واضح جواب موجود ہے جو اسلامی مکتب فکر کے فلسفیوں نے انتہائی مدلل انداز میں فلسفہ اخلاق کے تحت پیش کیا ہے۔ مختصراً یہ کہ مسئلہ اخلاق کی نسبت دو طرح کی فکر اور نظر موجود ہے (35)۔

الف: اخلاق انسان کی ایک ذاتی حقیقت اور ضرورت کی حیثیت سے۔

ب: اخلاق انسان کی ذات سے ہٹ کر ایک بیرونی حقیقت۔

جو کوئی اخلاق کو انسان کے لئے ایک ذاتی حقیقت کی حیثیت سے تصور کرتا ہے، تو وہ انسانی ذات پر حاکم قواعد کے تناظر میں اخلاقی نظام کی شناسائی اور اخلاقی مسائل، اصول اور معیار کو بغیر زمان اور مکان اور دیگر شرایط کی تاثیر کے بیان کرے گا۔ پھر انسانی صفات اور کردار کو اخلاقی لحاظ سے اچھے اور برے اعمال میں تقسیم کرے گا۔ جبکہ جو کوئی اخلاق کو انسانی ذات سے ہٹ کر مد نظر قرار دیتا ہے، تو وہ اخلاقی نظام کو اپنے اندر موجود قابلیت، رجحانات، خواہشات، سماجی مسائل، ثقافت، رسم و رواج اور مکان اور زمان میں حاکم شرایط کے ساتھ اپنائے گا اور ایسے نظام میں مادی قدروں کے سواء کوئی قدر اور تجربی بنیادوں کے سواء کوئی بنیاد باقی نہیں رہتی۔ اکثر مغربی مکاتب فکر کے مبانی اور نظری بنیادیں اسی لئے متزلزل اور متغیر ہیں، سیکولرزم اور پلورلزم (کثرتیت) انہیں تجربی اور مادہ پرست فکری تصوّرات کا ماحاصل ہیں، اور ان کا نتیجہ عدمیت (Nihilism) اور اخلاقی انحطاط ہے، جس کا آج کل مغرب کو شدت سے سامنا کرنا ہے۔ اس اخلاق میں خیر و شر کا کوئی مستقل معیار نہیں کردار کے حسن و قبح کے لئے کوئی اصول نہیں، ہر چیز اضافی اور عارضی ہے، جبکہ دین اسلام اخلاقی کثرتیت (Ethical Pluralism) کو شدت سے جھٹلاتا ہے۔ آل عمران آیہ ۸۵ میں خداوند متعال فرما رہا ہے: "وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ" یعنی: "اور جو

اسلام کے علاوہ کوئی بھی دین تلاش کرے گا تو وہ دین اس سے قبول نہ کیا جائے گا اور وہ قیامت کے دن خسارے میں ہوگا۔"

بے شک ایک صحیح اور قابل قبول اخلاقی نظام کے ہی زیر سایہ ایک تعلیمی اور تربیتی نظام کو مرتب کیا جا سکتا ہے، تا کہ جو بھی اس اخلاقی نظام کی ضروریات ہوں وہ تعلیم و تربیت میں شامل کرکے انسان کو اس کی انسانیت کے کمال تک پہنچنے کے لئے رہنمائی فراہم کی جاسکے۔

۴۔۳) اسلامی تعلیم وتربیت کے تصوّر انسان سے متعلق مبانی:

دنیا میں موجود ہر تربیتی مکتب انسان کی خلقت کے ہدف اور اس کے اعلیٰ ترین کمال کے بارے میں اپنی ایک مخصوص فکر اور نظر رکھتا ہے، اور اسے انسانی تعلیم وتربیت میں ملحوظ رکھتے ہوئے اپنے تربیتی نظام کو تشکیل دیتا ہے۔ تعلیم وتربیت کا موضوع چونکہ انسان ہے، اس لیئے انسان شناسی تعلیم وتربیت کے اہم ترین مبانی کی حیثیت رکھتی ہے۔

اسلامی تربیتی مکتب میں انسان کی تربیت ایک انتہائی مقدس اور الوہی امر ہے۔ انسان مختلف طریقوں اور راستوں سے تربیت پا کر خداوند متعال کی حقیقی جانشینی کا اہل قرار پاتا ہے۔ وہ مقام جس سے بڑھ کر مقدس مقام انسان کے لئے کسی اور مکتب میں قابل تصور نہیں، اس سلسلے میں انسانی قدر و قیمت، انسانی فطرت اور انسانی خواہشات اور شعور کے مرتبوں کے بارے میں مسائل، اسلامی تعلیم و تربیت کے انسان شناسانہ مبانی میں زیر بحث آتے ہیں۔ اس تناظر میں یہاں انسان کی اسلامی نکتہ نگاہ سے حقیقت، ماہیت اور اس کی قابلیتوں اور خصوصیات کو صرف عنوان کے حد تک بطور مختصر بیان کریں گے (36)۔

الف: اسلام کی نظر میں انسان کی حقیقت:

انسان صرف ایک مادی جسم نہیں، بلکہ طبعیت اور ماورائِ طبعیت کا مرکب ہے۔ کیونکہ انسانی فطرت میں جمادات، نباتات اور حیوانات میں موجود عناصر سے بڑھ کر ایک عنصر موجود ہے، جو اس کی دیگر موجودات پر برتری اور قابلیت کا غماز ہے۔ جس کی بنا پر وہ اس کائنات کی تمام مخلوقات کو مسخر کرنے پر قادر ہے اور یہ برتر عنصر بدن کے مٹ جانے کے بعد بھی باقی اور ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔ انسانی وجود میں موجود، مادے سے برتر اسی عنصر کا ظہور اور نشو و نما ہی اس بات کا باعث بنتا ہے کہ انسان کا مقام اور مرتبہ دوسری تمام مخلوقات کے مقابلے میں نمایاں اور برتر جلوہ گر ہو۔

ب: انسانی ذات اور ماہیت:

اسلامی مکتب فکر میں انسانی فضیلت اور برتری صرف اس کی جسمانی اور زندگی گزارنے کے ڈھنگ یا اس کی بدنی اور ذہنی قوت تک منحصر نہیں، بلکہ ان سب کے ساتھ انسانی ذات اور ماہیت ایک مجرد وجود پر قائم ہے، جسے مختلف جہتوں سے روح، نفس، قلب اور نفخۂ الوہی کہا جاتا ہے اور یہی وہ انسانی جہت ہے جس کا تعلق ماوراء طبیعت اور قیامت (معاد) کی بحث سے جڑا ہوا ہے (37)۔

لہٰذا انسان کی انسانیت اس کی مجرد روح کی بناء پر ہے اور انسان کی ذات اور ماہیت اسی روح کے ناطے ہے چونکہ انسان کا دوسری مخلوقات سے فرق ڈالنے والا عنصر یہی روح ہے نہ کہ مادی بدن اور یہی لافانی انسانی روح اسلامی تربیّتی علوم کا موضوع ہے۔ جبکہ بدنی و جسمانی تربیت وسیلے اور مقدمے کے طور پر مورد نظر ہے (38)۔ جبکہ معاصر مغربی نظام فکر انسان شناسی کو فقط انتھروپولوجی (Anthropology) تک محدود کرکے انسان کو ایک حیوانی حیثیت سے زیر بحث لاتے ہیں، اور فقط اسکے جسمانی اور تمدنی حالات سے متعلق بحث کرتے نظر آتے ہیں۔

اسلامی نکتہ نگاہ سے، انسان میں موجود خصوصیات اور قابلیتوں کے ذکر پر اس بحث کو ختم کرتے ہیں۔ اگر خلاصہ بیان کریں تو تعلیم وتربیت، انسان کی بالقوہ قابلیتوں کو اس کے انفرادی اور اجتماعی کمال کی راہ میں فعلیت تک پہنچانے کا نام ہے۔ لہٰذا سب سے پہلے ایک تربیتی نظام میں انسان کی قابلیتوں اور خصوصیات کی شناسائی اہمیت کی حامل ہے۔ جو بطور کلی اسلامی تصوّر انسان میں درج ذیل ہیں (39)۔

۱) علم اور آگاہی حاصل کرنے کی قابلیت۔

۲) انسانی روح میں موجود مختلف رجحانات اور میلانات۔

۳) انسانی اختیار اور آزادی اور انتخاب کی صلاحیت۔

۴) انسانی توانائی اور ارادہ۔

۵) انسانی شخصیت میں تبدیلی اور اس پر موثر عوامل۔

ان میں سے ہر ایک کی تفصیل یہاں ممکن نہیں۔ تصوّر انسانی کی اسی تفصیل کی روشنی میں تعلیم وتربیت کے ذریعے انسانی کمال کے اعلیٰ ترین مقام کا تعین اور اس کے حصول اور اس راستے میں آنے والی رکاوٹیں جو خود انسان کی ذات میں موجود ہیں اور جو ماحول اور حالات کی وجہ سے پیش آتی ہیں، ان سب کو مد نظر رکھتے ہوئے ایک مناسب تعلیم وتربیت کے نظام کے عمومی اصول اور پھر قواعد اور طریق کار متعین کیا جاسکتا ہے۔

نتیجہ یہ کہ جن چار اہم ترین مبانی پر اسلامی اور مغربی تعلیم وتربیت کے نظام کا موازانہ کیا گیا ہے یہ اساسی ترین اور بنیادی ترین امور میں سے ہیں۔ان کے علاوہ جغرافیائی حالات اور شرایط،علاقائی رسم وراوج، سماج، ثقافت، نفسیات، تہذیب و تمدن اور مخصوص ماحولیاتی مشکلات اور شرایط کو بھی مد نظر رکھنا اصول اور مبادی متعین کرنے میں انتہائی اہمیت کے حامل ہیں۔

دو تربیتی مکاتب کے مبانی کا تقابلی جائزہ:

اسلامی اور مغربی تربیتی مکاتب کے مبانی کے تجزیاتی مطالعے کو یہاں بطور مختصر موازنے کی صورت میں ایک جدول میں پیش کیا جارہا ہے۔

تعلیم وتربیت کے مبانی	مکتب اسلام	مکتب غرب
تصور علمیات Epistemology	عقل، حس،وحی، شھود وغیرہ پر مبتنی	اثباتیّت اور ارتیابیّت پر منحصر
تصور کائنات Ontology	خدا محور (مبداء سے معاد)	انسان محور (Humanism)
نظام اقدار Axiology	ذات انسان اور حقیقت پر مبنی	اضافی و عارضی
تصور انسان Anthropology	خدا سے خدا تک (مادی و روحی)	مادی فقط (ماوراء طبیعت سے جدا)

ان دونوں مکاتب میں کسی قسم کی ہماہنگی نہیں پائی جاتی، لہٰذا جو انسانی علوم جس مکتب میں تشکیل پائیں گے اس کی مناسبت سے اسی مکتب کی بنیادوں پر قائم ہوں گے۔اس لئے اسلامی معاشروں میں ہمیں اپنی نسلوں کی صحیح تربیت کے لئے انسانی علوم کو خالص اسلامی فکر اور بنیادوں پر احیاء کرنے اور ڈھالنے کی ضرورت ہے۔ ورنہ مغرب کے اس تصور حیات کا فکری اور نظری نتیجہ دیکھیں، تو ایک وقت ایسا تھا کہ مغربی مفکرین کسی بھی چیز کو بغیر اپنے تجربے کی کسوٹی پر لائے ماننے کے لئے تیار نہ تھے اور افراطی اثباتیّت (Positivism) کے قائل تھے، لیکن آج ان کی فلسفہ علم کے تحت تحریروں پر نگاہ دوڑائیں تو اس کے قائل نظر آئیں گے کہ انسان کسی چیز کے بارے میں سرے سے جان ہی نہیں سکتا!

جبکہ ان کے ملحدانہ تصوّر ہستی اور تصور حیات کا عملی نتیجہ تاریخ کے میوزیم کی نظر ہوئے کمونزم،اور لیبرل ڈیموکریسی کی اہم ترین علامت ''وال سٹریٹ'' کے گرد ظلم کی چکی میں پسے ۹۹ فیصد افراد کا احتجاج اور ان پر آزادی بیان کے حامیوں کے بہیمانہ سلوک کی صورت میں سب پر عیاں ہے۔ لیبرل ڈیموکریسی، جس کے بارے میں اس نظریہ کے حامی اسے انسانی فکر کے ارتقاء کا آخری مرحلہ قرار دیتے ہیں، ایک متناقض

(Paradoxical)اصطلاح ہے، چونکہ لیبر لزم کے پیچھے فردیّت(Individualism) کا تصوّر ہے، جبکہ ڈیموکریسی ایک اجتماعی فکر (Collectivism) کی عکاس ہے، پھر ان کے آپس کے جوڑ میں کیا راز پوشیدہ ہے؟! شاید اس کا جواب ایک فیصد مراعات یافتہ طبقہ اور ان کی اندھی تقلید میں غرق افراد ہی بتا سکتے ہیں!

حوالہ جات

1۔ محمد بن مکرم، لسان العرب، دار صادر، بیروت، ۱۴۱۶ق، ج۵، ص۱۲۶

2۔ اردو لغت، اردو ترقی بورڈ کراچی ج۵، ص590

3۔ جان دیوپی، منطق تئوری تحقیق، ص۱۲

4۔ ژان شاتو، مربیان بزرگ، ص۳۳۹

5۔ راغب اصفہانی، مفردات الفاظ القرآن، تحقیق صفوان عدنان داودی، دار القلم، دمشق، ۱۴۱۶ق، ج۱، ص۵۸۰

6۔ پژوہ ہشگدہ حوزہ و دانشگاہ، فلسفہ تعلیم و تربیت، ج۱، چ۴، انتشارات وزارت خارجہ تہران، ۱۳۸۰ ,ص۳۳۷

7۔ ابوطالبی، مہدی، تربیت دینی از نظر امام علی موسسہ آموزشی وپژوہشی امام خمینی، قم، ۱۳۸۳، ص۱۱۳-۱۱۹

8۔ رہنمایی، سید احمد، درآمدی بر فلسفہ تعلیم و تربیت، موسسہ آموزشی وپژوہشی امام خمینی رہ، قم، ۱۳۸۸، ج۲، ص۶۸-۶۹

9۔ شہید مرتضی مطہری، مجموعہ آثار، صدرا، تہران، ۱۳۷۴، ج۲، جہان بینی توحیدی، ص۷۵۔

10۔ اردو لغت بورڈ کراچی، ج۱۷، ص۲۷۵

11۔ ابوطالبی، مہدی، تربیت دینی از نظر امام علی موسسہ آموزشی وپژوہشی امام خمینی، قم، ۱۳۸۳، ص۱۱۳-۱۱۹

12۔ طاہری، حبیب اللہ، بررسی مبانی فرہنگ غرب و پی آمدہای آن، بوستان کتاب، قم، ۱۳۸۳، ص۳۱

13۔ رہنمایی، سید احمد، درآمدی بر فلسفہ تعلیم و تربیت، موسسہ آموزشی وپژوہشی امام خمینی رہ، قم، ۱۳۸۸، ج۲ص۸۶-۱۰۵

14۔ Fukuyama, Francis, "End of History and the last Man"

15۔ آس والڈ، فلسفہ کیا ہے؟، ص۳۵

16۔ مصباح یزدی، استاد محمد تقی، آموزش فلسفہ، موسسہ آموزشی وپژوہشی امام خمینی رہ، قم، ۱۳۸۳ج۱، ص۳۷-۴۲

17۔ حسین زادہ، محمد، معرفت شناسی، موسسہ آموزشی وپژوہشی امام خمینی رہ، ج۱۲، قم، ۱۳۸۹، ص۱۰۷-۱۱۵

18۔ طاہری، حبیب اللہ، بررسی مبانی فرہنگ غرب و پی آمدہای آن، بوستان کتاب، قم، ۱۳۸۳، ص۱۳۸-۱۳۹

19۔ قنبری، دکتر آیت، نقدی بر اومانیسم و لیبرالیسم، فراز اندیشہ، قم، ۱۳۸۳
20۔ Oxford Advanced Learner's. P 1143
21۔ اردو لغت ترقی اردو بورڈ کراچی ج۱ص۲۸۶
22۔ زمانی، دکتر مہدی، تاریخ فلسفہ غرب، ج۲، دانشگاہ پیام نور، تہران، ۱۳۸۶
23۔ مصباح، مجتبی، فلسفہ اخلاق، موسسہ آموزشی وپژوہشی امام خمینی ، ج۱۳، قم، ۱۲۸۴،، ص۱۳۰-۱۶۴
24۔ ہواردوسموئل، مبانی فلسفی تعلیم وتربیت، ترجمہ گروہ علوم تربیتی، موسسہ آموزشی وپژوہشی امام خمینی رہ، قم، ۱۳۸۷
25۔ زاہدی، مرتضی، نظریہ تربیتی اسلام، موسسہ فرہنگی صابرہ، تہران، ۱۳۸۵،، ص۴۲۰
26۔ سورہ جمعہ ۲، بقرہ۱۵۱، آل عمران، ۱۶۴
27۔ زاہدی، مرتضی، نظریہ تربیتی اسلام، موسسہ فرہنگی صابرہ، تہران، ۱۳۸۵،، ص۶۹، ۶۷
28۔ محمد تقی مصباح یزدی، فلسفہ اسلامی، موسسہ آموزشی وپژوہشی امام خمینی رہ، ج۵، قم، ۱۲۸۳، ج۱، ص۱۵۱-۱۵۳
29۔ رہنمایی، سید احمد، درآمدی بر فلسفہ تعلیم وتربیت، موسسہ آموزشی وپژوہشی امام خمینی رہ، قم، ص۲۳۷
30۔ ابوطالبی، مہدی، تربیت دینی از نظر امام علی موسسہ آموزشی وپژوہشی امام خمینی، قم، ۱۳۸۳، ص۱۲۹
31۔ رہنمایی، سید احمد، درآمدی بر فلسفہ تعلیم وتربیت، موسسہ آموزشی وپژوہشی امام خمینی رہ، قم، ص۲۱۹-۲۲۶۔
32۔ مصباح، مجتبی، فلسفہ اخلاق، موسسہ آموزشی وپژوہشی امام خمینی ، ج۱۳، قم، ۱۲۸۴، ص۱۸-۱۹
33۔ جمعی از نویسندگان، درسنامہ فلسفہ حقوق، موسسہ آموزشی وپژوہشی امام خمینی رہ، قم، ۱۳۸۸
34۔ مصباح یزدی، استاد محمد تقی، آموزش فلسفہ ج۱، موسسہ آموزشی وپژوہشی امام خمینی رہ، قم، ۱۳۸۳، ج۱، ص۲۶۲-۲۶۴
35۔ امین زادہ، محمد رضا، فلسفہ اخلاق، انتشارات انصاری، قم ۱۳۸۳ ، ص۱۰-۷، ۳، ۲۰، ۱۱
36۔ رہنمایی، سید احمد، درآمدی بر فلسفہ تعلیم وتربیت، موسسہ آموزشی وپژوہشی امام خمینی رہ، قم، ص۲۴۸-۲۴۹
37۔ پژوہشکدہ حوزہ ودانشگاہ، فلسفہ تعلیم وتربیت، ج۱، چ۴، انتشارات وزارت خارجہ تہران، ۱۳۸۰، ص۴۰۳، ۴۰۰
38۔ مرتضی مطہری، فطرت؛ صدرا، تہران، ۱۳۷۳ ج۱، ص۲۴۰-۲۶۰۔
39۔ پژوہشکدہ حوزہ ودانشگاہ، فلسفہ تعلیم وتربیت، ج۱، چ۴، انتشارات وزارت خارجہ تہران، ۱۳۸۰ ص۴۱۷

والدین کے ساتھ نیکی، روح کی پرواز

سید فہیم عباس*

faheemhashmi76@yahoo.com

کلیدی الفاظ: والدین، نیکی، پرواز، حق۔

خلاصہ

قرآن کریم کے مطابق ہمیں اللہ تعالی کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔ ہمیں پلٹ کر اسی پروردگار کی طرف جانا ہے۔ گویا ہماری منزل عالم ملکوت کی طرف پرواز ہے۔ لیکن اگر ہم چاہتے ہیں کہ عالم ملکوت تک پہنچیں جو کہ ایک روحانی عالم ہے تو ہمیں اس مادی دنیا سے باہر نکلنا ہوگا۔ لیکن اس مادی دنیا سے باہر نکلنے اور عالم ملکوت تک پرواز کا ایک مؤمن انسان کے لئے ایک اہم راستہ والدین کے ساتھ نیکی اور احسان ہے۔

زیر نظر مقالہ میں والدین کے ساتھ نیکی کے موضوع پر قرآن و سنت کے مطابق روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس مقالہ میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ والدین کی طرف احترام بھری نگاہوں سے دیکھنا عبادت اور موجب ثواب ہے۔ والدین کے لئے دعا کرنا، نیکی شمار ہوتا ہے۔ قرآنی دعاوں میں والدین کے ساتھ نیکی اور احسان کی تعلیم دی گئی ہے۔ والدین کے ساتھ نیکی اور صلہ رحمی موت کی دشواریوں کو رفع کرنے کا موجب ہے۔

* ۔ پی۔ ایچ۔ ڈی اسٹوڈنٹ، تہران یونیورسٹی، (ایران)۔

مقدمہ

قرآن کریم کے مطابق انسان کو اللہ تعالی کی عبادت کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ جیسا کہ یہ آیت اس پر گواہ ہے کہ:

" وَما خَلَقْتُ الْجِنَّ وَ الْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُون. " (1)

ترجمہ: "میں نے جن وانس کو اس لئے خلق کیا ہے تاکہ میری عبادت کریں۔"

اس آیت کے مطابق چونکہ انسان مخلوق ہے، لہٰذا مخلوق ہونے کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنے پروردگار کی عبادت کرے۔ کیونکہ

" إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ راجِعُون. " (2)

ترجمہ: "ہم اللہ کے لئے ہیں اور ہمیں پلٹ کر اسی پروردگار کی طرف جانا ہے۔"

لہٰذا خداوند فرماتا ہے:

" يا أَيُّهَا الْإِنْسانُ إِنَّكَ كادِحٌ إِلى رَبِّكَ كَدْحاً فَمُلاقِيه. " (3)

ترجمہ: "اے انسان تو اپنے پروردگار کی طرف جانے کی کوشش کر رہا ہے تو ایک دن اس کا سامنا کرے گا۔"

پس اگر ہم چاہتے ہیں کہ ایک اعلی درجہ تک پہنچ جائیں تو پہلے اس مادی دنیا سے باہر آنا پڑے گا، تب جا کر اس عالم روحانی پر پہنچ پائیں گے۔ یعنی گناہوں کو ترک کر دے، نیک عمل بجالائے اور جب انسان یہ کام کرنا شروع کر دے تو وہ شخص اس دنیا میں رہتے ہوئے عالم اخروی کا مشاہدہ کر سکتا ہے۔ جیسا کہ علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"فَهُمْ وَالْجَنَّةُ كَمَنْ قَدْ رَآها فَهُمْ فيها مُنَعَّمُونَ هُمْ وَالنّارُ كَمَنْ قَدْ رَآها فَهُمْ فيها مُعَذَّبُونَ." (4)

یعنی: "وہ لوگ جنت کے ساتھ ایسے ہیں جیسا کہ اس کی نعمتوں میں غرق ہیں اور عذاب جہنم کے ساتھ ایسے ہیں جیسا کہ وہ اسے دیکھ رہے ہیں کہ اس میں معذب ہیں۔"

والدین کے ساتھ نیکی، روح کی پرواز

خلاصہ یہ کہ جو مؤمن اِس مادی دنیا سے باہر نکل کر، ایک نیک اور صالح انسان بن جائے تو وہ عالم روحانیت اور ملکوت کو یہیں سے دیکھ سکتا ہے۔ لیکن اس عالم روحانیت کے مشاہدہ کے راستوں میں سے

ایک اہم راستہ، والدین کے ساتھ نیکی کرنے کا راستہ ہے۔ کیونکہ قرآن کی نگاہ میں انسان کی تخلیق میں والدین کی مثال ایک سرسبز درخت کی ہے اور اولاد کی مثال اِس درخت کے پھلوں کی سی ہے۔ والدین کے وجود کے طفیل حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد پَل بڑھ رہی ہے۔ ان کی آغوش دنیا کا ایسا بہترین بستر ہے جو انسان کی طبیعت کے عین مطابق ہے۔

یہی وجہ ہے کہ والدین کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنے کی بہت اہمیت اور تاکید کی گئی ہے جس کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب ہم قرآن کی آیات کو پڑھتے ہیں جہاں خداوند متعال اپنی وحدانیت کا ذکر کرنے کے فورا بعد والدین کے ساتھ حسن سلوک کرنے کا حکم دیتا ہے حتی اس نے اپنے شکر کو بھی والدین کے شکر کے ساتھ قرار دیا ہے۔ جیسا کہ آیت کریمہ میں ارشاد فرماتا ہے:

"أَنِ اشْكُرْ لِي وَلِوالِدَيْكَ إِلَيَّ الْمَصِيرُ" (5)

ترجمہ: "میرا شکریہ ادا کرو اور اپنے ماں باپ کا شکریہ ادا کرو؛ کہ تم سب کی بازگشت میری ہی طرف ہے۔"

ایک دوسری جگہ یوں فرمارہا ہے:

"وَاعْبُدُوا اللهَ وَلا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئاً وَبِالْوالِدَيْنِ إِحْساناً." (6)

ترجمہ: "اور اللہ کی عبادت کرو اور کسی کو اُس کا شریک نہ بناؤ اور والدین کے ساتھ نیک برتاؤ کرو۔"

ایک اور آیت کہ والدین کے ساتھ نیکی پر دلالت کر رہی ہے:

"وَإِذْ أَخَذْنا مِيثاقَ بَنِي إِسْرائِيلَ لا تَعْبُدُونَ إِلاَّ اللهَ وَبِالْوالِدَيْنِ إِحْساناً وَذِي الْقُرْبى وَالْيَتامى وَالْمَساكِينِ وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْناً وَأَقِيمُوا الصَّلاةَ وَآتُوا الزَّكاةَ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ إِلاَّ قَلِيلاً مِنْكُمْ وَأَنْتُمْ مُعْرِضُونَ." (7)

ترجمہ: "اس وقت کو یاد کرو جب ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا کہ خبردار خدا کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کرنا اور ماں باپ قرابتداروں یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا۔ لوگوں سے اچھی باتیں کرنا نماز قائم کرنا زکوۃ ادا کرنا لیکن اس کے بعد تم میں سے چند کے علاوہ سب منحرف ہوگئے اور تم لوگ تو بس اعراض کرنے والے ہی ہو۔"

اس آیت کے مفہوم سے معلوم ہوتا ہے کہ والدین کے ساتھ نیکی اور احسان توحید کے مسئلہ کے بعد واجب مسئلہ ہے جیسا کہ شرک کے بعد سب سے بڑا گناہ والدین سے عاق ہونا ہے۔ اسی وجہ سے اس مسئلے کو

توحید کے بعد اور دوسرے مسائل پر ترجیح دی ہے۔ نہ صرف اس آیت میں بلکہ مختلف جگہوں پر بھی اسی ترتیب کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ (8)

جیسا کہ سورہ انعام کی آیت نمبر ۱۵۱ کی تفسیر میں آیا ہے کہ:

"...أَلاَّ تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئاً وَ بِالْوالِدَيْنِ إِحْساناً. . . " (9)

ترجمہ: "۔۔۔ یہ کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک قرار نہ دو اور والدین کے ساتھ نیکی کرو اور۔۔۔"

یہ آیت بھی اپنے معنی و مفہوم میں گذشتہ آیت کے ساتھ مشابہت رکھتی ہے۔ اس کے علاوہ بھی قرآن نے والدین کے ساتھ احسان اور نیکی بجالانے کی اتنی تاکید کی ہے کہ اگر والدین کافر بھی ہوں تب بھی ان کے ساتھ عزت واحترام سے پیش آو اور ان کے ساتھ نیکی اور احسان کرو۔ جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

"وَإِنْ جاهَداكَ عَلى أَنْ تُشْرِكَ بِي ما لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلا تُطِعْهُما وَ صاحِبْهُما فِي الدُّنْيا مَعْرُوفاً۔" (10)

ترجمہ: "اور اگر تمہارے ماں باپ اس بات پر زور دیں کہ کسی ایسی چیز کو میرا شریک بناؤ جس کا تمہیں علم نہیں ہے تو خبردار ان کی اطاعت نہ کرنا؛ لیکن دنیا میں ان کے ساتھ نیکی کا برتاؤ کرنا۔"

قرآن کریم کی دوسری تاکید والدین کے حق میں دعا مانگنے کے بارے میں یہ ہے کہ:

"وَ قُلْ رَبِّ ارْحَمْهُما كَما رَبَّيانِي صَغِيراً۔" (11)

ترجمہ: "اور ان کے حق میں دعا کرتے رہنا کہ پروردگار اُن دونوں پر اسی طرح رحمت نازل فرما جس طرح کہ انہوں نے بچپنے میں مجھے پالا ہے۔"

خداوند متعال اس آیت میں فرمارہا ہے کہ صرف اپنی مہربانی پر اکتفاء نہ کرو بلکہ ان کے لئے پروردگار سے رحمت واسعہ کا سوال کرو۔ کہ ان کی عاقبت باخیر ہو، خالق غفور ان کے گناہ بخش دے۔۔۔

اور ان چیزوں میں سے جو استجابت دعا کا موجب بنتی ہے وہ انسان کا اپنے والدین کے لئے مغفرت و رحمت کی دعا کرنا ہے۔ جیسا کہ آیت کریمہ میں اللہ تعالی فرمارہا ہے:

"رَبَّنَا اغْفِرْ لِي وَ لِوالِدَيَّ وَ لِلْمُؤْمِنِينَ يَوْمَ يَقُومُ الْحِسابُ۔" (12)

ترجمہ: "پروردگار مجھے اور میرے والدین کو اور تمام مومنین کو اس دن بخش دینا جس دن حساب قائم ہوگا۔"

اسی طرح دوسری جگہ ارشاد ہو رہا ہے:

"رَبِّ اغْفِرْلِی وَلِوالِدَیَّ وَلِمَنْ دَخَلَ بَیتِیَ مُؤْمِناً ۔" (13)

" پروردگار مجھے اور میرے والدین کو اور جو ایمان کے ساتھ میرے گھر میں داخل ہو جائیں بخش دے۔"

اور یہی روش ہمیں انبیاء کی سیرت میں بھی ملتی ہے جیسا کہ حضرت نوح علیہ السلام کچھ لوگوں کے لئے دعائے مغفرت کرتے ہیں۔

ا۔ وہ اپنے لئے بھی استغفار کرتے ہیں، اس لئے نہیں کہ ان سے کوئی گناہ سرزد ہوا ہو۔ بلکہ اولیاء اللہ ہر حالت میں خود کو گناہ گار سمجھتے ہیں کبھی غرور نہیں کرتے چاہے جتنی بھی نیکیاں کریں۔

۲۔ اور اپنے والدین کی خدمت اور حق شناسی کے عنوان سے بھی۔

والدین کے ساتھ نیکی اور خدمت کا دروازہ ان کی موت کے بعد بند نہیں ہوتا بلکہ کھلا رہتا ہے۔ لہٰذا ان کی قضا نمازیں، روزے اور حج کو بجالائے۔ ان کے قرضے ادا کرے وغیرہ۔۔۔

والدین کے ساتھ نیکی اور احسان اہل بیت علیہم السلام کی نظر میں:

جس طرح آیات میں والدین کے ساتھ احسان و نیکی کا ذکر اور تاکید کی گئی ہے اسی طرح روایات میں بھی والدین کے ساتھ نیکی کرنے کی تاکید کی گئی ہے اور اس پر عمل پیرا ہونے کا بہت زیادہ اجر و ثواب بتایا گیا ہے۔ روایات تو بہت زیادہ ہیں لیکن یہاں کچھ اہم احادیث کی طرف اشارہ کریں گے۔

1۔ اجر اطاعت والدین:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: جو شخص خداوند اور اپنے والدین کا مطیع ہو قیامت کے دن اس کا مقام سب سے اونچا ہو گا۔(14) اور امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں کہ: ایسا نہ ہو کہ کوئی چیز تمہیں والدین کی اطاعت سے روکے زندہ ہوں یا فوت ہو گئے ہوں ان کی طرف سے نماز پڑھو صدقہ دو، حج کرو اور روزہ رکھو۔ یہاں تک کہ جو عمل کرے، اس کا ثواب ان کے لئے اور اس کے خود لئے بھی ہو، تاکہ خداوند ذوالجلال اس احسان کے بدلے میں اسے خیر کثیر عطا فرمائے۔(15)

2۔ والدین کی رضامندی، خدا کی رضا ہے:

پیامبر اکرم ﷺ فرماتے ہیں: جس کسی نے اپنے والدین کو خوش کیا اس نے اپنے رب کو خوش کیا اور جس نے والدین کو ناراض کیا اس نے خدا کو ناراض کیا۔ (16) حضرت امام باقر علیہ السلام فرماتے ہیں کہ میرے والد محترم نے ایک شخص کو دیکھا کہ اس کا بیٹا اس کے ساتھ جا رہا ہے اور اپنے والد کے سہارے چل رہا ہے تو میرے والد محترم نے جب تک وہ لڑکا زندہ رہا کبھی اس سے بات نہیں کی۔ (17) اس حدیث مبارک سے یہ بات سمجھ آتی ہے کہ نہ صرف خدا، بلکہ معصومین علیہم السلام بھی ایسے شخص سے خوش نہیں ہوتے جو اپنے والدین کے لئے ذرہ بھی تکلیف کا موجب بنے۔

3۔ والدین کے ساتھ احسان کا کیا مطلب ہے؟

ا۔ راوی کہتا ہے میں نے امام صادق علیہ السلام سے سوال کیا کہ خداوند متعال فرماتا ہے کہ والدین کے ساتھ احسان کرو، اس کا کیا مطلب ہے؟ امامؑ فرماتے ہیں: ان کے ساتھ ادب سے پیش آو، ان کی ضروریات کو پورا کرو اس سے پہلے کہ وہ آپ سے کچھ مانگیں جبکہ وہ خود امیر ہوں اس سے مراد یہ نہیں کہ خداوند منان فرماتا ہے:

"لَن تَنَالُواْ الْبِرَّ حَتَّىَ تُنفِقُواْ مِمَّا تُحِبُّونَ ۔" (18)

ترجمہ: "تم نیکی کی منزل تک نہیں پہنچ سکتے جب تک اپنی محبوب چیزوں میں سے راہ خدا میں انفاق نہ کرو۔"

4۔ سب سے زیادہ حقوق کن کے ہیں اور ان حقوق کو کیسے ادا کیا جائے:

امام باقر علیہ السلام فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے سوال ہوا: کہ لوگوں میں سے سب سے زیادہ حق کون رکھتا ہے۔ فرماتے ہیں: والدین۔ (19) دوسری حدیث میں نقل ہوا ہے کہ ایک شخص نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوال کیا کہ اولاد پر والدین کے کیا حقوق ہیں۔ فرماتے ہیں: ان کا نام زبان پر نہ لائے، ان سے آگے نہ چلے، جہاں وہ بیٹھیں اس جگہ نہ بیٹھے اور ایسا کام نہ کرے کہ لوگ اس کے والد کو گالی دیں۔

اسی طرح ایک اور حدیث میں معصومؑ فرماتے ہیں: کہ تین چیزوں میں پروردگار نے انسان کو کوئی چھوٹ نہیں دی ہے۔

ا۔ امانت کے لوٹانے میں، چاہے وہ شخص نیک ہو یا بد۔

۲۔ وعدہ کی وفا کرنا، چاہے وہ شخص اچھا ہو یا برا۔

۳۔ والدین کے ساتھ نیکی کرنا، چاہے نیک ہوں یا گناہ گار۔(20)

حارث بن دلھاث سے نقل ہے کہ امام علی بن موسی رضا علیہ السلام فرماتے ہیں: خالق کائنات نے ہمیں تین چیزوں کا حکم دیا اور تین چیزوں کو ان کے ساتھ ملا دیا ہے۔ا۔رب کائنات نے نماز اور زکات کا حکم دیا ہے اور جو کوئی نماز پڑھے اور زکات نہ دے خداوند متعال اس کی نماز کو قبول نہیں کرتا اور حکم فرماتا ہے کہ میرا اور والدین کا شکر ادا کرو اور جو شخص والدین کا شکرادانہ کرے اس نے خدا کا بھی شکرادانہ کیا۔۔۔(21)

امام باقر علیہ السلام فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ: لوگوں میں سب سے زیادہ کس کا حق ہے۔ فرمایا: والدین کا۔(22) حتی اگر بڑھاپے کی حد تک پہنچ تو ان کو "اُف" بھی نہ کہو۔

امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں کہ خداوند متعال کا یہ ارشاد کہ:

''إِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ أَحَدُهُما أَوْ كِلاهُما فَلا تَقُلْ لَهُما أُفٍّ وَلا تَنْهَرْهُما۔'' (23)

''اور اگر تمہارے سامنے ان دونوں میں سے کوئی ایک یا دونوں بوڑھے ہو جائیں تو خبردار ان سے "اُف" بھی نہ کہنا اور انہیں جھڑکنا بھی نہیں۔ حتی اگر تمہیں ماریں پیٹیں تب بھی ان سے غصے سے پیش مت آو''

جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

''وَقُل لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيمًا۔''(24)

ترجمہ: ''اور ان سے ہمیشہ شریفانہ گفتگو کرتے رہنا۔''

یعنی ان کے مار پیٹ کے سامنے بھی یہ کہو: (25) اللہ آپ کو بخش دے اور آپ کی خطاوں کو معاف فرمائے اور یہ وہی محترمانہ جواب ہے کہ جو خداوند متعال تم سے سننا چاہتا ہے اور پھر فرماتا ہے: ''**وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ**'' (26)؛ اور ان کے لئے خاکساری کے ساتھ اپنے کاندھوں کو جھکا دینا۔(27)

امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: ایک شخص پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قریب آنے کے بعد عرض کرتا ہے۔ اے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مجھے نصیحت کریں تو آپ نے فرمایا: کسی چیز کو بھی خدا کا شریک قرار نہ دو، یہاں تک کہ تمہیں آگ میں جلایا جائے، تم پہ تشدد کیا جائے۔ ہمیشہ دل کی گہرائی سے ایمان پر قائم رہو اور

اپنے والدین کے فرماں بردار رہو، ان کے ساتھ نیکی کرو، زندہ ہوں یا وفات پا گئے ہوں اور اگر حکم دین کہ اپنے خاندان اور جائیداد کو چھوڑ دو، یہ کام بھی ایمان میں سے ہے۔ (28)

5۔والدین کے ساتھ نیکی اور صلہ رحمی موت کی دشواریوں کو رفع کرنے کا موجب:

امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں کہ: جو شخص یہ چاہتا ہے کہ خداوند ذوالجلال موت کی دشواریوں کو اس پر آسان فرمادے تو اسے چاہیے کہ وہ اپنی قوم و برادری میں سب سے زیادہ صلہ رحمی کو احسن طریقہ سے انجام دے اور اپنے والدین کے ساتھ نیکی کرے تو وہ کبھی غربت اور فقر نہیں دیکھے گا۔(29) دوسری حدیث میں پیغمبر اکرم ﷺ فرماتے ہیں: جو شخص چاہتا ہے اس کی زندگی لمبی اور رزق میں اضافہ ہو تو اسے چاہیئے کہ والدین کے ساتھ نیکی اور صلہ رحمی کرے۔(30)

6۔والدین کی طرف نگاہ کرنے کا ثواب:

رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں: ہر وہ نیک اولاد جو اپنے والدین کی طرف رحمت کی نظر سے دیکھے خداوند متعال اسے ہر نظر کے برابر ایک حج مقبول کا ثواب عنایت فرماتا ہے۔آپ سے سوال کیا گیا کہ: یارسول اللہ ﷺ اگر کوئی شخص ۱۰۰ مرتبہ دیکھے تب بھی؟ تو فرماتے ہیں: جی ہاں۔ اللہ بہت بڑا ہے اور منزہ و مبرہ ہے۔(31)

روایت میں جہاں والدین کی زندگی میں ان کے ساتھ نیکی اور احسان کا ذکر آیا ہے وہاں یہ بھی بیان ہوا ہے کہ اگر کسی شخص کے والدین اس جہان فانی سے رحلت کر گئے ہوں تو وہ شخص ان کی قبر کی زیارت کرے تو یہ بھی عبادت اور بندگی میں شمار کیا جائے گا جب کہ عاق ہوا شخص جنت تو کجا اس کی خوشبو تک نہیں سونگھ پائے گا۔

رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں: جو شخص ہر جمعہ کو اپنے والدین کی یا ان دونوں میں سے کسی ایک کے قبر کی زیارت کرے، خداوند متعال اسے بخش دیتا ہے اور اس کا نام صالح بندوں میں لکھا جاتا ہے۔ اور جس شخص کو والدین عاق کر دیں روایات میں آیا ہے کہ وہ شخص بہشت و جنت تو دور کی بات ہے، وہ بہشت کی خوشبو تک نہیں سونگھ پائے گا۔(32)

امام صادق علیہ السلام سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں: والدین کے عاق ہونے سے بچو کیونکہ جنت کی خوشبو کو ۱۰۰۰ سال کے فاصلہ سے سونگھا جا سکتا ہے۔ اور والدین کا عاق شدہ، قطع رحمی کرنے والا اور جو شخص بڑھاپے میں زنا کرتا ہے جنت کی خوشبو تک نہیں سونگھ پائے گا۔(33)

امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: عاق ہوا شخص، شرابخور اور احسان جتلانے والا جنت میں نہیں جا سکتے۔(34) سعید بن یسار روایت ہے کہ میں نے امام صادق علیہ السلام سے سنا کہ: رسول اللہ ﷺ ایک جوان جو حالت احتضار میں تھا اس کے سرہانے پہنچے اور اس سے کہا: پڑھو: **لا الہ الا اللہ** کئی بار کوشش کرنے کے باوجود بھی وہ نہ پڑھ سکا۔ آپ اس کے سرہانے کھڑی خاتون سے پوچھتے ہیں کہ اس کی ماں ہے؟ عرض کرتی ہے۔ جی ہاں۔ میں اس کی ماں ہوں، پیغمبر اللہ ﷺ فرماتے ہیں۔ کہ کیا تم اس سے راضی نہیں ہو؟ عرض کرتی ہے۔ جی ہاں چھ سال سے میں اس سے نہیں بولی۔ آنحضرت ﷺ نے اسے فرمایا: کہ اس سے راضی ہو جاو۔ تو آپ کی خدمت میں عرض کرتی ہے اس کا خدا راضی ہو۔ آپ کی رضایت کے سبب یا رسول اللہ: تو پیغمبر اکرم ﷺ نے فرمایا اے جوان پڑھو: **لا الہ الا اللہ** اور اس نے پڑھا۔ رسول اللہ ﷺ اس سے فرماتے ہیں تم نے کیا دیکھا؟ وہ عرض کرتا ہے ایک شخص کالا چھرہ، بد صورت، پیپ اور بدبودار کپڑے والا کہ تھوڑی دیر پہلے میرے قریب تھا اور میرے گلے کو دبا رہا تھا۔ تو پیغمبر اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ یہ پڑھو:

''یا من یقبل الیسیر، و یعفوعن الکثیر، اقبل منّی الیسیر، و اعف عنّی الکثیر، انّك أنت الغفور الرّحیم''

یعنی: ''اے وہ کہ جو تھوڑے عمل سے راضی ہونے والا ہے اور کثیر گناہوں کو معاف فرمانے والا ہے۔ میرے تھوڑے عمل کو قبول فرما اور میرے کثیر گناہوں سے در گزر فرما، تحقیق تو بخشنے والا اور مھربان ہے۔''

جوان نے ان کلمات کو پڑھا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس سے فرمایا۔ اب کیا دیکھ رہے ہو؟ اس نے عرض کیا ایک شخص نورانی چہرہ، خوبصورت، خوشبو اور بہترین لباس والا ہے میرے قریب آیا ہے اور وہ کالے چھرے والا شخص مجھ سے دور چلا گیا ہے۔ تو آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں کہ اسی دعا کو بار بار پڑھو۔ اور اس نے تکرار کیا۔ پھر اس سے پیغمبر نے سوال کیا اب کیا دیکھا تو عرض کرتا ہے اب وہ دکھائی ہی نہیں دے رہا۔ اور اب اسی نورانی چہرے والے شخص کو دیکھ رہا ہوں کہ جو میرے نزدیک ہے اور پھر اسی حالت میں اس کی روح پرواز کر گئی۔(35)

اوپر جتنی احادیث اور روایات ذکر ہوئی ہیں ان سے یہی نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ توحید کے بعد مھم ترین مسئلہ والدین کے ساتھ احسان کرنا ہے جو شخص ان کے ساتھ نیکی کرے گا دنیا میں بھی اس کی ترقی، دولت میں اضافہ اور عمر کے طولانی ہونے کا سبب ہے اور آخرت میں بھی عالی درجات سے اس کو نوازا جائے گا۔

دعا میں والدین کے ساتھ نیکی کا ذکر

دنیا کے قانون میں والدین کی عزت اور تکریم اہمیت کی حامل ہے اور عقلی طور پر بھی اسے پسند کیا جاتا رہا ہے اور کیا جاتا رہے گا لہٰذا ان کے ساتھ اس طرح تعظیم اور احسان سے پیش آنا چاہیے، ان کی ہر حال میں خدمت کرنا چاہیے، اسی طرح ان کی دیکھ بھال اور ان کو خود سے راضی کرنا چاہیے اور اس طرح سے محبت، پیار اور دل لگی سے ان کی خدمت کرنا چاہیے کہ ان کی زبان سے دعائیں نکلیں۔ جیسا کہ امام سجادؑ ہمیں اس دعا میں والدین کے ساتھ نیکی اور احسان کرنے کا طریقہ سکھا رہے ہیں۔ ہم اس دعا کے چند اہم نکات کی طرف اشارہ کریں گے:

۱۔ ہمیں اپنے والدین کی بلندی درجات، مقام کی بلندی، نیکیوں میں اضافہ اور حسنات میں اضافہ کے لئے دعا کرنا چاہیے۔

۲۔ ان کے ساتھ نرمی کے ساتھ پیش آنا چاہیے، چاہے وہ ماریں یا پیٹیں۔

۳۔ جب وہ سن رسیدہ ہو جائیں تو ان سے پیار و محبت سے پیش آنا چاہیے۔

۴۔ ان کی قضا نمازیں، روزے اور حج کا بجالانا چاہیے۔

۵۔ ان کے ساتھ ادب و احترام سے پیش آنا۔

نتیجہ:

اس ساری بحث سے ہم اس نتیجہ پر پہنچے کہ قران اور احادیث انہیں مطالب سے لبریز ہیں کہ اللہ تعالی نے اپنی توحید اور شکر کے بعد ماں باپ کے مرتبہ اور شکر کو سب چیزوں پر ترجیح دی ہے۔ اور والدین کے ساتھ نیکی کو افضل عبادتوں میں سے اور ان کے ساتھ بدی کو شرک کے بعد سب بڑا گناہ شمار کیا گیا ہے۔ لہٰذا جو شخص والدین کے ساتھ نیکی اور ان کی اطاعت کرے گا وہ دنیا و آخرت میں عالی مقامات پر فائز ہوگا اور جو ان سے بدی اور ان کی نافرمانی کرے گا اس کا ٹھکانہ جہنم ہوگا۔ انشاء اللہ

حوالہ جات

1 -ذاریات، آیت 56۔

2-بقرہ، آیت 156۔

3-انشقاق، آیت 6

4- رضی، سید ابوالحسن محمد بن حسین، نہج البلاغہ، بنیاد نہج البلاغہ، 1372ہ-ش- 1413ہ-ق۔

5-لقمان، آیت 14۔

6-نساء، آیت 36۔

7-بقرہ، آیت 83۔

8-طباطبائی، سید محمد حسین، المیزان فی تفسیر القرآن، قم، اسلامی جامعہ ی مدرسین حوزہ علمیہ، 1417ق۔ ج13، ص109.

9-انعام، آیت 151، کہہ دیجئے کہ آؤ ہم تمہیں بتائیں کہ تمہارے پروردگار نے کیا کیا حرام کیا ہے... خبردار کسی کو اس کا شریک نہ بنانا اور ماں باپ کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا۔ اپنی اولاد کو غربت کی بنا پر قتل نہ کرنا کہ ہم تمہیں بھی رزق دے رہے ہیں اور انہیں بھی... اور بدکاریوں کے قریب نہ جانا وہ ظاہری ہوں یا چھپی ہوئی اور کسی ایسے نفس کو جسے خدا نے حرام کردیا ہے قتل نہ کرنا مگر یہ کہ تمہارا کوئی حق ہو. یہ وہ باتیں ہیں جن کی خدا نے نصیحت کی ہے تاکہ تمہیں عقل آجائے۔

10-لقمان، آیت 15۔

11-اسراء، آیت 24۔

12-ابراہیم، آیت 41۔

13-نوح، آیت 28۔

14- المتقی الہندی، علی بن حسام الدین، کنز العمال فی سنن الاقوال و الافعال، بیروت مؤسسۃ الرسالۃ، 1989م، ج16، ص467.

15-ایضاً، ص318.

16-ایضاً، ج16، ص470.

17- مجلسی، محمد باقر، مشہور بہ علامہ مجلسی، حلیۃ المتقین، قم، مسجد مقدّس جمکران، ۱۳۸۸-ق۔، ص75.

18-آل عمران۔ ۹۲
19-طبرسی، فضل بن حسن، نجف، مشکاۃ الانوار فی غرر الأخبار، حیدریہ، ج1، ن دوم، قرن ہفتم، چ1385ق۔ ص317.
20-کلینی، محمد بن یعقوب بن اسحاق، الکافی، تہران، دار الکتب الإسلامیۃ تہران، 1365ہ-ش۔، 2، ص162.
21-عطاردی قوچانی، عزیز اللہ، اخبار و آثار حضرت امام رضا علیہ السلام، تہران، کتابخانہ صدر، ج1، ن اول، 1397-ق۔، ص443.
22 - طبرسی، فضل بن حسن، نجف، مشکاۃ الانوار فی غرر الأخبار، حیدریہ، ج1، ن دوم، قرن ہفتم، چ 1385 ق۔، ص317.
23-اسراء، آیت 23.
24-ایضاً.
25-الکافی، کلینی، محمد بن یعقوب بن اسحاق، ج1، ص194.
26-اسراء، آیت 24.
27-کلینی، محمد بن یعقوب بن اسحاق، الکافی، تہران، دار الکتب الإسلامیۃ تہران، 1365ہ-ش۔، ج1، ص194.
28-طبرسی، فضل بن حسن، نجف، مشکاۃ الانوار فی غرر الأخبار، حیدریہ، ج1، ن دوم، قرن ہفتم، چ1385ق، ص317.
29-ایضاً.
30-المتقی الہندی، علی بن حسام الدین، کنز العمال فی سنن الاقوال والافعال، بیروت مؤسسۃ الرسالۃ، 1989م، ج16، ص475.
31 - نیشابوری، محمد بن فتال، روضہ الواعظین بصیر المتعظین، قم، دلیل ما، بی تا، ج2، ص318.
32 -المتقی الہندی، علی بن حسام الدین، کنز العمال فی سنن الاقوال والافعال، بیروت مؤسسۃ الرسالۃ، 1989م، ج16، ص468.
33- دیلمی، شیخ حسن، القلوب إلی الصواب، إرشاد دو جلد در یک مجلد، انتشارات شریف رضی، 1412 ہجری قمر، ج1، ص179.
34 - حر عاملی، محمد بن حسن، تفصیل وسائل الشیعۃ الی تحصیل مسائل الشریعۃ، قم، مؤسسہ آل البیت علیہم السلام، 1409ہ-ق۔، ج25، ص337.
35-تُلعُکبری، محمد بن محمد بن نعمان، مشہور بہ شیخ مفید، اِمالی، قم، کنگرہ جہانی شیخ مفید، 1413ہ-ق، ص326.

پاکستان میں دہشت گردی کے محرکات اور ذرائع ابلاغ کا تزویراتی کردار

محمد ریاض

کلیدی الفاظ : ذرائع ابلاغ ،نائن الیون ،القاعدہ ،دہشت گردی ،ہابیل و قابیل

خلاصہ

ذرائع ابلاغ عصرِ حاضر کا ایک اہم ہتھیار ہے۔مغرب بمقابلہ اسلام کا رجحان ، اسلام و مسلمانوں کی تضحیک، تہذیبی تصادم اور دیگر متنازع نظریات کے پس پردہ ذرائع ابلاغ کا کردار کسی سے ڈھکا چھپا نہیں۔اولین واقعہ جو اس پورے منظر میں ذرائع ابلاغ کے کلیدی کردار کا موجب بنا وہ نائن الیون حادثہ تھا۔دہشت گردی کے خلاف جنگ کا باقاعدہ اعلامیہ امریکی ورلڈ ٹریڈ سینٹر پر حملے کے بعد جاری کیا گیا۔اس سلسلے میں مغربی ذرائع ابلاغ نے امریکی حکومت کا پورا پورا ساتھ دیا۔اسی دوران پاکستان میں ذرائع ابلاغ کو بھی زبردست فروغ حاصل ہوا۔خاص طور پر برقیاتی ابلاغ جو جمود کا شکار تھے اور ان کا دائرہ کار صرف سرکاری چینل تک محدود تھا، کو نئی جہت ملی۔ملکی سطح پر نجی ٹیلی ویژن چینلز شروع کئے گئے۔ایف ایم ریڈیو کی تعداد بڑھی اور میڈیائی صنعت نے جو کبھی پرنٹ میڈیا تک محدود تھی، ذرائع ابلاغ کی ہیئت مجموعہ کا روپ دھار لیا۔شروعات میں ان چینلوں کی بنیاد اظہارِ رائے کی آزادی جیسے نظریات سے رکھی گئی تھی اور ریاست کے چوتھے ستون کے طور پر قبولیت کا درجہ عطا کرنے کا عزم بھی کیا گیا تھا، بعد میں یہ دونوں نظریات ثانوی حیثیت اختیار کر گئے اور میڈیائی صنعت مسابقت کی لت میں پڑ گئی۔اس مقالے میں نے ہم موجودہ ذرائع ابلاغ کی تزویراتی کردار کو چار نکات میں بیان کیا ہے۔اول : ذرائع ابلاغ نے دہشت گردی کو سنجیدہ لینے کی بجائے خبریت کے طور پر قبول کرلیا۔دوم: ذرائع ابلاغ نے اصلِ واقعہ پر توجہ دینے کی بجائے بات کو بڑھاچڑھا کر بیان کرنے کی عادت ڈالی۔سوئم: دہشت گردی جیسا اہم معاملہ باہمی مسابقت کی وجہ ٹھہراچہارم: مسابقت کی اندھا دھند دوڑ میں ضابطہ اخلاق کا خیال نہیں رکھا گیا جو معاشرتی اصلاح اور افرادی کی تربیت میں بالکل بھی ممدو معاون نہیں بن سکتا تھا۔

ابتدائیہ

ذرائع ابلاغ عصرِ حاضر کا ایک اہم ہتھیار ہے۔ کسی بھی قوم، مذہب، ملک اور شخصیت کو اچھائی یا برائی کی طرف نسبت دینا (اگرچہ فی الواقعہ اچھائی یا برائی کا سرزد ہونا یقینی نہ ہو) ذرائع ابلاغ کیلئے بہت آسان اور ضروری اَمر بن گیا ہے۔ مغرب بمقابلہ اسلام کا رجحان، اسلام و مسلمانوں کی تضحیک، تہذیبی تصادم اور دیگر متنازع نظریات کے پس پردہ ذرائع ابلاغ کا کردار کسی سے ڈھکا چھپا نہیں۔ رواں صدی کے آغاز میں ہی چند ایسے واقعات رونما ہوئے جن کی آڑ میں ذرائع ابلاغ سے خوب خوب استفادہ کیا گیا اور استفادے کی کیفیت انسانی تعمیر کیلئے ہونی چاہیے تھی بد قسمتی سے کلی طور پر منفی نظر آئی۔

اولین واقعہ جو اس پورے منظر میں ذرائع ابلاغ کے کلیدی کردار کا موجب بنا وہ نائن الیون (۹/۱۱) حادثہ تھا۔ کچھ امریکی خود ساختہ ثبوت تھے اور کچھ القاعدہ کے سربراہ اسامہ بن لادن کا اقرار، ملے جلے حالات و واقعات کے تناظر میں القاعدہ اس حادثے کی ذمہ دار قرار پائی۔ مٹھی بھر ملزمان کے اس اقدام سے نہ صرف اسلام کی بدنامی ہوئی بلکہ اسلام کو باقاعدہ ایک دہشت پسند مذہب قرار دینے کی کوشش کی گئی۔ یہ تمام مفروضات ذرائع ابلاغ کی چھری تلے قائم کئے گئے اور عالمی سطح پر ذرائع ابلاغ کا یہ اقدام منفی کردار کے طور پر سامنے آیا۔

دہشت گردی کے خلاف جنگ کا باقاعدہ اعلامیہ امریکی بلند و بالا عمارتوں (ورلڈ ٹریڈ سینٹر) پر حملے کے بعد جاری کیا گیا۔ اس سلسلے میں مغربی ذرائع ابلاغ نے امریکی حکومت کا پورا پورا ساتھ دیا۔ اگرچہ اس جنگ کا براہِ راست تعلق امریکہ اور القاعدہ تنظیم سے تھا تاہم بالواسطہ پاکستان کی شمولیت بھی ہوئی۔ عسکری وسول معاونت حاصل کئے بغیر پاکستانی زمینی و فضائی گزرگاہوں تک رسائی حاصل کی گئی اور نتیجتاً پاکستان اس جنگ کا غیر ارادی فریق بن گیا۔ ایک عشرے سے زائد عرصے پر محیط اس جنگ کے کیا مقاصد حاصل ہوئے یہ ابھی طے ہونا باقی ہے لیکن پاکستان کی حد تک یہ پیشگوئی ضرور کی جاسکتی ہے کہ اس عرصے میں ہزاروں قیمتیں جانیں ضائع ہوئیں۔ پاک فوج کے سینکڑوں آفیسروں اور جوانوں نے اپنی جان کا نذرانہ دیا جبکہ معیشت کو غیر یقینی صورت حال کا سامنا کرنا پڑا۔

دہشت گردی کے خلاف نام و نہاد اس جنگ کا آغاز ۲۰۰۱ء کے آواخر اور ۲۰۰۲ء کے اوائل میں ہوا تھا اور دلچسپ بات یہ ہے کہ اسی دوران پاکستان میں ذرائع ابلاغ کو بھی زبردست فروغ حاصل ہوا۔ خاص طور پر برقیاتی ابلاغ جو جمود کا شکار تھے اور ان کا دائرہ کار صرف سرکاری چینل تک محدود تھا، کو نئی جہت ملی۔

ملکی سطح پر نجی ٹیلی ویژن چینلز شروع کئے گئے۔ ایف ایم ریڈیو کی تعداد بڑھی اور میڈیائی صنعت نے جو کبھی پرنٹ میڈیا تک محدود تھی، ذرائع ابلاغ کی ہیئت مجموعہ کا روپ دھار لیا۔ شروعات میں ان چینلوں کی بنیاد اظہارِ رائے کی آزادی جیسے نظریات سے رکھی گئی تھی اور ریاست کے چوتھے ستون کے طور پر قبولیت کا درجہ عطاء کرنے کا عزم بھی کیا گیا تھا، بعد میں یہ دونوں نظریات ثانوی حیثیت اختیار کر گئے اور میڈیائی صنعت مسابقت کی لت میں پڑ گئی۔

بم دھماکے، فائرنگ اور اغواء برائے تاوان جیسے واقعات کی کوریج ایسے انداز میں کیا جانے لگا جیسے ان واقعات کا جاننا عوام کیلئے ضروری ہے۔ یہ بے چینی دراصل باہمی مسابقت کے نتیجے میں پیدا ہوئی۔ ٹی وی چینلوں نے اپنی موجودگی کا جواز خودکش حملوں اور بم دھماکوں کی تشہیر میں ڈھونڈ لیا۔ قطع نظر اس کے کہ اس سے معاشرے پر کیا اثرات مرتب ہوں گے اور کم عمروں کے اذہان کس قدر شکستگی کا شکار ہو جائیں گے۔ اثر اور اثرات کا خیال نہ رکھتے ہوئے دہشتگردانہ واقعات کی تشہیر کا سب سے بڑا منفی پہلو خوف و دہشت اور معاشرے کی مزید شکستگی کی صورت میں ظاہر ہوا۔

ایک ایسے ماحول میں جہاں ایک طرف دہشت گردی میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہو وہی دوسری طرف ذرائع ابلاغ کی بے مقصد مسابقت نہ صرف ایک تعمیری معاشرے کے قیام میں رکاوٹ بنی بلکہ بعض دفعہ لاشعوری طور پر ان واقعات کو شہ دینے میں معاون بھی بنی۔ اس سلسلے میں ہم موجودہ ذرائع ابلاغ کی تنزویراتی کردار کو چار نکات میں بیان کرتے ہیں:

اول: ذرائع ابلاغ نے دہشت گردی کو سنجیدہ لینے کی بجائے خبریت کے طور پر قبول کر لیا

دوم: ذرائع ابلاغ نے اصلِ واقعہ پر توجہ دینے کی بجائے بات کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنے کی عادت ڈالی

سوئم: دہشت گردی جیسا اہم معاملہ باہمی مسابقت کی وجہ ٹھہرا

چہارم: مسابقت کی اندھا دھند دوڑ میں ضابطہ اخلاق کا خیال نہیں رکھا گیا اور پل پل باخبر رکھنے کے جذبے سے سرشار ذرائع ابلاغ ہر وہ پہلو دیکھانے لگے جو معاشرتی اصلاح اور افرادی کی تربیت میں بالکل بھی ممد و معاون نہیں بن سکتا تھا۔

اب ہم موضوع کے دیگر پہلو کی طرف آتے ہیں اور یہ وضاحت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ دہشت گردی کیا ہے، پاکستان میں دہشت گردی کے محرکات کیا ہیں اور دہشتگردانہ واقعات کے رونما ہونے کی صورت میں ذرائع ابلاغ کا کردار کس قدر تعمیری ہے۔

دہشت گردی کی پہلی واردات:

بنی نوع انسان کی بنیاد آدم علیہ السلام کی ذات ہے۔ قوم، قبیلہ، ذات پات، مذہب اور مسلک، یہ تمام امتیازات انسان کی شناخت کیلئے وضع کئے گئے ہیں جبکہ انسان نے شناخت سے زیادہ ان اصطلاحوں کو اپنی امتیازی شان سمجھا اور اب یہ اصطلاحات شناخت سے بڑھ کر ذہنی اختراع کے طور پر دنیا کے سامنے ظاہر ہو چکی ہیں۔ ما قبل و ما بعد الشعور ہر دو حالت میں انسان کی جسمانی و طبیعی ہیئت ایک ہی تھی کہ وہ انسان ہے۔ تخلیقی و تدریجی صلاحیت تک پہنچتے پہنچتے انسان کی خارجی ہیئت و حیثیت میں کافی بدلاؤ آیا۔ وہ گروہوں کی صورت میں رہنے لگا۔ قبیلوں، قوموں، مذہبوں، مسلکوں اور فرقوں کی کئی درجن اصطلاحیں اسی بدلتی ہوئی خارجی ہیئت و حیثیت کے تناظر میں وضع ہوئیں۔

ایک طرف تمدنی نمو ہو رہی تھی اور دوسری طرف انسان اپنے ہی جیسے انسان سے دوری اختیار کرتا جا رہا تھا۔ گویا جس قدر وسائل کی فراوانی ہوئی اُسی قدر ذات پات، زبان، مذہب، قوم، قبیلہ، مسلک وغیرہم کی بنیاد پر نزاع، چپقلش، دشمنی اور رقابتوں میں اضافہ ہوا۔ زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ بنیادی اشتراک کے باوجود انسان اپنے ہی جیسے انسان کے خون کا پیاسا ہو گیا۔ اولین باہمی نزاع کا واقعہ ہابیل اور قابیل کے درمیان ہوا جو زمین پر قدم رکھنے والے پہلے انسان آدم علیہ السلام کی اولاد تھے۔ قرآن مجید اور مورخین کے مطابق ان دونوں کے درمیان نزاع کی بنیادی وجہ باہمی رقابت تھی۔ ایک خدا کی درگاہ میں مقرب تھا، دوسرا معتوب، ایک کو فضیلت ملی دوسرے کو قعرِ مذلت سے دوچار ہونا پڑا۔

مالکِ کون و مکان کی طرف سے ودیعت کردہ دونوں صفتیں (فضیلت و مذلت) نہ صرف اِن دو انسانوں کے درمیان باہمی مسابقت کا سبب بن گئیں بلکہ آئندہ زندگی کیلئے ایک نشانِ راہ بھی متعین کر گئیں۔ اللہ کی بارگاہ سے راندہ شدہ شخص (قابیل) کو یہ فیصلہ پسند نہ آیا، وہ سرکشی پر اُتر آیا۔ اُس نے نہ صرف اس حکم سے اپنے آپ کو مبرّا سمجھا بلکہ ایک قدم آگے بڑھتے ہوئے اپنے بھائی ہابیل کو قتل کر دیا۔ (1) یوں دنیا میں باقاعدہ دہشت گردی کا آغاز ہو گیا۔ ہابیل مظلوم مارے گئے جبکہ قابیل جو دہشت گردی کے مرتکب

قرار پایا تھا، دنیا کے سامنے ابتدائی دہشت گرد کے روپ میں ظاہر ہوا۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ انسانی تاریخ میں تشدد پر مبنی یہ ابتدائی واقعہ مذہبی بڑھوتری ثابت کرنے کیلئے وقوع پذیر ہوا۔

دہشت گردی کیا ہے؟

دہشت گردی کوئی نئی اصطلاح نہیں۔ زمانۂ قدیم سے ہی اس کے آثار مختلف شکلوں میں موجود تھے۔ یوں تو اس مفہوم کی فی الواقع تعریف بیان کرنا مشکل ہے، البتہ تمام جزئیات سے صَرفِ نظر کرتے ہوئے ایک ہی نکتہ کو سامنے رکھ کر یہ کہا جاسکتا ہے کہ بے جرم وخطاء کسی انسان کو قتل کرنا، ستانا، ظلم ڈھانا، خوف و ہراس پھیلانا اور نہتے لوگوں پر حملہ کرنا دہشت گردی ہے۔ مفکرین نے بھی دہشت گردی کی مخصوص تعریف سے اجتناب کرتے ہوئے صرف لفظ ''دہشت'' کی وضاحت کی ہے۔ بعض کے نزدیک دہشت گردی کی اصلاً کوئی تعریف ہے ہی نہیں۔ ''ایک شخص کا ہیرو دوسرے شخص کیلئے دہشت گرد ہوسکتا ہے اور دوسرے شخص کا دہشت گرد پہلے شخص کیلئے ہیرو یعنی مجاہد ہوسکتا ہے۔'' (2)

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر اس مفہوم کی کوئی تعریف نہیں تو پھر ہم دہشت گردی کی شناخت کیسے کریں اور اس عمل کے مرتکب شخص کو کس نام سے پکاریں؟؟ خارج میں لفظ کا ظہور تبھی ہوتا ہے جب مفہوماً اور مستعملاً اس کا وجود ہو۔ اگر ہم یہ کہہ کر کہ ''لفظ دہشت گردی کی کوئی تعریف نہیں ہوسکتی''، اس کو مبہم چھوڑ دیں تو پھر خوف وہراس اور معاشرے میں بدامنی پھیلانے والوں کو کس نام سے پکارا جانا چاہیے؟ لہٰذا ضروری ہے کہ ہم کسی ایسے نقطہ نظر کی طرف ملتفت ہوں جو دہشت گردی کی تعریف فی البدیہہ یا فی الواقع نہ صحیح مجملاً تو اس کی وضاحت کرسکے۔ انسائیکلوپیڈیا آف برنائیکا میں دہشت گردی کی تعریف یوں بیان کی گئی ہے:

> ''دہشت گردی کسی سیاسی مقصد کے حصول کیلئے حکومت، عوام یا کسی فرد کے خلاف منظّم طور پر خوف وہراس یا ناقابل تصدیق تشدد کا نام ہے۔'' (3)

سیاسی نظام میں خلل پیدا کرنے والے محرکات کو دہشت گردی کہا گیا ہے، جبکہ قوم پرستی، انقلاب اور حکومتی مشینری کی طرف سے روا رکھے گئے سلوک کو بھی دہشت گردی کے زمرے میں شامل کیا گیا ہے۔ قوم پرستی، لسانیت، انقلابات اور حکومتی کردار کو الگ سے بیان کرنے کے باوجود معلوم ہوتا ہے کہ اصل مدعا یعنی سیاسی نظام میں خلل اندازی کو ہی دہشت گردی جانا گیا ہے۔ آگے چل کر اسی کتاب میں مزید لکھا گیا ہے:

"سیاسی تنظیمیں اپنے قدامت پسندانہ اور جدت پسندانہ اہداف کے حصول کے لئے دہشت گردی کرتی ہیں۔اسی طرح قوم پرست، نسلی و لسانی گروہ، انقلاب پسند گروہ اور خود حکومتی فوج اور خفیہ پولیس بھی دہشت گردی کا ارتکاب کرتی ہے۔" (4)

یہاں پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ صرف سیاسی مقصد کا حصول ہی کیوں؟ کیا مذہبی، معاشی، معاشرتی وغیرہم کے مقاصد کا حصول کسی بھی طرح سے ممکن ہو، جائز ہے؟ انسان کے اولین وجود سے لے کر اب تک جینا اور صرف اپنی بقاء کا معاملہ نازک بھی رہا ہے اور سنگین بھی، اس دوران صرف اپنے وجود کو برقرار رکھنے اور ذاتی خواہشات کی تکمیل کیلئے لاکھوں انسانوں کو موت کے گھاٹ اُتارا گیا۔ جبکہ مذہبی شناخت کی برقراری اور دینی حیثیت کو نمایاں کرنے کیلئے بھی متعدد جنگیں اس بنیاد پر لڑی گئیں کہ ہر فرد یا قوم خود کو مذہبی اعتبار سے برتر (برحق) سمجھتی تھی۔

ابراہیم (علیہ السلام) اور نمرود، موسیٰ (علیہ السلام) اور فرعون، محمد مصطفیٰ (ا) اور ابو جہل تاریخ کے دوُرخ ہمیشہ سے اس لئے الگ الگ بیان ہوئے کہ ان میں سے ہر فریق جداگانہ مذہبی و سماجی نظریات رکھتا تھا۔ اب ان میں سے کوئی بھی فریق عقلی بنیادوں سے ہٹ کر کوئی بھی عمل انجام دے تو وہ دہشت گرد متصور ہوگا اور جو عقل اور منطق کو بروئے کار لاتے ہوئے انسانیت کی فلاح کا ضامن بن جائے تو وہ پیغمبر، مصلح اور امن پسند تصور ہوگا۔ بعد کے زمانے میں یہی معیار تاریخ کے ہر صفحے پر نظر آنے لگا۔ بلکہ یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ سیاست سے بڑھ کر مذہب زیادہ میدان عمل میں رہا۔ بین المذاہبی تنازعات کی کئی مثالیں تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہیں۔ خود مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان قریباً دو سو سال تک جنگیں لڑی گئیں جو آج بھی ہماری تاریخ میں "صلیبی جنگوں" کے نام سے مشہور ہیں۔

یہ بدیہی بات ہے کہ صلیبی جنگوں کے مُحرکات سیاسی قطعاً نہ تھے۔ بلکہ یہ جنگیں مقدس نام (مذہب) سے منسوب کرکے لڑی گئیں اور ان کی سرپرستی پاپائیت نے کی۔ (5) لہٰذا انسانی سماج کے تمام تر معاملات، چاہے ان کا تعلق سیاست سے ہو، مذہب سے ہو یا قومیت سے ہر صورت بہترین طرزِ زندگی کا حصول ہر فرد کی خواہش اور اولین ضرورت رہی ہے۔ صرف سیاست میں ہی پیدا شدہ اوتھل پتھل جیسی صورت کو دہشت گردی قرار دینا موضوع کو نظرانداز کرنے کے مترادف ہے۔ اس سے بھی زیادہ جان بوجھ کر ایک

روشن حقیقت کو پس پشت ڈالنے اور بھیانک سازش کو پنپنے کی پوری کوشش کی جارہی ہے جس کی باریکیوں سے آج کا انسان، خاص طور پر مسلمان ناآشنا ہے۔

امریکی محکمہ ریاست (U.S State of Department) نے بھی اسی سے ملتی جلتی تعریف بیان کی ہے جس سے صاف واضح ہوتا ہے کہ ایک پہلو کو اجاگر کرکے دیگر کئی پہلوؤں کو نظرانداز کرنے کا عمل ایک پوشیدہ شرارت (دہشت گردی) کی نشاندہی کررہا ہے۔

"The term ''terrorism'' means premeditated, politically motivated violence perpetrated against non-combatant targets by subnational groups or clandestine agents; usually intended to influence an audience."(6)

"دہشت گردی سے مراد سیاسی محرکات کے تحت تشدد پر مبنی سوچی سمجھی کاروائی ہے جو نیم حکومتی گروہ یا خفیہ کارندے کریں اور جس کا نشانہ غیر مقاتل افراد بنیں۔ اس کاروائی کا مقصد بالعموم کسی خاص گروہ پر اثرانداز ہونا ہوتا ہے۔"

اس تعریف میں بھی صَرف نظری سے کام لیا گیا ہے اور صرف سیاسی نظام میں خلل کو دہشت گردی کہا گیا ہے، جبکہ پچھلے ایک عشرے سے "دہشت گردی" کے خلاف جاری جنگ کے کیا سیاسی مُحرکات تھے، یہ آج تک تعین نہ ہوسکا۔ اگر ورلڈ ٹریڈ سینٹر پر حملے کرنے والے دہشت گرد مسلمان تھے تو ان کے مطمع نظر صرف مذہبی محرکات تھے نہ کہ سیاسی، انہوں (دہشت گردوں) نے فرض کرلیا تھا کہ وہ مسلم اُمہ کی حفاظت کرنے اور ان کے ساتھ روا رکھے گئے ظلم کا بدلہ لینے چلے ہیں۔ بقول ان "دہشت گردوں" کے امریکہ چونکہ مسلمانوں کا دشمن ہے، لہٰذا بدلہ لینے اور امریکیوں کو سبق سیکھانے کیلئے یہ اقدام اٹھایا۔ اُن کے تئیں فلسطین اور دیگر متاثرہ علاقے جہاں مسلمانوں کے ساتھ امتیازی سلوک ہورہا ہے اس کا سدباب اس طرح کے حملوں سے کیا جاسکتا ہے۔

یہ تمام کے تمام مفروضات صرف ایک قوم کی حفاظت کیلئے وضع کئے گئے بعدازاں انہی مفروضات کی بنیاد پر امریکہ دہشت گردانہ حملوں کا نشانہ بنا۔ ان دہشت گردوں نے صرف مذہب کو بنیاد بناکر اتنا بڑا اقدام اٹھایا جبکہ زمینی حقائق اس بات کے گواہ ہیں کہ ان حملوں میں سیاسی محرکات کا قطعاً کوئی دخل نہ

تھا۔ پھر کیا وجہ ہے کہ صرف سیاسی محرکات ہی دہشت گردی کا سبب بنتے ہیں؟ تسلیم کرنا ہوگا کہ دنیا میں اب تک صرف مذہبی محرکات کی بنیاد پر ہی جنگیں لڑی گئیں اور باہمی تنازعات کا بازار گرم رہا۔ البتہ جنگِ عظیم اول اور جنگِ عظیم دوم کے پس پردہ حقائق کی روشنی میں ہم یہ ماننے پر مجبور ہیں کہ ان جنگوں کے وقوع پذیر ہونے میں چند سیاسی محرکات ضرور تھے۔

خاص طور پر جرمن قوم پرستی نے جنگ کے شعلے بھڑکا دیئے حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ جرمنی سمیت فرانس، امریکہ، روس اور دیگر اتحادیوں میں اکثریت کا تعلق عیسائیت سے تھا۔ جاپان اس جنگ میں کودا تھا تو اس کی وجوہات بھی سیاسی یا معاشی مقاصد کا حصول تھا۔ صرف یہی وہ دور ہے جہاں مذہب باہمی نزاع کا باعث نہیں بنا جبکہ ان جنگوں میں قوم پرستی بھی نظر آئی، معاشی مقاصد کا حصول بھی پوشیدہ نظر آیا اور مفادات کا باہمی ٹکراؤ بھی۔ اس دوران اگر کسی کا براہ راست کردار نہ تھا تو وہ مذہب کا تھا۔

بین الاقوامی شہرت یافتہ امریکی دانشور نوم چومسکی نے دہشت گردی کو دو مختلف معنوں میں بیان کیا ہے۔ ایک لغوی معنی اور دوسرا عام معنی (عام سے مراد مقتدر طاقتوں کی جانب سے وضع کردہ تعریفات ہیں) دہشت گردی کا لغوی تصور یوں بیان کیا ہے: ''دہشت گردی تشدد کی دھمکی کا نپا تُلا استعمال ہے جو دباؤ ڈال کر اور جبر یا خوف پیدا کر کے سیاسی، مذہبی یا نظریاتی اہداف حاصل کرنے کے لئے کیا جائے۔'' ان کے نزدیک دہشت گردی کی عام تعریف یہ ہو سکتی ہے: ''جو کوئی بھی امریکہ، اس کے دوستوں اور اس کے حلیفوں کے خلاف ہے وہ دہشت گرد ہے۔'' (7)

نوم چومسکی کی طرف سے بیان کردہ تعریف سے مندرجہ ذیل نکات اخذ کئے جا سکتے ہیں:

- آج کے زمانے میں ہر طاقت ور انسان غریب اور کمزور آدمی کو (حکم نہ ماننے پر) دہشت گرد سمجھتا ہے۔
- مقتدر طاقتیں معاشی حصول کیلئے کسی بھی ملک، قوم اور ریاست کو دہشت گرد سمجھتی ہیں۔
- مفروضات پر مبنی نظریات کی بنیاد پر کسی قوم، ملک، ملت اور مذہب کو دہشت گردی سے منسوب کرنا استعماری طاقتوں کا طاقت ور حربہ بن گیا ہے۔
- اقتدار اور مال و دولت کی لالچ انسانی حواس کو ٹھکانے میں رہنے نہیں دیتی۔ سازشی نظریات اور خفیہ میٹنگوں کے ذریعے پہلے راہ ہموار کی جاتی ہے بعد ازاں دہشت گردی کا لیبل لگا کر حکم نہ ماننے والے

"دہشت گردوں" کے خلاف باقاعدہ جنگ کا آغاز کیا جاتا ہے۔ عراق اور افغانستان اس کی واضح ترین مثال ہے۔ جبکہ شام نام و نہاد دہشت گردی کے خلاف جنگ کے نشانے پر آتے آتے بچ گیا۔

- پچھلے ایک عشرے کے دوران دہشت کے گردی کے نام پر لاکھوں لوگوں کی جانیں اس لئے لی گئیں کہ وہ لوگ امریکی و مقتدر قوتیں کے حکم پر لبیک نہیں کہتے تھے۔

اسلامی فقہ اکیڈمی کی جانب سے منعقدہ کانفرنس میں دہشت گردی کی تعریف یوں وضع کی گئی:

"وہ ظلم و زیادتی جو انسان کے دین، عقل، مال اور عزت پر افراد، تحریکات اور جماعتوں کی جانب سے کی جائے۔ اس میں خوف و ہراس، ایذا رسانی، تہدید و تخویف، ناحق قتل، راستوں کو پر خطر بنانا اور رہزنی اور ڈاکہ زنی جیسی تمام صورتیں داخل ہیں اور ہر وہ دہشت اور دھمکی آمیز اقدام جو کسی ایسی انفرادی یا اجتماعی مجرمانہ منصوبہ بندی کے نفاذ کیلئے ہوتا ہو جس کا مقصود لوگوں میں خوف پھیلانا، انسانی جان کی آزادی اور امن و سکون کو خطرے میں ڈال کر ڈرانا دھمکانا، اسی طرح ملک کے کسی خطے کو، رفاہ عامہ کی چیزوں کو یا عوامی یا ذاتی ملکیتوں کو نقصان پہنچانا یا سرکاری اور قدرتی ذرائع آمدنی کو تباہ و برباد کرنا۔" (8)

مندرجہ بالا تعریف عمومی طور پر دہشت گردی اور اس سے ملحقہ اقدامات کی بھرپور تشریح کرتی ہے۔ صرف ایک ہی معاملہ کو دہشت گردی کے زمرے میں شامل کرنے کی بجائے اُن تمام معاملات کو دہشت گردی کے عنوان کے تحت بیان کیا گیا ہے جو انسان اور انسانیت کیلئے نقصان کا باعث بنتے ہیں۔ لیکن چونکہ یہ تعریف ایک ایسے مذہب کی طرف سے بیان کی گئی ہے جو بذاتِ خود دہشت گردی کا سب سے بڑا شکار ہے۔ لہٰذا مفصل اور جامع ہونے کے باوجود دنیا کی ہر قوم یا مذہب کیلئے یہ قابل قبول نہیں ہو سکتی۔ خصوصاً لمحہ بہ لمحہ بدلتی دنیا اور پے در پے وقوع پذیر ہونے والے واقعات اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ہوں، یقینی بات ہے کہ دنیا جس طرح اسلام اور ان کی تعلیمات کو شک کی نگاہ سے دیکھتی ہے، پھر ان کے ماننے والوں کی طرف سے بیان کردہ کسی نظریہ کو کیونکر قبول کرے گی؟

اوپر درج کی گئیں دہشت گردی کی تعریفات کو سیاسی محرکات کے ضمن میں بیان کیا گیا ہے۔ ہم نے جزئیات کے طور پر کچھ نکات بیان کئے کہ دہشت گردی کی تعریف کو صرف سیاسی اکھاڑے تک محدود کرنے کا عمل ایک سازش کے سوا کچھ نہیں۔ ایک ایسا مفہوم جس کی وسعت بہت زیادہ ہو سکتی تھی اور

ہے، صرف ایک ہی پہلو تک محدود کرنا اس عمل کی نشاندہی ہے کہ مذہبی اور دیگر سماجی معاملات میں ہونے والے تنازعات، جارحیت، دھمکیاں اور دھونس جیسے محرکات قابل اعتناء ہیں اور ان کو نظرانداز کیا جاسکتا ہے۔ ایک اور پس پردہ محرک امریکی جارحیت کے ان تمام مظالم کی پردہ پوشی بھی ہے جن کا تعلق افغانستان اور عراق جنگ سے تھا۔

امریکہ اور اس کے اتحادی ممالک نے دہشت گردی کے خلاف اعلان کردہ جنگ کی آڑ میں پہلے افغانستان پر حملہ کیا۔ افغانستان پر الزام یہ تھا کہ اس نے اسامہ بن لادن جیسے "بین الاقوامی دہشت گرد" کو پناہ دی ہوئی ہے۔ تحقیقات و سفارشات اور مذاکرات سے رجوع کئے بغیر افغانستان پر جارحیت کی گئی اور نام و نہاد دہشت گردی کی آڑ میں افغانستان امریکی "دہشت گردی" کا شکار ہوا۔ بدقسمتی یہ تھی کہ افغانستان ایک مسلم ملک تھا۔ بطور جارح افغانستان میں داخل ہوئے امریکہ کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ ان کو عراق میں مشکوک "سرگرمیاں" نظر آئیں۔

عراق پر سب سے بڑا الزام کیمیائی ہتھیاروں کی تیاری کا تھا۔ انہوں نے اس قدر مہم چلائی کہ اقوام متحدہ سمیت دیگر کئی ممالک اس بات کے حامی نظر آئے کہ عراق اگر کیمیائی ہتھیار تیار کرنے میں کامیاب ہوا تو وہ یقینی طور پر "دہشت گردی" کیلئے استعمال ہوں گے۔ اس پروپیگنڈہ نے امریکہ اور اس کے اتحادیوں کو عراق پر حملہ کرنے کا ایک یقینی ماحول فراہم کیا۔ عراق پر امریکی حملہ دہشت گردی کی عام تعریف کی عملی صورت تھی جس کا تذکرہ مشہور دانشور نوم چومسکی نے کیا تھا۔ جیسا کہ ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں کہ نوم چومسکی کے خیال میں دہشت گردی کی ایک تعریف امریکی حکومت اپنے مفادات کیلئے استعمال کرتی ہے اور ان کی نظر میں ہر وہ فرد یا ملک دہشت گرد ہے جو ان کی حکم عدولی کرتا ہے۔ نائن الیون کے فوراً بعد امریکہ کو اس "اصول" پر بھرپور عمل کرتے ہوئے دیکھا گیا۔ سابق امریکی صدر جارج ڈبلیو بش نے دوٹوک الفاظ میں دھمکی تھی:

"Every nation in every region now has a decision to make, either you are with us or you are with the terrorists"۔(9)

"دنیا کے ہر ملک اور ہر خطے کو اب فیصلہ کرنا ہوگا یا تو آپ ہمارے ساتھی ہیں یا پھر دہشت گردوں کے۔"

سابق امریکی صدر کا خطاب آئندہ دنیا کی واضح تقسیم کا موجب بنا۔ اگرچہ اس جنگ کا اعلان دہشت گردوں کے خلاف تھا لیکن اس بات کی وضاحت نہیں ملی کہ وہ دہشت گرد کون تھے؟ البتہ دہشت گردی کے خلاف

جنگ کے محرکات واضح طور پر ایک قوم (مسلمان) کے خلاف نمایاں نظر آئے۔ حالانکہ نائن الیون حادثے کے ذمہ داروں کا تعلق مسلمانوں سے تھا تو بھی یہ حقیقت نہیں تھی کہ پوری قوم یا مذہب اس قسم کے نظریات کا حامی ہے۔ یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ نائن الیون کے حملہ آوروں میں سے اکثر نے سیکولرایجوکیشن حاصل کر رکھی تھی جو سطحی اسلامی علم کے ساتھ امتزاج کے بعد انتہا پسند آئیڈیالوجی کی صورت میں نمودار ہوئی۔" (10) انفرادی اقدامات کا اجتماعیت سے کوئی تعلق نہیں یہ تو دنیا کی ہر قوم جانتی ہے، اس کے باوجود فرضیہ بنیادوں پر مسلمان قوم کو دہشت گردی کی طرف منسوب سمجھنا اس بات کی علامت تھی کہ امریکی اقدامات کے تانے بانے بہت پہلے بنے جا چکے تھے۔

تمہیدی بحث اور دہشت گردی کی تعریفات کے تناظر میں واضح ہوا کہ آج پوری دنیا میں دہشت گردی کا رجحان بڑھ رہا ہے۔ ایک طرف دنیا کے طویل و عریض حصے میں جانوروں مثلاً کتے، بلی، ہرن سے پیار کرنے اور جانے بچانے کے کئی واقعات میڈیا میں آرہے ہیں تو دوسری طرف اسی دنیا کے کئی حصوں میں دہشت گردی کے نام پر انسان کو گاجر مولی کی طرح کاٹا جارہا ہے۔ ڈاکٹرائن نما سوچ دہشت گردی کو پروان چڑھانے کا سبب بن رہی ہے۔ غریب اور کمزور افراد کا انکار مقتدر قوتوں کیلئے سب سے بڑی گالی ہے، لہٰذا اپنی انا کی تسکین کیلئے یہ قوتیں دہشت گردی کو پنپنے کا موقع دے رہی ہیں۔

پاکستان میں دہشتگردی کے مُحرکات:

افغانستان کے پڑوس میں ہونے کے ناطے پاکستان کا دہشت گردی کے خلاف جنگ سے متاثر ہونا ایک فطری امر تھا۔ اس فطری تعلق سے بھی زیادہ پاکستان اور افغانستان کے درمیان وہ "معاشقہ" بھی کارفرما تھا جب ۱۹۷۹ء میں روس افغانستان پر حملہ آور ہوا۔ گو کہ روسی جارحیت خود ایک "دہشت گردی" تھی لیکن جہاد کے نام پر پاکستان سمیت کئی اسلامی ممالک کو اس جنگ میں گھسیٹ لانا امریکہ کا ہی کارنامہ تھا۔ (11) اس صورت حال کو جبکہ روس جارح تھا اور افغانستان اس کا شکار، بدیہی طور پر اس لئے نظر انداز نہیں کر سکتے کیونکہ یہی اقدام بعد کی زندگی میں دہشت گردی کی بنیاد بنا۔

لہٰذا اعتراض یہ نہیں ہے کہ پاکستان افغان جنگ میں کیوں ملوث ہوا۔ سوالیہ نشان یہ ہے کہ امریکہ نے اس جنگ کی پشت پناہی کیوں کی؟ اس جنگ میں امریکی شرکت نے جہاں پاکستان اور افغانستان کی جہادی کوششوں کو سوالیہ نشان بنا دیا وہی پاکستان کی سالمیت کو سنگین خطرات بھی لاحق ہوگئے۔ تب سے لے

کر اب تک پاکستان مسلسل دہشت گردی کی لپیٹ میں ہے۔ اب ہم ان محرکات کو بیان کرتے ہیں جو پاکستان میں دہشت گردی کی وجہ بنے:

1) افغانستان کے ساتھ پاکستان کے قدیم دینی، نسلی، قبائلی تعلقات کے علاوہ لوگوں کے خاندانی رشتے بھی ہیں۔ روسی جارحیت کے بعد افغانیوں کے شانہ بشانہ پاکستانیوں کا لڑنا ایک مجبوری تھی۔ اس کے علاوہ جنگ کے بعد ۴۰ لاکھ افغان پناہ گزیں جو دنیا میں پناہ گزینوں کی سب سے بڑی آبادی ہے، پاکستان آکر آباد ہوئے۔ لہٰذا پاکستان کو اس جنگ کی وجہ سے بہت بڑی سماجی اور معاشی قیمت ادا کرنا پڑی۔ خصوصاً سوویت یونین کے شکست پر مبنی انخلاء کے بعد امریکیوں کی عجلت یا منصوبہ بندی کے تحت واپسی نے پاکستان کو بہت بڑی مشکل میں ڈال دیا۔ یوں پاکستان ایک ایسی صورت حال میں داخل ہوا جس کی اس سے توقع نہیں تھی۔ افغان مہاجرین میں ایسے لوگ بھی شامل تھے جو سخت ترین روش کے حامل اور جہاد کی بھٹی میں کندن بن کر آئے تھے۔ انہوں نے اپنے نظریات کو پاکستانی معاشرے پر تھوپنے کی کوشش کی۔ ناکامی کی صورت میں وہ شدت پسندی پر اتر آئے اور یہی سے پاکستان میں دہشت گردی کا آغاز ہوا۔ (12)

2) ۸۰ء کی دہائی میں مذہبی انتہا پسندی سابق صدر ضیاء الحق کی حوصلہ افزائی کی وجہ سے زور پکڑتی گئی۔ اس جہاد میں صوبہ سرحد کے مذہبی افراد شریک تھے کیونکہ افغان پختون اسلام کی بنیادی اور خالص تشریح پر یقین رکھتے ہیں۔ ضیاء الحق نے اپنے ذاتی اور سیاسی مقاصد کے حصول کیلئے پاکستان کے اندر اور بیرون ملک بے لچک مذہبی جماعتوں کا حلقہ بنالیا جس سے پاکستان کی بہت بڑی اکثریت کا تعلق نہیں تھا اور یہ مذہبی حلقہ بعد میں شدت پسندی کی طرف مائل ہوا۔

3) سوویت یونین کی شکست کے بعد امریکی اجارہ داری کے اثرات نظر آنے لگے۔ ایک باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت امریکہ اور یورپ خطے کو اپنے حال پر چھوڑ کر چلے گئے۔ مخلوط حکومت کی صورت میں ایک کمزور حکومت قائم ہوئی جس کی موجودگی میں افغان قبائلی آپس میں لڑنے جھگڑنے لگے اور ان کے درمیان خون خرابہ آخری حدوں کو چھونے لگا۔ افغانستان میں طویل داخلی جھگڑوں کے اثرات پاکستان میں یوں ظاہر ہوئے:

- افغان مہاجرین کی کثیر تعداد پاکستان آئی

- ایک خاص نظریہ کی حامل جماعت (طالبان) کا وجود عمل میں آیا
- طالبان اور دیگر علاقائی تنظیموں کا القاعدہ جیسی بین الاقوامی تنظیم سے الحاق ہوا۔

4) افغان جنگ میں پاکستان کے مضبوط اور دلیرانہ کردار کئی "عالمی طاقتوں" کو کھٹکنے لگا۔ اس لئے پاکستان کو غیر مستحکم کرنے کیلئے ہندوستان سمیت کئی ممالک کی خفیہ ایجنسیاں متحرک ہوئیں۔ اس سلسلے میں ملک دشمن عناصر کو بھرپور استعمال کیا گیا۔ بم دھماکے، قتل و غارت گری اور دیگر خونی واقعات جن کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے کے پس پردہ بیرونی ہاتھ کا ملوث ہونا مسترد نہیں کیا جاسکتا۔ آج بلوچستان کے خراب ہوتے حالات اس کڑی کی اہم مثال ہے۔

5) نائن الیون حادثے نے دنیائے سیاست کا نقشہ بدل کر رکھ دیا۔ امریکی حکومت کی طرف سے باقاعدہ اعلانِ جنگ کے بعد ایک حکم نامہ جاری کر دیا گیا کہ "دنیا کے ہر ملک اور ہر خطے کو اب فیصلہ کرنا ہوگا یا تو آپ ہمارے ساتھی ہیں یا پھر دہشت گردوں کے۔" (13) اپنے موقف کی مزید توثیق کیلئے امریکہ نے اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل سے ۲۸ ستمبر ۲۰۰۱ء کو ایک قرارداد (نمبر ۱۳۷۳) پاس کروائی۔ (14) اقوام متحدہ کے ممبر ہونے کے ناطے پاکستان نے بھی اس قرارداد کی حمایت کی اور پاکستان نے دہشت گردی کے خلاف اس جنگ میں امریکہ کا ساتھ دیا۔ وہ قوتیں جو افغان جہاد میں برسرپیکار رہی ان کو پاکستان کا یہ فیصلہ پسند نہ آیا۔ وہ پاکستان کی اس پالیسی کے خلاف ہو گئیں۔ لہٰذا دہشت گردی کے خلاف جنگ میں پاکستان کی شمولیت بھی ملک میں دہشت گردی کے اضافہ کا سبب بنی۔

6) انقلابِ ایران کے اثرات بھی پاکستان میں نمایاں طور پر دیکھے گئے۔ ایرانی رہنماء آیت اللہ امام خمینیؒ کے دعویٰ کے مطابق: ایرانی انقلاب کسی خاص گروہ یا فرقہ سے منسوب نہیں تھا بلکہ یہ تحریک ایرانی ہونے سے پہلے ایک اسلامی تحریک تھی۔" (15) اس دعویٰ کے باوجود ایرانی انقلاب کو ایک خاص مکتبہ فکر سے منسوب کرکے ردِ عمل کے طور پر پاکستان میں مذہبی تنظیمیں وجود میں آئیں۔ بعد ازاں ایرانی انقلاب سے متاثر تنظیموں اور انقلاب کی مخالف تنظیموں کے درمیان نظریاتی اختلافات کھل کر سامنے آگئے اور نوبت قتل و غارت گری تک جا پہنچی جس کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

7) لال مسجد آپریشن بھی دہشت گردی میں اضافہ کا سبب بنا۔ پاکستانی دارالحکومت اسلام آباد کے قلب میں واقع مشہور مسجد "لال مسجد" اور مدرسہ "مدرسہ فریدیہ و جامعہ حفصہ" کے خلاف

حکومتِ وقت کی کارروائی پاکستان میں خود کش حملوں میں مزید اضافہ کا باعث بنی۔ اس آپریشن کے اسباب و وجوہات پر بحث سے قطع نظر یہاں یہ بیان کرنا ضروری ہے کہ اس واقعہ نے پاکستان کو نہ صرف جانی و مالی نقصان پہنچایا, بلکہ اس کی بنیادیں بھی ہلا کر رکھ دیں۔

8) پاکستان میں دہشت گردی کے محرکات میں سے ایک بڑا محرک پاکستان پر امریکی ڈرون حملے ہیں۔ ان حملوں کا آغاز ۲۰۰۴ء میں ہوااوران کا سلسلہ نواز شریف حکومت کے ابتدائی دنوں تک جاری رہا۔ان ڈرورن حملوں کے ردِ عمل میں پاکستان کے بڑے شہروں کو ٹارگٹ کلنگ اور بم دھماکوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ملک میں ہونے والے اکثر دھماکوں اور حملوں کی ذمہ داری طالبان نے قبول کرلی ہے۔(16)

مندرجہ بالا محرکات کو ہم نے کلیات کے ضمن میں بیان کیا ہے ورنہ جزئیات کی تو طویل فہرست ہے اور ایک پوری کتاب ترتیب دی جاسکتی ہے۔اب ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ ان دہشت گردانہ واقعات کے تناظر میں ذرائع ابلاغ کے حقیقی کردار کو کو زیر بحث لائیں تاکہ ہمارا مدعا یعنی دہشت گردی کے بڑھتے ہوئے واقعات اور ذرائع ابلاغ کی حکمت عملی واضح ہوسکے۔

ذرائع ابلاغ کی حکمت عملی:

ایک اسلامی مملکت ہونے کے ناطے اسلامی جمہوریہ پاکستان کے تمام قوانین اور اصول اسلام کے عین مطابق وضع کئے گئے ہیں۔ جس طرح دیگر شعبہ ہائے زندگی میں اسلامی تعلیمات کو اولین فوقیت دی گئی ہے، اسی طرح ذرائع ابلاغ کی ہیئت، ترکیب اور ان کے اجزاء بھی اسلامی اصولوں کے مطابق مرتب ہونے چاہئیں۔ چونکہ ملک کی دگرگوں صورت حال اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ مزید غیر سنجیدگی کا مظاہرہ کیا جائے۔ زندگی کے کسی بھی شعبے سے تعلق رکھنے والے فرد کی یہ بنیادی ذمہ داری ہے کہ ملکی بقاء کو اولین فوقیت دے۔ اسی طرح ذرائع ابلاغ سے وابستہ تمام افراد بھی بطور پاکستانی اس احساس کو اجاگر کریں کہ ملکی سالمیت تمام جزئیات و کلیات سے بڑھ کر ہے۔ خاص طور پر اس دہشت گردانہ ماحول میں ذرائع ابلاغ کی ذمہ داری مزید دوچند ہوجاتی ہے۔

پاکستانی ذرائع ابلاغ خاص طور پر برقیاتی ابلاغ (الیکٹرونک میڈیا) کی عمر زیادہ طویل نہیں ہے۔ اکیسویں صدی کے آغاز میں ملکی سطح پر باقاعدہ برقیاتی ابلاغ کا آغاز ہوا۔ نوزائیدہ ابلاغ (الیکٹرونک میڈیا) کو کچھ اصول، کچھ قواعد اور کچھ اخلاقیات سے آشنا ہونا چاہیے تھا مگر ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی نے اس کو وقت سے پہلے

"بالغ" بنادیا۔"مادر پدر آزاد" کے مصداق ہمارے الیکٹرونک میڈیا نے ان لوازمات (اصول، قواعد، اخلاقیات) کو قطعی اہمیت نہ دی۔ باہمی مسابقت کے ماحول کی فضاء بروقت اور اوائل عمر میں ہی قائم ہوئی۔ اگرچہ یہ عمل (مسابقت) تخلیقی و تدریجی صلاحیت کو پروان چڑھانے کا بہترین ذریعہ ثابت ہوا لیکن باصلاحیت کارکنان کی عدم دستیابی نے اس عمل (مسابقت) کی ساری اہمیت ختم کردی، یہاں تک کہ سنجیدہ افراد کی کوششیں اور ملک میں باوقار "میڈیا شعبہ" کے قیام کا خواب بھی چکناچور ہوا۔رہی سہی کسر بے وقت کی بریکنگ نیوز نے پوری کردی۔ سب سے پہلے، ہر وقت بروقت، ہر پل اور ہر لمحہ پر نظر کے شوق میں متعدد بار وہ مناظر بھی دیکھائے گئے جن کی کوریج نہ معاشرے کی مفاد میں ہو سکتی تھی نہ ہی کسی فرد کیلئے۔ کبھی کبھار یہ "سب سے پہلے" کا عمل نہ صرف ملکی و قومی مفاد کے برخلاف نظر آیا بلکہ خود اس میڈیا ادارے (چینل) کیلئے سبکی کا باعث بھی بنا۔

اگر مبالغہ آرائی کا خوف نہ ہوتا تو آج کے پاکستانی میڈیا اداروں کی تشریح ان الفاظ میں ہو سکتی ہے۔"میڈیا کے اداروں نے آج کے پاکستانی انسان کی تمام ذمہ داریاں اپنے سر لے لی ہے۔ تفریح فراہم کرنا، وعظ و نصیحت کے فرائض انجام دینا، سیاسی اکھاڑے کے تمام واقعات سے باخبر کرنا، یہاں تک کہ مذہبی و سماجی معاملات بھی میڈیا اداروں کی گرفت میں آچکے ہیں۔ سالِ گذشتہ رمضان کے دوران "زرق برق" نشریات اس "ذمہ داری" کی بھرپور عکاسی کرتی ہیں۔" جب زندگی کے تمام معاملات میں ذرائع ابلاغ کا کردار کلیدی ہو سکتا ہے تو پھر دہشت گردی اور اس سے جوڑے واقعات میڈیا کی نظروں سے کب اوجھل رہتے؟سب سے پہلے باخبر رکھنے کے شوق میں ذرائع ابلاغ اس بات کا لحاظ بھی نہیں کرتے کہ ان کے ایک جذباتی اور مسابقتی عمل سے نہ صرف پاکستان کی سلامتی کو خدشات لاحق ہو سکتے ہیں بلکہ دہشت گردوں کی کاروائیوں کو مزید تقویت بھی مل سکتی ہے۔

اس لئے ہمارا نقطہ نظر یہ ہے کہ اپنے قیام سے لے کر اب تک نو مولود میڈیا نے "کارِ ستائیاں" اور "کارِ نمائیاں" جیسی دونوں طرح کی کارکردگی جاری رکھی ہوئی ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ عوام کے شعور میں اضافہ کی ایک بڑی وجہ ذرائع ابلاغ کی مختصر اور جامع جدوجہد کارفرما ہے لیکن جیسا کہ ہم نے سطور بالا میں بھی ذکر کیا کہ ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی نے ذرائع ابلاغ کو خود احتسابی عمل سے بے گانہ کردیا اور اس عمل کے نتیجے میں ذرائع ابلاغ کی جانب سے تنقید و تنقیص جیسا کم درجے کا اصلاحی پہلو ابھر کر سامنے آیا۔

بنیادی ذمہ داری یعنی اندرون ریاست اصلاحی عمل کی توثیق اور تعمیری تنقید کا تعاقب کرتے کرتے ذرائع ابلاغ نے اپنے لئے ایک تیسرے راستہ کا انتخاب کرلیا اور وہ راستہ مسابقت کا تھا۔ میدان کے سجنے کی دیر تھی کہ ذرائع ابلاغ بے لگام گھوڑے کی طرح ایک ایسی دوڑ میں شامل ہوگئے جس کا انجام کم از کم فتح و کامرانی کا تو نہیں ہو سکتا۔ صدرِ پاکستان دبئی سے کراچی روانہ ہوگئے، خبر بن گئی۔ وزیراعظم پاکستان نے قدرِ تاخیر سے ناشتہ تناول فرمایا، خبریت کا پہلو سامنا آیا۔ پنجاب کے وزیراعلیٰ شہباز شریف دوران تقریر جذباتی ہوگئے اور ان کو ہوش تک نہ رہا کہ وہ ان کی آواز دور تک پہنچانے والے تمام مائیک گراچکے ہیں۔ کبھی کبھی کبھار تقریر کے دوران شعری و شاعری کا بھی مظاہرہ کرتے ہیں، شہباز شریف کی یہ تمام حرکات بھی ذرائع ابلاغ سے محفوظ نہ رہ سکیں اور وہ خبر کی زینت بن گئی۔

سابق وزیراعلیٰ بلوچستان نواب اسلم رئیسانی کے چٹکلے میڈیا کے آنکھ سے کیسے محفوظ رہتے۔ جعلی ڈگری اور کرسی کے بارے میں ان کے یادگار مقولے میڈیا میں اشتہار کا درجہ اختیار کرگئے۔(17) تعجب تو یہ ہے کہ چھوٹی سی چھوٹی بات بھی ذرائع ابلاغ کی فعالیت سے محفوظ نہ رہ سکی لیکن خفیہ ایجنسیوں کی طرح ذرائع ابلاغ کے ادارے بھی آج تک یہ بتانے سے قاصر رہے کہ پاکستان میں دہشت گردی کے پس پردہ کن قوتوں کا ہاتھ ہے؟ دہشت گردی کے متعدد واقعات کے پسِ پردہ طالبان کو ذمہ دار ٹھہرایا جاتا ہے تو یہ ذرائع ابلاغ کی محنت یا اصول نہیں بلکہ خود طالبان کے وہ بیانات ہیں جس میں وہ دہشت گردانہ وارداتوں کی ذمہ داری قبول کرتے نظر آتے ہیں۔(18)

دیگر قتل و غارت گری اور بم دھماکوں کے ذمہ داران آج تک ذرائع ابلاغ کی آنکھ سے اوجھل رہے۔ جدید حالات میں پاکستانی ذرائع ابلاغ کی ذمہ داری صرف قتل و غارت گری کے واقعات کی ترسیل رہ گئی ہے۔ تاہم ذمہ داروں کی نشاندہی نہ کرنا ذرائع ابلاغ کی شاید کوئی مصلحت ہو سکتی ہے یا کسی انجانے خوف کا شائبہ، البتہ یہ ضرور ہے کہ غیر مبہم حکمت عملی کا تسلسل اب بھی جاری ہے۔ لہٰذا ایک طرف دہشت گردی ایک عفریت کی طرح کھڑی ہے تو دوسری طرف ذرائع ابلاغ کے مقتدر حلقوں میں دہشت گردوں کی شناخت کا مسئلہ ابھی تک مبہم ہے۔

ذرائع ابلاغ کا "تجاہل عارفانہ" جیسا رویہ، وقت بے وقت کی "بریکنگ نیوز" اور "سب سے پہلے" کی گردان سے ایسے لوگوں کو بھی شہ ملی جو بظاہر دہشت گرد یا دہشت پسند تو نہ تھے لیکن ہیرو بننے کی دُھن میں یا اس روایت

(جو عام طور پر پوری دنیا اور خاص طور پر پاکستانی معاشرے میں عام ہے کہ کسی عمل کی انجام دہی چاہے وہ مثبت ہو یا منفی کچھ اس انداز سے کرو کہ میڈیا تمہاری شکل، تمہاری آواز اور تمہارے الفاظ کی تشہیر کرنے میں تاخیر نہ کرے) کا حصہ بننے کی جستجو میں ناپسندیدہ افعال کے مرتکب ہوئے۔ بطور تمثیل ۱۶ اگست ۲۰۱۳ء کو اسلام آباد میں سکندر ملک نامی شخص کا غیر ضروری، غیر اخلاقی، غیر شرعی اقدام پیش کیا جاسکتا ہے۔

اس شخص نے ساڑھے پانچ گھنٹے تک اسلامی ریاست (پاکستان) کے دارالحکومت کو صرف اس لئے یرغمال بنائے رکھا کہ وہ ملک میں اسلامی شریعت کا نفاذ چاہتا تھا۔ پس پردہ اس واقعہ کے مقاصد سے قطع نظر جو پہلو قابل توجہ ہے وہ یہ ہے کہ ملکی میڈیا نے بھی اپنے ساڑھے پانچ گھنٹے سکندر ملک کیلئے وقف کر دیا۔ کیا اس واقعہ کی اہمیت اتنی زیادہ تھی کہ معمول کی نشریات روکنی پڑی؟ حالانکہ میڈیا ابتدائی لمحات میں ہی اس شخص کی شناخت چار صورتوں میں کر سکتا تھا:

- کہ سکندر ملک مجرم ہے
- کہ سکندر ملک ملزم ہے
- کہ سکندر ملک باغی ہے
- کہ سکندر ملک مصلح ہے

مصلح اس لئے نہیں ہو سکتا تھا کہ شریعت کے نفاذ کا مطالبہ کرنے والے اس شخص کی ظاہری وضع قطع خود شرعی احکام سے عاری تھی۔(19) البتہ مجرم بننے کی تمام حرکات اس سے سرزد ہوئیں۔ وقفہ وقفہ سے فائرنگ کرنا، اپنے قریب کسی بھی شخص کو نہ آنے دینا اور قریب آنے کی کوشش کرنے والے افراد کی طرف براہِ راست فائرنگ کرنا اور خاص طور پر پیپلز پارٹی کے رہنماء زمرد خان پر فائرنگ جیسے تمام اقدامات اس کو مجرم بنا سکتے تھے لیکن چونکہ اس طرح کا کوئی مرحلہ نہیں آیا اس لئے مجرم نہیں بن سکا۔ البتہ ملزم اور باغی دونوں صفات سکندر ملک پر منطبق ہو سکتی ہیں۔ جس کی تصریح ایک غیر جانبدار شخص ان الفاظ میں کر سکتا ہے کہ ''سکندر ایک دہشت گرد، ریاست کا باغی اور ملزم ہے جس نے نہ صرف ریاستی مشینری کی صلاحیت کو چیلنج کیا بلکہ عوام کو براہِ راست خوف و دہشت میں مبتلا کر دیا۔''

ذرائع ابلاغ نے سکندر کی ''دلیرانہ حرکت'' (دارالحکومت کو یرغمال بنانے کی) کو خوب خوب پیش کیا لیکن یہ واضح کرنے میں ناکام رہے کہ درحقیقت سکندر دہشت گرد تھا بھی یا نہیں۔ میڈیا نے سکندر کو مندرجہ

بالا کسی ایک نام سے بھی ملقب نہ کیا بلکہ واقعہ کے آغاز سے لے کر انجام تک ''ایک شخص'' کے نام سے یاد کیا جاتا رہا۔ یہ ذرائع ابلاغ کا تساہلانہ اقدام تھا۔ دوسری بات اس واقعہ میں سطحی توجہ کی ضرورت تھی لیکن ضرورت سے زیادہ اور بلاوجہ کی کوریج سے دنیا بھر میں پاکستان کی بدنامی ہوئی۔ حکومتی عملداروں نے بھی یہ اعلان کر دیا کہ سکندر دہشت گرد نہیں لیکن بعد کی تفتیش نے اس دعویٰ کی قلعی کھول دی۔ یوں حکومت اور میڈیا دونوں نے تساہل سے کام لیا اور ایک شخص کی نامعقول کاروائی جس کو بہت زیادہ اہمیت نہیں دی جانی چاہیے تھی، دے دی گئی۔

سوال یہ ہے کہ کیا میڈیا محلاتی سازش کا شکار ہے؟ کیا میڈیا اپنی ذمہ داری کو سمجھنے میں ناکام ہے یا سمجھنا ہی نہیں چاہتا؟ کیا قواعد و اصول کی آڑ میں حقائق کو پس پشت ڈالنے کی کوشش ہے؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کا جواب آج کے پاکستانی معاشرے میں غیر واضح ہے۔ خبروں کی مسلسل تکرار اور ذمہ داری کی ادائیگی کے آڑ میں اگرچہ میڈیا کچھ بے باک ہو گیا ہے اور کچھ غیر جانبدار بھی لیکن عوامی شعور کو وہ بالیدگی عطاء نہ کر سکا جس کی توقع کی جارہی تھی۔ خبر اور نظر کے شوق میں کبھی مصلح بن جاتا ہے، کبھی داعی بن جاتا ہے اور کبھی منصف، اتنی ساری صفات سے متصف ہونے کے باوجود میڈیا میں حقیقت پسند بننے کی جرأت شاید ابھی تک پیدا نہ ہو سکی۔

لہٰذا جب کبھی دہشت گردی کے واقعات رونما ہوتے ہیں اور ان کو کوریج کرنے کا مرحلہ آتا ہے تو میڈیا تمام ذمہ داریاں بشمول معروضی انداز میں خبر دینا، حالات سے باخبر رکھنا، واقعات کے پس منظر پر روشنی ڈالنا، حقائق کی تہہ تک پہنچنا، انسانی معلومات سے تھوڑا آگے جا کر اس کے شعور کو بیدار کرنا، ایک خاص نہج پر رائے سازی اور معاشرتی تقاضوں کے مطابق لوگوں کے رویوں اور رجحانات کی تعمیر وغیرہ احسن طریقے سے ادا کرتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا جدید ذرائع ابلاغ ان ذمہ داریوں کو پورا کرتے ہیں جن کا تذکرہ مندرجہ بالا سطور میں کیا گیا ہے؟ قبل اس کے کہ اس سوال کا جواب ہم ہاں میں دیں یہ بیان کرنا ضروری ہے کہ جدید ذرائع ابلاغ نے خبر دینے کے ساتھ خبر لینے کو بھی اپنے مقاصد میں شامل کر لیا ہے۔

اس کا مطلب ہے کہ جہاں یہ شعبہ ہر طبقے، ہر گروہ اور ہر سیاسی پارٹی، مذہبی جماعت اور سماجی تنظیم کی سرگرمیوں کی معروضی انداز میں خبریں دیتا ہے وہاں وہ عوامی نمائندگی کرتے ہوئے ان جماعتوں اور تنظیموں اور گروہوں کی غلطیوں اور کوتاہیوں پر ان کا مواخذہ اور محاسبہ بھی کرتا ہے تاکہ ان کی کوئی

پالیسی اور سرگرمی قومی مفاد اور سماجی بہبود کے منافی نہ ہو۔ خبری گیری، مواخذہ اور محاسبہ جیسی ذمہ داریوں سے عہدہ برآہونے کی صورت میں ہم سمجھیں گے کہ پاکستانی ذرائع ابلاغ مندرجہ بالا ذمہ داریوں کو ضرور پورا کرتے ہیں۔ تاہم کوتاہی اور غفلت کی صورت میں ہم یہ سمجھنے میں حق بجانب ہوں گے کہ ذرائع ابلاغ کا حقیقی کردار کمزور ہونے کے ساتھ ساتھ منفی صورت اختیار کرتا جارہا ہے جو کسی صورت ایک اسلامی ریاست کیلئے اصلاح بخش نہیں ہو سکتا۔

لہٰذا جس طرح ذرائع ابلاغ لذاتہ مثبت ہو سکتے ہیں یا منفی اسی طرح ان کے کردار کا تعین بھی مثبت یا منفی جیسی صورتوں کے ذریعے کیا جاسکتا ہے۔ سطور بالا میں ہم نے سوال اٹھایا تھا کہ کیا ذرائع ابلاغ اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآہیں؟ اس سوال کے ضمن میں ہم ہاں بھی کہیں تو انکار کا پہلو ہر حال میں نمایاں رہے گا۔ ذرائع ابلاغ کی اولین ذمہ داری عوامی شعور میں ہیجان پیدا کرنا ہے اگرچہ اس حد تک پاکستانی ذرائع ابلاغ کافی کامیاب بھی رہے ہیں تاہم ان کی کامیابی کو قبولیت کا درجہ عطا کرنے سے قبل عوامی شعور کی حدبندی تعین کرنا ہوگی کہ شعور سے کیا مراد ہے؟ اگر ہم شعور کو وسیع معنی میں استعمال کرتے ہیں تو یقینا پاکستانی ذرائع ابلاغ کا کردار مضبوط اور حاوی نظر آتا ہے۔

سیاسی و سماجی اور معاشی معاملات سمیت دیگر تمام مظاہرِ زندگی میں بلوغت نظر آتی ہے تو اس کے پس پردہ انسانی ارتقاء اور نوآموز ذرائع ابلاغ کی جدوجہد کارِفرما ہے لیکن اگر شعوری بالیدگی سے مراد کچھ مخصوص شعبہ جات میں دسترس حاصل کرنا ہے جیسا کہ تعلیم و تعلّم، اخلاق و اصلاح، حب الوطنی جیسے موضوعات شامل ہیں تو اس سلسلے میں ذرائع ابلاغ کا کردار نہ صرف کمزور ہے بلکہ چپ سادگی کے مرتکب بھی نظر آرہے ہیں۔ اگرچہ چند ایک چینل نے تعلیم و تعلّم کے کیلئے بہترے کوششیں کیں ہیں تاہم ان کی یہ کاوشیں انفرادی حیثیت کی حامل ہیں۔ اخلاقی و اصلاحی پہلو کا افسوسناک حد تک فقدان ہے۔ جبکہ حب الوطنی کے حوالے سے بھی کسی شاندار کارنامہ کی طرف اشارہ نہیں ملتا۔

خلاصہ کلام یہ کہ نوآموز میڈیا ابھی اپنا ابتدائی سفر طے کررہا ہے۔ ان کو متمدن دنیا کے ابلاغی نظام سے نسبت دینا اور انہی جیسی کارکردگی کی توقع رکھنا پاکستانی میڈیائی اداروں پر حد سے زیادہ بھاری ذمہ داری عائد کرنے کے مترادف ہے۔ ایک عشرے کے عرصے میں ہم نہ تو عرشِ معلیٰ جیسی بلندی کی توقع رکھ سکتے ہیں اور نہ ہی ہمیں میڈیا ذمہ داری اور اصولوں کا پابند نظر آئے گا۔ جس طرح زندگی کے دیگر شعبوں

میں میڈیا کی کمزوریاں اور خامیاں بھرپور دیکھی جاسکتی ہیں اسی طرح دہشت گردی کے واقعات کی تشہیر میں بھی ذرائع ابلاغ سے بھول چوک ضرور ہوئی ہے اور ہو رہی ہے۔

دنیا کے دیگر میڈیائی اداروں کی طرح پاکستان میں بھی ذرائع ابلاغ کے ادارے خبر کی تاک میں رہتے ہیں۔ تشہیری انداز وہی ہے جو دنیا کے دیگر اداروں کا ہے۔ خبر کو خبر کی انداز میں ہی پیش کرتے ہیں۔ البتہ دنیا کے مہذیب ممالک میں ذرائع ابلاغ ایک ضابطہ اخلاق کے پابند ہوتے ہیں۔ وہ انہی واقعات کی تشہیر کرتے ہیں جو ان کے ملکی و عوامی مفاد میں ہوتا ہے۔ لیکن پاکستانی ذرائع ابلاغ نے ابھی اس مرحلے سے گزرنا ہے۔ حالیہ دنوں میں پاکستان کے ایک نجی ٹیلی ویژن چینل نے اپنے ایک اینکر پرسن پر قاتلانہ حملے کے بعد جس طرح پاکستانی فوج کی خفیہ ایجنسی آئی ایس آئی اور اس کے سربراہ کو ملوث کرنے کی کوشش کی یہ کسی بھی طرح سے اظہارِ رائے کا درست انداز نہ تھا۔ خاص طور پر براہِ راست خفیہ ایجنسی کا نام لے کر اور اس کے سربراہ کی تصویر دیکھا کر بہت زیادہ اور شاید ضابطہ اخلاق سے اوپر کا اظہار کیا گیا۔

جبکہ پڑوسی ملک کے ٹیلی ویژن چینلوں نے اس واقعہ کی آڑ میں نہ صرف آئی ایس آئی کو بدنام کرنے کی کوشش کی بلکہ پاکستانی آرمی کو بھی براہِ راست اس واقعہ میں ملوث ٹھہرایا۔ اگرچہ مذکورہ چینل کو اپنے موقف بیان کرنے کا پورا حق ہے لیکن تحقیقی اور تخریجی عمل سے قبل ہی کسی ادارے کو ملوث قرار دینا نہ صرف اخلاقی دائرے سے خارج تھا بلکہ خود چینل کیلئے مشکلات کا باعث بھی بنا۔ لہٰذا حالیہ دنوں میں رونما ہونے والے اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ دہشت گردی کے تناظر میں اور اس کی تشہیر میں ذرائع ابلاغ کی عملیت پسندی اب بھی مخمصے کی شکار ہے۔ وہ نہ صرف خبر کو فی الفور ترسیل کی دُھند میں بے باک اور جلد بازی کا شکار نظر آتے ہیں بلکہ بعض دفعہ سنگین غلطیوں کے مرتکب نظر آتے ہیں جیسا کہ حالیہ مشاہدہ ہمارے سامنے ہے۔

حوالہ جات

1۔ وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ ابْنَيْ آدَمَ بِالْحَقِّ إِذْ قَرَّبَا قُرْبَاناً فَتُقُبِّلَ مِن أَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الآخَرِ قَالَ لَأَقْتُلَنَّكَ قَالَ إِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّهُ مِنَ الْمُتَّقِيْن (سورہ مائدہ، آیت: ۲۷) اور آپ (ﷺ) سچی خبر دیجئے فرزندان آدم (ع) کی جب دونوں نے

قربانی دی تو ایک کی قربانی قبول کی گئی اور دوسرے کی رد کردی گئی۔ (اس دوسرے نے) کہا قسم ہے میں تمہیں قتل کردوں گا۔ (پہلے نے) کہا قبول فرماتا ہے اللہ صرف پرہیزگاروں سے۔

خابی جعفر بن جریر طبری، تاریخ طبری، ج۱، دارابن کثیر، بیروت، ۱۴۲۸ھ (۲۰۰۷ء)، ص: ۱۹۹

2 ۔ آکسفورڈ کنسائز ڈڈ ڈکشنری آف پالیٹکس، ص: ۴۹۲، ۴۹۳

3 ۔ آکسفورڈ کنسائز ڈڈ ڈکشنری آف پالیٹکس، ص: ۴۹۲، ۴۹۳

4 ۔ ایضاً

5۔ ولیم ایل لینگر، انسائیکلوپیڈیا تاریخ عام، (مترجم: مولانا غلام رسول مہر)، ج۱، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص: ۵۲-۵۳

6۔ United States department of state publication office of the coordinator for counterterrorism released April 2008,''country reports on terrorism 2007'', Pg:311

7۔ فرنٹ لائن، مورخہ ۱۲ر دسمبر ۲۰۰۱ء بحوالہ: حافظ مبشر حسین، جہاد اور دہشت گردی، مبشر اکیڈمی، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص: ۳۵

8۔ اسلامی فقہ اکیڈمی کی سولہویں کانفرنس، منعقدہ ۱۴۲۲ ہجری، زیر نگرانی رابطہ عالم اسلامی

9۔ Bush, George W. (September 20, 2001).''Address to a Joint Session of Congress and the American People'',The White House. Retrieved 2008-09-19.

10۔ میاں انعام الرحمٰن، پروفیسر، جنوری ۲۰۰۵ء، ''نائن الیون کمیشن رپورٹ: ایک امریکی مسلم تنظیم کے تاثرات کا جائزہ''، مشمولہ: ماہنامہ الشریعہ (اسلام گڑھ-ہندوستان)، جلد: ۱۶، شمارہ: ۱، ص: ۴۸

11۔ ساگر، طارق اسمٰعیل، لال مسجد، آپریشن سائنلس، محمد سید شاہ پرنٹنگ پریس، لاہور، ۲۰۰۷ء، ص: ۲۴، ۲۳
احمد رشید، طالبان، اسلام، تیل اور وسط ایشیاء میں سازشوں کا نیا کھیل، (مترجم: حمید جہلمی)، مشعل بکس، لاہور، ۲۰۱۱ء، ص: ۳۲

12۔ عقیل یوسف زئی، ''طالبانائزیشن'' نگارشات پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۹ء، ص: ۷۹

13۔ اس موقف کا اظہار سابق امریکی صدر جارج ڈبلیو بش نے نائن الیون حادثے کے فوراً بعد امریکی عوام سے خطاب کرتے ہوئے کیا تھا، جس کا حوالہ ہم سطور بالا میں دے چکے ہیں۔

14۔ Alex Conte,''Human right in the prevention and punishment of terrorism'', Springen Publisher London, 2010, Pg 63-64

15۔ حمید انصاری، سخنِ بیداری، موسسہ تنظیم و نشر آثار امام خمینی، بین الاقوامی امور، تہران، ۱۹۹۸ء، ص: ۲۶۲

16۔ http://www.org.articles/2009/Dec.2009.

Cutting the fuse: The explosion of global suicide terrorism and how to stop it, by Robert A. Pape and James K. Fledman, Library of Congress cataloging-in -Publication, 2010, pg 156.

17۔ سابق وزیر اعلیٰ بلوچستان نواب اسلم رئیسانی نے مورخہ ۳۰ جون ۲۰۱۰ء کو ذرائع ابلاغ کے نمائندوں سے بات چیت کرتے ہوئے کہا تھا کہ "ڈگری، ڈگری ہوتی ہے چاہے اصلی ہو یا جعلی" [دنیا نیوز، روزنامہ عوام کراچی] اسی طرح مورخہ ۲۲ دسمبر ۲۰۱۱ء کو قصور میں تحریک انصاف کے جلسے میں کرسیوں کی لوٹ مار پر کہا تھا: "کرسی کرسی ہوتی ہے چاہے جس چیز کی ہو۔ [سماء ٹی وی، روزنامہ نوائے وقت کراچی]

18۔ سالِ گذشتہ آئی ایس آئی سکھر ہیڈ کوارٹر پر ہونے والے حملوں کی ذمہ داری، اسلام آباد بارکہوہ مسجد پر حملہ کی ذمہ داری، کوئٹہ میں پولیس ہیڈ کوارٹر پر ہونے والے خودکش حملہ کی ذمہ داری، سوات میں میجر جنرل ثناء اللہ سمیت تین دیگر ساتھیوں پر حملہ کی ذمہ داری سمیت طالبان دیگر کئی وارداتوں کی ذمہ داری قبول کر چکے ہیں۔ (حوالہ: معاصر اخبار بشمول ٹی وی چینلز)

19۔ عین شاہراہ پر، جدید ہتھیار سے لیس ہو کر اور فائرنگ کرتے ہوئے اس بات کی ضد کہ موجودہ حکومت فی الفور استعفیٰ دے اور میاں نواز شریف وزارت عظمیٰ کے اہل نہیں، ظاہراً اس طرح کا مطالبہ نہ شریعت کے عین مطابق ہے اور ہی اس کی کوئی شرعی توجیہ کی جاسکتی ہے اس لئے کہ یہ شخص شرعی احکام کے نفاذ کے برعکس عوام کو خوف و ہراس میں مبتلا کرنے کا مرتکب ہوا، ریاستی عملداری میں مخل ہوا، یہاں تک کہ ڈکیت بھی نکلا (سکندر ملک نے اپنے زیر استعمال کار زبردستی چھین لی تھی) کیا شریعتِ اسلام لوگوں کو خوف و ہراس میں مبتلا کرنے کا حکم دیتی ہے؟ کیا اسلام میں ڈکیتی کی کوئی گنجائش ہے؟ یا ریاست کے خلاف بغاوت جبکہ بظاہر حکومتی معاملات شریعت اسلام کے خلاف نہ ہوں، درست اقدام تھا؟

قرآنِ مجید نے اس طرح کے عمل (مصلح بننا) کے مرتکب افراد کی سرزنش یوں کی ہے: وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ قَالُوا إِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُونَ o أَلَا إِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُونَ وَلَكِن لَّا يَشْعُرُونَ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد نہ کرو تو جواب دیتے ہیں کہ ہم تو صرف اصلاح کرنے والے ہیں۔ خبردار ہو یقیناً یہی لوگ فساد کرنے والے ہیں لیکن شعور نہیں رکھتے۔ [سورہ بقرہ، آیت: ۱۱،۲۱] جبکہ حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ نے فرمایا: "عنقریب فتنے ہوں گے، خبردار ایک فتنہ ہوگا جس میں بیٹھا ہوا شخص کھڑے شخص سے بہتر ہوگا، کھڑا ہونے والا چلنے والے سے بہتر ہوگا، اس میں چلنے والا ڈورنے والے سے بہتر ہوگا۔" (مستدرک حاکم، ج ۴، دار الکتب العلمیہ، بیروت، س ن، ص: ۴۸۷)

عشق کی سلطنت

ڈاکٹر شیخ محمد حسنین *

Sheikh.hasnain26060@gmail.com

کلیدی الفاظ : عشق، سلطنت، امام حسینؑ، چہلم، مسیح، سقراط، زائرین، کربلا، نجف، سماج، مدینۂ فاضلہ۔

خلاصہ

یہ مقالہ مجلّہ نور معرفت کے 26ویں شمارے میں چھپنے والے "ایک آسمانی شہر کی سیاحت" نامی سفر نامے کی دوسری قسط ہے۔ یہ قسط بھی تخیلات سے کہیں زیادہ حقائق پر مبنی ہے۔اس قسط کا مرکزی خیال یہ ہے کہ ہمارے کرۂ خاکی پر "مدینۂ فاضلہ" سے کہیں بہتر "عشق کی سلطنت" آباد کرنا عین ممکن ہے۔ لیکن اِس شہر کی بنیاد، فلسفی حکمت پر نہیں، قلبی عشق پر رکھی جائے گی۔اس مقالہ میں عشق کی سلطنت کے حاکم کی خصوصیات اور اس کے باشندوں کا رہن سہن اور ان کی اجتماعی زندگی کا اجمالی خاکہ بیان کیا گیا ہے۔

مصنّف کے بقول، عشق کی سلطنت کا حاکم فقط حسین ابن علی علیہ السلام جیسا معصوم امام ہی بن سکتا ہے جس میں صبر مسیح ؑ اور جرأت سقراط سے بڑھ کر صبر و جرأت پائی جاتی ہو۔ جو کربلا کے دشتِ بلا و غم میں اپنا سب کچھ لٹانے کے بعد بھی خدائے یکتا کی بارگاہ میں " صبراً علیٰ قضائہ و تسلیماً لامرہ" کا نعرہ بلند کر سکتا ہو۔ نیز عشق کی سلطنت کے باشندے وہ بن سکتے ہیں جو باہمی اخوّت، رواداری، ایثار اور خیر سگالی کے جذبے کے تحت اجتماعی زندگی گزارتے ہوں اور اچھے، برے، سب حالات میں سلطنت کے وفادار رہیں۔

اِس مقالہ میں انسانی سماج کے معماروں کو یہ دعوت دی گئی ہے کہ اگر وہ کسی اعلیٰ انسانی سماج کی تشکیل کے درپے ہیں تو عشق کی سلطنت کا مشاہدہ کرنے کی غرض سے سید الشہداء کے چہلم کے موقعہ پر نجف و کربلا میں جمع ہونے والے کروڑوں زائرین کے عظیم الشان اجتماع کی روئیداد کا مطالعہ کریں۔

---

* ۔ڈائریکٹر نور الہدیٰ مرکز تحقیقات، استاد اصول و فقہ و فلسفۂ اسلامی، جامعۃ الرضا، بارہ کہو، اسلام آباد۔

ہم نے یہ رات **الکوت** کے شہر میں بسر کی تھی۔ اور آج صبح جب ہمارے مہربان میزبانوں نے ہمیں شہر کے جنرل بس سٹینڈ پر اتارا تو ایک ایسا عالم دیکھنے میں آیا کہ میزبان اور مہمان دونوں مات و مبہوت رہ گئے۔ دراصل، کوت کا شہر، دریائے دجلہ کے کنارے واقع ہے اور دریائے دجلہ میں ضرور سیلاب آتا ہے۔ لیکن جو سیلاب گذشتہ شب آیا، اِس شہر میں ایسے سیلاب کا کوئی سابقہ نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے کرم فرما بھی اُس رات پیش آنے والی صورتحال کا صحیح اندازہ نہ لگا سکے اور ہمیں بھی معلوم نہ تھا کہ ہم دجلہ کے کنارے تو کیا، دو ایسے طوفانی دریاوں کے سنگھم پر رات گزار رہے ہیں جو پانی کے قطروں سے نہیں، اشکوں کے قطروں سے بنے ہیں۔

در حقیقت، اس شہر میں دو طرف سے حضرت امام حسین علیہ السلام کے زائرین کا سیلاب امڈ آیا تھا۔ جنوب میں کوئی 330 کلومیٹر کے فاصلے پر واقع بصرہ سے، اور بصرہ سے بھی دور، خرم شہر کی ایرانی بارڈر سے زائرین کا ایک دریا، نجف کے بحرِ ولایت میں گرنے کے لئے ٹھاٹھیں مارتا آگے بڑھ رہا تھا اور شمال مشرق میں کوئی 85 کلومیٹر کے فاصلے سے مہران بارڈر سے پیر و جوان زائرین کا دوسرا دریا بھی الکوت کی جانب بہتا نجف کے ساحل کی طرف بڑھ رہا تھا۔

حضرت امام حسین علیہ السلام کے چہلم میں شرکت کی غرض سے ایران، پاکستان اور انڈیا جیسے ممالک کے باشندے کچھ اِس طرح نجف اشرف کی طرف رواں دواں تھے جیسے کوہ ہمالیہ کی بلندیوں سے پگھلنے والی برف کا پانی بحیرۂ عرب میں جا گرنے کے لئے رواں دواں ہو۔ مجھے تو دور دراز کے علاقوں سے نجف اور کربلا کی طرف بڑھتے قافلوں اور کوہ ہمالیہ سے بحیرۂ عرب کی طرف بڑھتے ندی نالوں اور دریاوں میں بڑی مماثلت نظر آئی۔ جو پانی چکر (Water Cycle) بحیرۂ عرب کے پانی اور کوہ ہمالیہ کی چوٹیوں پر جمی برف کے درمیان نظر آتا ہے، وہی حضرت امام حسین علیہ السلام کے زائرین اور نجف و کربلا کے درمیان نظر آ رہا تھا۔

پانی چکر میں آفتاب کی طمازت کے نتیجے میں سمندروں کے دل سے بادلوں کا خمیر مایہ اٹھتا ہے، بادل بنتے ہیں جنہیں ہوائیں اڑاتی، آسمانوں کی سیر کراتی، کوہ ہمالیہ کی چوٹیوں تک لی جاتی ہیں اور جب یہ بادل اِن بلندیوں کی سرد فضا میں پہنچتے ہیں تو برف بن جاتے ہیں۔ کچھ عرصہ اپنے سرچشمۂ حیات سے دوری کے بعد جب آفتاب کی طمازت کے نتیجے میں یہ برف پگھلتی ہے تو ندی نالوں کی صورت میں بہتی، دریا تشکیل دیتی، وہاں پہنچتی ہے جہاں سے اُس کا خمیر اُٹھا تھا۔ حضرت امام حسین علیہ السلام کا چہلم منانے کی غرض سے

کربلا و نجف کی طرف رواں دواں قافلوں کی داستان بھی بالکل ایسی ہی تھی۔ اِن کا خمیر مایہ بھی مشیت الٰہی کی طمازت کے نتیجے میں کربلا و نجف میں مدفون معصوم ائمہ طاہرین علیہم السلام کی ولایت کے سمندر سے اٹھا تھا۔ جیسا کہ حضرت امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے:

شِیعَتُنَا خُلِقُوا مِن فَاضِلِ طِینَتِنَا وَعَجِنُوا بِمَاءِ وِلَایَتِنَا (1)

یعنی: "ہمارے شیعوں کا خمیر، ہماری اضافی طینت سے اٹھایا اور ہماری ولایت کے پانی میں گوندھا گیا ہے۔"

لہٰذا مجھے یہ کہنے دیجئے کہ زائرین کے ان قافلوں کی مثال، بالکل اُس پانی کی مانند ہے جسے مشیت الٰہی کے آفتابِ عالم تاب کی طمازت نے بخارات بنایا اور گردش زمانہ کی ہوائیں اڑاتی دور دراز کی سرزمینوں تک لے گئیں۔ یہ وہاں کے سرد ماحول میں کچھ عرصہ منجمد رہے۔ لیکن اس سال بھی ہر سال کی طرح، محرم الحرام میں حضرت امام حسین علیہ السلام کی شہادت کی سوزش نے اِن کے قلوب کو ایسا گرمایا کہ یہ دل رکیک ہو کے قطرے بننے اور اشکوں کی صورت، آنکھوں سے ٹپکے۔ مظلومِ کربلا کی شہادت کے غم نے زائرین کے ابدان کو بھی ایسا گھائل کیا کہ وہ ندیوں، نالوں اور دریاوں کی طرح زمین و آسمان کے راستوں، جوق در جوق نجف اور کربلا کی طرف بہہ چلے۔ اِن کے تار و پود میں ولایت معصومین علیہم السلام کے آبِ زلال کی چاشنی اور اِن کی آنکھوں میں غمِ حسینؑ میں بہنے والے اشکوں کی کہانی رچی بسی تھی۔ یہ ایک قتیل العبرات (آنسوؤں کے کشتہ) کا چہلم منانے نجف و کربلا جا رہے تھے۔ ہر شخص کی زبان پر بس ایک ہی جملہ تھا: "**یا حسینؑ!**" یہ جملہ اُن کے خشک ہونٹوں سے نکلتا اور آنکھیں بگھو دیتا تھا۔ **درحقیقت، ہونٹوں پہ "یا حسینؑ!" اور آنکھوں میں "اشک" عشق کی سلطنت کے ہر باشندے کی بنیادی شناخت ہے۔** جس کے پاس یہ سند نہ ہو وہ عشق کی سلطنت کا مسافر یا سیّاح تو ہو سکتا ہے، باشندہ تصوّر نہیں کیا جا سکتا۔

☆☆☆☆

معاف کرنا! میرے قلم کی مطلق العنانی، بعض اوقات مجھے اِس کی عنان سنبھالنے سے عاجز کر دیتی ہے اور آج تو ویسے بھی اس کی حکمرانی ہے کیونکہ کربلا کے مسافروں کی داستان رقم کر رہا ہے۔ بات یہاں سے ایک اور سمت نکلی کہ آج صبح جب ہمارے میزبانوں نے ہمیں **الکوت** شہر کے جنرل بس سٹینڈ پر اتارا تو اتنا رش لگا تھا کہ میزبان اور مہمان دونوں مات و مبہوت رہ گئے۔ ہر طرف حضرت امام حسین علیہ السلام کے

زائرین نظر آ رہے تھے۔ ان میں سے اکثر نجف کے راہی تھے؛ لیکن آج نجف کی کوئی گاڑی میسر نہ تھی۔ یہ حالت دیکھ کر شوق اور خوف کا ملا جلا احساس ابھر رہا تھا۔ گویا ایک بار پھر ہمیں خوف و رجاء کی وادی میں اتارا گیا۔ خوف اس بات کا کہ الکوت سے نجف کا فاصلہ تقریبا 205 کلو میٹر بتایا جاتا ہے اور یہ فاصلہ طے کرنے کے لئے کوئی گاڑی میسر نہ تھی۔ اُمید یہ لگی تھی کہ کوئی نہ کوئی بندوبست ہو ہی جائے گا۔

لیکن خوف و رجاء کی آمیزش سے ایک تیسری کیفیت جنم لے رہی تھی اور یہی اصل کیفیت تھی۔ کیونکہ یہ شوق کی کیفیت تھی۔ میں تو اِس کیفیت سے اُس وقت گذرا جب چند ایرانی زائرین ایک وین ڈرائیور سے نجف لے جانے کی بات کر نا چاہتے تھے۔ ان کے ہمراہ چند بیبیاں بھی تھیں۔ ایرانیوں کو عربی نہیں آتی تھی۔ ہمارے ساتھیوں میں سے ایک کو اُن کی ترجمانی کا فریضہ انجام دینا پڑا۔ وین ڈرائیور کہہ رہا تھا کہ نجف سے ایک سو کلو میٹر کے فاصلے تک راستہ بلاک ہے، گاڑی نہیں جا سکتی۔ اِن بیبیوں کا کہنا تھا کہ ڈرائیور سے کہہ دو ہمیں نجف سے ایک سو کلو میٹر کے فاصلے پر ہی اتار دے۔ باقی ماندہ راستہ ہم پیدل چلیں گے، چلنے ہی تو آئے ہیں۔ یقین جانیے ! یہ سُن کر میں تو لمحہ بھر کے لئے شوق کی وادیوں میں کھو گیا۔ واہ ! اُس ناز پروردہ معاشرے سے تعلق رکھنے والی بیبیاں جو چند قدم کا سفر کاٹنے کے لئے بھی گھر کے دروازے پر ٹیکسی منگواتی ہیں، آج سراپا راہ نوردِ شوق بنی، کسی محمل و ساربان کے بغیر، خارِ مغیلاں پہ سفر کرنے کے لئے آمادہ نظر آئیں ! ع "یہ عالم شوق کا دیکھا نہ جائے !"

البتہ شوق کا جو عالم میں نے دیکھا، حضرت امام حسین علیہ السلام کے چہلم پر جانے والا ہر زائر ایسے کئی عوالم کا مشاہدہ کرتا ہے۔ یہ الگ بات کہ ہر فرد اپنے مشاہدات کو سپردِ قلم نہیں کر سکتا۔ لیکن جو مشاہدات کو قلم کی زبان عطا کر سکتے ہیں وہ انہیں ضرور قلمبند کرتے ہیں۔ اسد کاظمی نے بھی ایک ایسا مشاہدہ قلمبند کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

"رات تاریک تھی اور ہوا بے مہر۔۔ پاؤں رکھنے کو ہموار زمین تک نہ تھی اور نہ ہی آنکھوں میں اتنی سکت کہ زمین کے نشیب و فراز کی گتھیاں سلجھا سکتیں، کیونکہ غور سے دیکھنے کے لئے توقف درکار تھا اور توقف وہاں کہاں تھا؟ چاروں جانب گاڑیاں، کاریں، بسیں، ٹرالر، سائپا کے وانٹ، چھوٹے اور بڑے ٹرک، الغرض ہر قسم کی چیزیں موجود تھیں۔۔ لمبی قطاریں اور چیختے ہارن۔۔ رات کا آخری پہر آخری دموں پہ تھا اور یہ کچھ جاننے والے ہی جانتے ہیں کہ رات کے آخری پہر کی سرد مہری کیسی ہوتی ہے۔۔۔ میں نے موبائل فون میں جھانکا۔۔ چار بج کر چوبیس منٹ ہوئے تھے۔۔۔ ایسے وقت میں

تو تہجد گذار بیبیاں بھی اپنے گھروں سے نکلنے کا سوچتی تک نہیں۔۔ میں نے ایک بچہ گاڑی کے پاس سے گذرتے ہوئے سوچا۔۔ "یہ کون سی کشش ہے جو رات کے اس پہر میں ان معصوم بچوں کو ماؤں سمیت کشاں کشاں لئے جاتی ہے؟"۔۔ بچہ گاڑی پھنس گئی تھی اور مادر شیر خوار کا زور اسے نکالنے کو ناکافی تھا۔۔ میں نے ہاتھ آگے بڑھایا۔۔ اور بچہ گاڑی پتھروں میں راستہ بناتی آگے چل پڑی۔۔ میں نے بے ساختہ اپنا وہی گرد آلود ہاتھ اپنی آنکھوں پہ رکھ لیا۔۔ "(2)

سبحان اللہ ! ایک ماں کا سخت سردیوں کی رات، صبح چار بجے، اپنے شیر خوار معصوم کو بچہ گاڑی میں ڈالے کربلا کی طرف کشاں کشاں پیدل سفر ! (یاد رہے ! اِس بی بی اور اُس کے شیر خوار کی تصویر نہیں اتاری جا سکی۔ تاریکی تو تھی ہی، لیکن قلبی کیفیات کو Capture کرنے کے لئے کوئی کیمرہ بھی ایجاد نہیں ہوا) سبحان اللہ ! ایک پردہ نشین بی بی کا خوشی خوشی 100 کلو میٹر کا فاصلہ پیدل چلنے کا عزم وارادہ اور جوش وولولہ ! سبحان اللہ ! ایک بڑھیا ماں کا بچوں کی طرح ویل چیر پر سینکڑوں کلو میٹر کا سفر ! اور یہ طفلِ معصوم جو ابھی اپنے قدموں پر کھڑا نہیں ہو سکتا لیکن ہاتھوں اور زانوؤں کے سہارے علی اصغرؑ کا غم منانے چلا ہے۔ یقیناً اِس عزم وارادے کی توضیح و تفسیر، عصر حاضر کے میٹیریالسٹ ماہرین انسانیات کے بس کا روگ نہیں ہے۔

یہی وجہ ہے کہ میرے لئے تعجب سے بڑھ کر اِس سوال کا جواب ڈھونڈنا اہمیت اختیار کر گیا کہ ایسے لوگوں کے لئے جو حضرت امام حسین علیہ السلام اور آپؑ کے عشق سے آشنا نہیں، عشقِ حسینؑ کے ان بے نظیر مظاہر کی کیا توجیہات پیش کی جا سکتی ہیں ؟ یقیناً یہ معمہ ہمارے لئے حل شدہ ہے کہ جن بیبیوں کے دلوں میں ایک ایسے امام کی زیارت کا شوق موجزن ہو جس کی دلدادہ بہن نے مدینہ سے کربلا، کربلا سے کوفہ، کوفہ سے شام، شام سے کربلا اور کربلا سے مدینہ تک کا اتنا طولانی اور طاقت فرسا سفر محض امامت کا حق ادا کرنے کے لئے طے کیا، ایسی بیبیوں کے لئے اُس امام کے چہلم کا حق ادا کرنے کے لئے 100 کلو میٹر کا پیدل سفر طے کرنا کوئی بڑی بات نہیں ہے۔

لیکن اس سفر نامے کے بیان میں میرا اصل مخاطب تو ایسے لوگ ہیں جنہیں کسی نے کربلا کی کہانی نہیں سنائی۔ یقیناً ایسے لوگوں کو یہ راز سمجھانے کے لئے میں اپنی بات کا آغاز یہاں سے کرنا چاہوں گا کہ **عشق کی سلطنت کے باشندوں کی دوسری اہم شناخت یہی ہے کہ وہ امام حسین علیہ السلام کے عاشق ہوتے ہیں۔**

دراصل، عشق، چاہت کے شباب کا نام ہے اور چاہت، ارادے کی گود میں جنم لیتی ہے۔ فلسفیوں کے بقول

ارادہ بذات خود معرفت کا محتاج ہے۔ لہٰذا انسانی عشق و شوق اور عزم و ارادے کی جن کیفیات کا بیان اوپر گزرا، اُن کی گہرائی تک پہنچنے کے لئے ہمیں حضرت امام حسین علیہ السلام کی معرفت درکار ہے۔ امام حسین علیہ السلام کون ہیں؟ آپؑ کی معرفت کیا ہے؟

یقیناً ایک سفر نامے میں اس موضوع پر کوئی تفصیلی بات نہیں بتائی جا سکتی۔ بس اتنا جان لینا ضروری ہے کہ حضرت امام حسین علیہ السلام، بوستانِ بتول سلام اللہ علیہا میں اگنے والے اُس سروِ آزادی کا نام ہے جس نے صرف اللہ تعالی کے ذات کے سامنے سر جھکانا سیکھا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ظلم و استبداد کے سامنے سر جھکانے سے واضح انکار کیا۔ یزید یہ چاہتا تھا کہ آپ کا سر اپنے آستانۂ جبر و استبداد پر جھکا دے لیکن وہ ایسا نہ کر سکا۔ آپؑ کا سر کاٹا تو جا سکا، جھکایا نہ جا سکا۔ اور جب آپؑ کا سر کاٹ کر نیزے کی نوک پر چڑھایا گیا تو یہ قرآنِ ناطق، ایسا ناطقِ قرآن بنا کہ خود کھلی کتاب بن گیا۔ لہٰذا اب قیامت تک قرآن کی تلاوت کے ساتھ ساتھ حضرت امام حسینؑ کی کہانی بھی دہرائی جاتی رہے گے۔

ہر سال لاکھوں، کروڑوں مسلمان اِس نواسۂ رسول ﷺ کا چہلم منانے نجف و کربلا میں جمع ہوتے رہیں گے۔ اور جگر گوشۂ بتول قیامت تک اپنے چاہنے والوں کو آزادی اور حرّت کا درس دیتے رہیں گے۔ حضرت امام حسین علیہ السلام اہل دنیا کے سامنے ہمیشہ کھلی، وہ روشن کتاب ہیں جس کے سر ورق پر یہی لکھا ہے کہ انسان اپنے زمانے کے ظالم اور جابر حکمرانوں اور اپنے دور کے استعمار اور طاغوت سے اُس وقت نجات پا سکتا ہے جب اپنی گردن اُس یکتا معبود کی بارگاہ میں جھکا دے جس نے انسان کو اپنی بندگی پر بھی مجبور نہیں کیا۔ بلکہ اُسے بندگی اور سرکشی کے درمیان مکمل اختیار دے کر حرّیت اور آزادی کو انسان اور غیر انسان میں وجہ امتیاز بنا دیا ہے۔ اللہ تعالی نے عالمِ تکوین پر اپنا جبر حاکم فرمایا ہے لیکن عالمِ تشریع کی بنیاد اپنے بندے کے اختیار اور آزادی پر رکھی ہے۔

لہٰذا جس بندگی کی بنیاد، انسان کی آزادی اور اختیار پر نہ رکھی جائے اللہ تعالی کو وہ بندگی قبول نہیں ہے۔ حضرت امام حسین علیہ السلام کا سب سے بڑا کارنامہ یہی ہے کہ آپؑ نے اللہ تعالی کی بندگی کو آزادی، اختیار اور حریّت کی وہ اساس فراہم کر دی کہ اب قیام تک اللہ کی بندگی کو کوئی جبر قرار نہیں دے سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت امام حسین علیہ السلام کا تعارف کرواتے ہوئے حکیم الامت علامہ اقبال فرماتے ہیں:

بہر حق در خاک و خون غلطیدہ است　　پس بنائے لا الہ گردیدہ است

آپ علیہ السلام کے بارے میں علامہ اقبال کا یہ کلام بھی قابل غور ہے:

تیغ لا چون از میان بیرون کشید　　از رگِ ارباب باطل خون کشید
نقش الا اللہ بر صحرا نوشت　　سطر عنوان نجات ما نوشت

یعنی: "حضرت امام حسینؑ حق کی خاطر خاک و خون میں غلطاں ہو کر "لا الہ الاّ اللہ" کی محکم بنیاد بن گئے ۔۔۔آپؑ نے جب یزید کی بیعت کے انکار کی تلوار نیام سے نکالی تو قیامت تک کے اربابِ باطل کی رگوں کا سارا خون بہا دیا۔ آپ نے کربلا کے صحرا پر ہمیشہ کے لئے "**فقط اللہ کی بندگی**" کا نقش گاڑھ دیا اور یوں ہماری نجات کی سطر کا اصل عنوان رقم کر دیا۔"

خلاصہ یہ کہ حضرت امام حسین علیہ السلام کی معرفت میں کم از کم اتنا جان لینا بہت ضروری ہے کہ آپؑ وقت کی وہ گونجتی آواز ہیں جو ہر جابر و ظالم حکمران اور استعماری اور طاغوتی نظام کو للکار رہی ہے۔ اور آپ کا چہلم منانے وہی نکلیں جو آپؑ کے مکتب پر مکمل یقین رکھتے ہوں اور آپؑ کی صدائے استغاثہ پر لبیک کہہ سکتے ہوں۔

☆☆☆☆

بلند حوصلوں کے مالک تو الکوت ہی سے پیدل نجف کے طرف چل پڑے۔ ہم جیسے کمزور بدن، کمزور ایمان کسی سواری کی تلاش میں تھے۔ کافی دیر بعد ایک دیو ہیکل ٹریلر زائرین سے بھرتا نظر آیا۔ سب نے دوڑ لگائی اور سوار ہو گئے۔ شہر سے نکلے تو کسی نے راستہ روک لیا۔ میں تو پریشان ہوا کہ پولیس والوں نے روک دیا ہے، نہیں معلوم ڈرائیور ان سے کوئی مک مکا کر بھی پاتا ہے یا نہیں۔ لیکن جب مک مکا ہونے لگا تو معلوم ہوا کہ جب تک سواریاں نیاز نہ کھالیں آگے نہیں بڑھنے دیا جائے گا۔ ویسے یہ بڑا دلچسپ مک مکا تھا جو مجھے بہت یاد رہے گا۔

خیر چل پڑے لیکن ہر چند کلومیٹر کے فاصلے پر رک کر نیاز تقسیم کرنے والوں کے ساتھ کچھ نہ کچھ مک مکا کرنا ہی پڑتا۔ روڈ کے ایک طرف پیدل چلنے والے زائرین کا ٹریک تھا جو دو سو کلومیٹر پیدل چلنے کا سودا سر مول لئے سوئے منزل رواں دواں تھے۔ جوں جوں نجف اشرف کے قریب تر ہوتے جا رہے تھے لوگوں کا ہجوم بڑھتا جا رہا تھا۔ ٹریلر بھی 50 کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے زیادہ تیز نہیں چل سکتا تھا۔ لہٰذا ہمیں لگ بھگ چار گھنٹے بھاگتے ٹریلر میں پاؤں کے بل کھڑے سفر کاٹنا پڑا۔

میرے پاؤں پر سوجھن چڑھنے لگی۔ حوصلہ جواب دینے لگا۔ اِس تکلیف دہ صورتحال کو برداشت کرنا آسان نہ تھا۔ اپنے حوصلے کو امکان کی آخری حد تک بڑھایا۔ لیکن تھک اتنا گیا تھا کہ ایک قدم رکھتا، ایک اٹھاتا، وہ رکھتا، دوسرا اٹھاتا۔ بارِالہا! یہ سفر کب کٹے گا! میں نے زندگی میں کبھی اتنا طولانی سفر یوں کھڑے ہو کر اس کربناک حالت میں نہیں کیا تھا۔ تاہم جب میری ہمت بالکل جواب دینے لگتی تو اُن لوگوں کو دیکھ کر جوان ہونے کی کوشش کرتا جو سڑک کے دوسرے ٹریک پر پیدل چل رہے تھے۔ اس سے حوصلہ کافی بڑھ جاتا تھا۔ لیکن جو بات سب سے زیادہ حوصلہ افزا تھی وہ یہ خیال تھا کہ اُن مسافروں کے عشق میں سفر کی یہ صعوبت اٹھا رہے ہیں جنھوں نے بے پلان بھاگتے اونٹوں پر سفر کاٹے! ہم جوان ہیں، مرد ہیں، ہمارے ہاتھ پسِ گردن نہیں بندھے، ہماری گود میں معصوم بچے نہیں جن کے گر جانے کا خدشہ ہو۔

ہمارے سفر کی سختی کہاں اور اُن مسافروں کے سفر کی سختی کہاں جو بے پلان اونٹوں پر سوار تھے۔ جن کے ہاتھ پابندِ رسن تھے۔ جن میں مرد کم، کبھی سفر نہ کرنے والی بیبیاں زیادہ تھیں۔ جن کی گودیوں میں معصوم بچے بھی تھے جنہیں سنبھالا نہ جاسکتا تھا۔ اِن مسافروں کو راستے میں نذر و نیاز، شربت پانی تو درکنار، دھوپ میں ٹھہرایا جاتا اور احوال پُرسی تو کجا، تازیانے مارے جاتے تھے۔ ستم بالائے ستم یہ کہ یہ کوئی عام مسافر نہ تھے۔ یہ اُس نبی کی بیٹیاں تھیں جن کی رسالت کی منافقانہ گواہی ساربان دے رہے تھے۔ یقیناً جب فوج اشقیاء سے "اشهد انّ محمدا رسول الله" کی آواز بلند ہوتی ہو گی تو رسول ﷺ کی بیٹیاں آپ کی بارگاہ میں اپنی کسمپرسی کا شکوہ ان الفاظ میں کرتی ہوں گی: "وا محمداه! صلى عليك مليك السماء و نحن بناتك سبايا" (وا محمداہ! آپ پر آسمان کے ملائیکہ کا دورد و سلام اور ہم آپ کی بیٹیاں قیدی بنالی گئی ہیں!)

جب ہم نجف سے کوئی بیس تیس کلومیٹر کے فاصلے پر پہنچے تو ٹریفک جام ہونے لگا۔ میری تمنا تو یہ تھی کہ ٹریلر والا ہمیں یہیں اتار دے۔ کہیں یہ بیچارہ ٹریفک میں ایسا نہ پھنس جائے کہ نکل نہ سکے۔ نیز ہماری آسانی بھی اسی میں تھی کہ نیچے اترتے تو کچھ دیر ستا لینے کا موقعہ فراہم آ جاتا۔ لیکن مجھے ڈرائیور پر بہت تعجب تھا۔ گویا اُس نے اپنا عزم اس بات پر جزم کر رکھا تھا کہ زائرین کو حضرت علی علیہ السلام کے مقدس آستان کی قریبی ترین سرحد تک پہنچائے بغیر واپس نہیں لوٹے گا۔ یہاں تک کہ اس نے نجف کے اُس محلے میں پہنچا دیا جسے "نزلہ" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

جب ہم نجف پہنچے، عصر کا وقت ڈوب رہا تھا۔ سڑک کے کنارے ایک بی بی تنور پر کھڑی روٹیاں لگاتی نظر آئی۔ میں نے سوچا یہ بی بی اپنے بچوں کا پیٹ بھرنے کا بندوبست کر رہی ہے۔ لیکن جب ٹریلر سے اتر کر چند لڑکے بھاگے بھاگے تنور کی گرم گرم روٹی پر لپکے تو معلوم ہوا کہ زائرین کا پیٹ بھرنے کا بندوبست جاری ہے۔ میں نے الکوت سے یہاں تک کم و بیش کچھ نہ کھایا تھا۔ بس ایک آدھ مرتبہ نیاز لے لی تھی۔ یوں ایک لحاظ سے تو میں کامیاب ہوا کیونکہ جہاں کئی مسافرین نے رفع حاجت کی فرصت پیش نہ آنے کی مسلسل شکایت کی، میں انتہائی سکون سے رہا۔ لیکن اب 5/6 گھنٹے کی تھکاوٹ اور بھوک کے بعد تنور کی گرم گرم روٹی کھانے کو میرا جی بھی للچایا۔ اتفاق سے آدھی روٹی میرے حصے میں بھی آئی۔ گرم گرم! دو تہہ میں پکی روٹی اپنے پیٹ میں پیاز اور دھنیا جیسی نیم پکی، نیم کچی سبزیاں لپیٹے، برگر سے کم لذیذ نہ تھی!

نجف اشرف کوئی اتنا بڑا شہر نہیں ہے۔ اس چھوٹے سے شہر میں لگ بھگ چالیس پچاس لاکھ زائرین کا بیک وقت سما جانا معجزے سے کم نہیں(3)۔ یہ معجزہ خود اہل عراق اور اہل نجف دکھاتے ہیں۔ یہاں مدینہ منوّرہ میں باندھے جانے والے عقدِ اخوت کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ کیونکہ چہلم کے موقعہ پر کسی نجفی کا گھر اُس کا شخصی گھر نہیں رہتا۔ کم و بیش ہر نجفی سال بھر اِن ایّام کے انتظار میں رہتا ہے اور مولیٰ علی مرتضیٰؑ اور مظلومِ کربلا کے زائرین کی مہمان نوازی کی تیاریاں کرتا رہتا ہے۔ لہٰذا چہلم کے ایام میں جب تک نجفیوں کے گھروں میں تل دھرنے کی گنجائش موجود ہوتی ہے، اُن کا دروازہ زائرین پر کھلا رہتا ہے۔ اور جب سب مکان بھر جاتے ہیں تو نجف کے گلی کوچے اور سڑکیں مسکن بن جاتی ہیں۔ **درحقیقت، یہ ایمانی اخوت اور ایثار و فداکاری عشق کی سلطنت کے باشندوں کی تیسری بڑی شناخت ہے۔** جس میں یہ علامت نہ پائی جاتی وہ حضرت امام حسین علیہ السلام کی نگری کا باشندہ نہیں کہلا سکتا۔

☆☆☆☆

یاد رہے! چہلم کے موقعہ پر مولیٰ امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام کے حرم کے سنہری گنبد کو دور سے دیکھ لینا اور دُور سے آپؑ کا زیارتنامہ پڑھ لینا کافی ہے۔ لیکن اگر کوئی زائر ضریح کے پاس پہنچے بغیر اپنی زیارت کو ناقص تصور کرے تو اُسے چاہیے کہ الگ سے دھکم پیل نہ کرے؛ بلکہ اپنے آپ کو ضریح کے گرد دیوانہ وار طواف کرنے والے زائرین کی موجوں کے حوالے کر دے۔ وہاں لمحہ بہ لمحہ زائرین کا ایک سیلابی ریلہ

"حیدر! حیدر! لبیک یا حیدر!" کہتا ضریح کے پاس سے گذرتا ہے۔ اگر اس ریلے میں شریک ہو جائیں تو ضریح کا نیم طواف ہو سکتا ہے، بصورت دیگر، اپنی شخصی طاقت پر کوئی کمتر ہی ضریح کے پاس پہنچ پاتا ہے۔

بہر صورت، ہر زائر کی توجہ اِس بات پر جمی رہے کہ زیارت کا اصل مفہوم، مولیٰ کی خدمت میں عرضِ ادب اور حالِ دل بیان کرنے میں پوشیدہ ہے۔ جی ہاں! حالِ دل کا بیان اپنے اندر عجیب لذت رکھتا ہے۔ دراصل، اسلامی ادبیات میں حالِ دل کا بیان "مناجات" کا ایک اساسی رکن شمار ہوتا ہے۔ مناجاتِ الٰہی میں لذّت، کیف اور جذب و مستی کا عنصر، حالِ دل کے واقعی بیان ہی سے شامل ہوتا ہے۔ اور حال دل کا واقعی بیان یہ ہے کہ ایک تہی دست، کنگلا فقیر، اپنے آپ کو ایک ہر لحاظ سے غنی ذات کے دربار میں حاضر پا کر اپنے ٹوٹے دل کی کرچیاں اپنی دونوں ہتھیلیوں پہ رکھے اُس غنی کی بارگاہ میں یہ عرض کر رہا ہو کہ:

پروردگارا! میرے پاس اس ٹوٹے ظرف کے سوا کچھ نہیں؛ میرے فقر پر رحم فرما!

بارگاہِ الٰہی کے مقرّبین کی تعلیمات یہ بتاتی ہیں کہ اللہ تعالی نے ایسی دعاوں میں اپنی حتمی قضا کو بدل دینے کی طاقت رکھ دی ہے۔ (4) مناجاتِ الٰہی کی طرح مقرّبانِ بارگاہ الٰہی اور معصومین علیہم السلام کی زیارت میں بھی لذّت کا عنصر حالِ دل کے بیان سے شامل ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر زائرین اپنے مولیٰ و آقا کی خدمت میں اپنے تمام دکھوں، پریشانیوں اور مصیبتوں کا حال سناتے ہیں اور اُنہیں بارگاہ الٰہی میں اپنا شفیع بناتے ہیں۔ لیکن بعض زائرین بھی کمال کے لوگ ہوتے ہیں۔ میں ایک ایسے زائر کی بات کروں گا۔ یہ زائر جب مولیٰ امیر المؤمنین علیہ السلام کی ضریح کے پاس پہنچا تو اُس کی ساری توجہ اپنے مولیٰ کو ایک ایسی بیٹی کا حالِ دل سنانے پر لگی تھی جس نے خدا کی راہ میں کربلا کے میدان میں عون و محمد جیسے بیٹے، علی اصغر جیسے شیر خوار، علی اکبر و قاسم جیسے بھتیجے اور عباسؑ علمدار اور حضرت امام حسین علیہ السلام جیسے بھائی قربان کیے۔ لیکن یہ بیٹی کربلا میں لٹ جانے کے بعد کبھی اپنا بابا اور مولیٰ کی خدمت میں حاضر ہو کر حالِ دل بیان نہ کر سکی تھی۔

یقیناً اِس زائر کو حضرت زینب سلام اللہ علیہا کے اس قلق کا شدّت سے احساس تھا۔ لہٰذا وہ بی بی زینب سلام اللہ علیہا کا ترجمان بن کر آپ کے بابا کی بارگاہ میں بی بی کا حالِ دل اپنے الفاظ میں سنا رہا تھا۔ لیکن بہت مختصر۔ اُس نے کربلا کی ساری کہانی بیان نہیں کی اور نہ ہی کربلا کے ایک ایک شہید کی شہادت پر بی بی کے دل پر ٹوٹنے

والے کوہِ غم کا نوحہ سنایا۔ اُس نے بی بی کے حالِ دل کی ترجمانی کرتے ہوئے بس ایک ہی جملہ اپنے مولیٰ و آقا کی خدمت میں بیان کیا اور اُس کے بعد مصائب کے بحرِ بیکراں میں ڈوب گیا۔ وہ جملہ یہ تھا:

" بابا! مجھے رسن بستہ، بازاروں اور درباروں میں لے جایا گیا! "

زینب کی یہ مصیبت، کربلا کے تمام مصائب سے بڑی مصیبت تھی۔ اِس مصیبت پر جس قدر گریہ کیا جائے کم ہے۔ ایک بیٹی اپنے بابا کی خدمت میں اس سے بڑی کس مصیبت کا حال سناتی! بی بی کی چادر لوٹ لی گئی تھی اور آپ کو نامحرموں کے ہجوم میں کوفہ وشام کے بازاروں اور درباروں میں گھمایا گیا! درحقیقت، یہ مصیبت بی بی زینب (س) کی نہیں، عالمِ اسلام کی سب سے بڑی مصیبت ہے۔ اس لئے کہ سن 61 ہجری میں بھی لوگوں کا خیال یہ تھا کہ زینبؑ، علیؑ کی بیٹی ہے اور لوگ آج بھی یہی سمجھتے ہیں کہ زینبؑ، علیؑ کی بیٹی تھی۔ لیکن کوفہ کے دربار میں بی بی نے قیامت تک کے لئے اِس سوچ پر خطِ بطلان کھینچ دیا تھا۔ آپ نے اپنے خطبہ کی ابتداء میں فرمایا تھا: الحمد للہ و الصلاۃ علی ابی محمد! یعنی: "سب ثنائیں اللہ تعالی کے ساتھ مخصوص ہیں **اور درود و سلام ہو میرے بابا محمد (ﷺ) پر!** " بی بی نے اپنے خطبہ میں واضح کر دیا کہ میں علی کی بیٹی ہونے سے پہلے محمد ﷺ کی بیٹی ہوں۔ لہٰذا جس مسلمان کا حضرت محمد ﷺ کے ساتھ کوئی رشتہ ناطہ ہے، اُس کا قیامت تک یزید اور یزیدی طرزِ تفکر کے ساتھ کوئی رشتہ ناطہ نہیں ہو سکتا۔ اور جسے ناموسِ رسالت کا کچھ پاس ہے، وہ وقت کے یزید سے نبی کی بیٹی کی چادر کا انتقام لئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ البتہ علی علیہ السلام کی بیٹی نے جہاں عام مسلمانوں کی یہ غلط فہمی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دور کر دی کہ علی کی بیٹی ہونے اور نبی کی بیٹی ہونے میں کوئی فرق نہیں، وہاں آپ نے یزید ملعون کی ایک غلط فہمی بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دور کر دی۔ یزید کا خیال تھا کہ وہ حضرت امام حسین علیہ السلام کو شہید کر کے حضرت علی علیہ السلام کا ذکر اور اہل بیت اطہار علیہم السلام کی یاد تک مٹا دے گا۔ لیکن بی بی نے دربارِ شام میں دوٹوک الفاظ میں یزید کو بتا دیا کہ:

" کِدْ کَیْدَکَ وَ اجْهَدْ جُهْدَکَ فَوَاللهِ الَّذِیْ شَرَّفَنَا بِالْوَحْیِ وَالْکِتَابِ وَ النُّبُوَّةِ وَ الْاِنْتِخَابِ لَاتُدْرِکُ اَمَدَنَا وَ لَاتَبْلُغُ غَایَتَنَا وَ لَاتَمْحُوْ ذِکْرَنَا "

یعنی: " (اے یزید!) تو ہر حربہ اپنا لے اور اپنا پورا زور لگا لے! اُس اللہ کی قسم! جس نے ہمیں وحی، کتاب، نبوّت اور برگزیدہ ہونے کا اعزاز بخشا ہے، نہ تو ہمارے جیسی شان و شوکت حاصل کر سکتا ہے، نہ ہماری انتہاء کو پہنچ سکتا ہے اور نہ ہی ہمارا ذکر مٹا سکتا ہے۔ " (5)

مولیٰ علی علیہ السلام کی بیٹی کی پیشین گوئی کی صداقت کی گواہی نجف سے کربلا کے راستے پر لگے چند بینرز پر نقش ایک تسبیح کے عکس کے نیچے سرخ قلم سے لکھا یہ جملہ دے رہا ہے: **"لن تمحو ذکرنا"** (تو کسی صورت ہمارا ذکر نہیں مٹا سکتا!)

☆☆☆☆

نینویٰ کے مسافر

چاہیے تو یہ تھا کہ میں ایک ہی نشست اور قسط میں یہ داستان مکمل کرتا، لیکن تساہل پسندی کی وجہ سے اس بار بھی یہ داستان مکمل نہ ہو سکی۔ دراصل، نجف سے کربلا کی طرف زائرین کے پیدل چلنے کی داستان رقم کرنا آسان نہیں ہے۔ یہ کہانی ایک ایسی مشکل اور مقدس کہانی ہے جسے لکھنے کے لئے کافی وقت درکار ہے۔ توفیق حاصل رہی تو ان شاء اللہ اسے مکمل کیا جائے گا۔ البتہ اس داستان کو مکمل کرنا اور اس کی تشہیر اس لئے ضروری ہے کیونکہ عصر حاضر کا پلید اور آلودہ میڈیا اسے کبھی پیش نہیں کرتا۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ میڈیا اگر اس کہانی کو لکھنا بھی چاہے تو نہیں لکھ سکتا۔ لیکن وہ لکھے گا کیونکر؟ بھلا صیہونیّت اور یزیدیّت کی تجوریوں پر چلنے والے عالمی میڈیا سے کب یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ نینویٰ کے مسافروں کی داستان اہلِ دنیا کے سامنے پیش کرے؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ استعمار کے آلۂ کار، حضرت امام حسین علیہ السلام کی للکار کو اہلِ اقطارِ عالم تک پہنچائیں؟ یہ نہیں ہو سکتا۔

یزید نے یہ چاہا تھا کہ کربلا کی کہانی، کربلا میں دفن ہو جائے اور عصر حاضر کی یزیدیّت بھی یہی چاہتی ہے۔ لیکن بی بی زینب (س) کے ماننے والوں نے آج بھی زینبی فریضہ انجام دینا ہے۔ لہٰذا ہر عزادار کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ نینویٰ کے مسافروں کی کہانی کی ایسی تشہیر کرے کہ یہ داستان مشرق و مغرب کے ہر زندہ ضمیر انسان کے عقل و قلب پر نقش ہو جائے۔ میں تو اِسی جذبے کے تحت اپنے حصّے کا فریضہ انجام دے رہا ہوں۔ آیا آپ بھی اس فریضہ کی انجام دہی میں کچھ تعاون فرما سکتے ہیں؟ ذرا سوچیں اور دعا فرمائیں کہ ہم جلد دنیا والوں کو نینویٰ کے مسافروں کی داستان موثر انداز میں سنا پائیں! (آمین!)

حوالہ جات

1 ۔ الشیخ محمد مھدی الحائری، شجرہ طوبی، منشورات المکتبہ الحیدریہ، نجف الاشرف؛ ج1، ص 3۔العلامہ المجلسی، بحار الانوار، دار احیاء التراث العربی، بیروت، لبنان، ج53، ص303۔

2 ۔https://www.facebook.com/notes/syed-asad-ali-kazmi

3 ۔ شیعہ نیوز کے مطابق اس سال (2014) 19 ملین زائرین حضرت امام حسین علیہ السلام کے چہلم میں حاضر ہوئے۔ جبکہ حضرت امام حسین علیہ السلام کے حرم کے امام جمعہ نے چہلم کے موقعہ پر اپنے نماز جمعہ کے خطبے میں بتایا کہ اِس سال ایک کروڑ چالیس لاکھ (14 ملین) عراقی اور غیر عراقی زائرین نے چہلم کے موقعہ پر حضرت امام حسینؑ کے حرم کی زیارت کی ہے۔ لہٰذا اگر 14 ملین ہی کو مسلم تعداد مانا جائے تو یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس تعداد میں سے اگر 6 ملین زائرین نجف و کربلا کے مابین یا دیگر راستوں پر اور باقی تعداد کا نصف نصف بھی نجف اور کربلا میں ہوں تو اربعین سے تین دن پہلے تک کم از کم 4 ملین زائر نجف میں موجود ہوتے ہیں۔

4 ۔ العلامہ المجلسی، بحار الانوار، دار احیاء التراث العربی، لبنان، بیروت، ج، 99، ص 55۔ حضرت امام رضا علیہ السلام کی زیارت کے بعد کی منقول دعا میں یہ جملہ وارد ہوا ہے: اسئلك بالقدرة النافذة فی جمیع الاشیاء و قضائك المبرم الذی تحجبه بایسر الدعاء

5 ۔ الشیخ الطبرسی، الاحتجاج، دار النعمان للطباعۃ والنشر، النجف الاشرف۔1966؛ ج2، ص37۔

THE ASPECTS OF MIRACLE OF QURAN AND SARFA THEORY

By: Syed Muhammad Mousbi
musavi1087@gmail.com

***Key Words**: Quran, Miracle, Prophet, Syed Murtaza Almuhuda, Khwaja Naseer Toosi.*

Abstract:

Islam, as a religion in accordance with the nature, takes along its invitation on the basis of wisdom. It best uses all of the available sources to guide humanity towards its natural destiny. So Allah's Messengers (Prophets) bring with them the code of life that grants the goodness for humanity.

But the question is how to distinguish between a truer or faker? This needs for miracles here. The miracle is such an act the human beings cannot perform, except the prophets. As such, we can recognize a true prophet from a falsifier through his miracles. The miraculous character of The Holy Quran is the miracle of The Holly Prophet, Hazrat Muhammad (P.B.U.H) for ever. But the main Question here is: what makes The Holly Quran a miracle? Is there its unusual and transcendent literal language or something else?

There are some theorists to answer the question. One of them is Syed Murtaza Alamulhuda, who introduced "Sarfa Theory" (deflecting/diverting theory) according to which God deflects everyone who wishes to take up the challenge of bringing synonymous script to Quran. In this article, the "Sarfa Theory" is presented. The article is an analytical study of the theory.

DISJOINTED LETTERS:
AN ANALYTICAL STUDY OF DIFFERENT VIEWS (3)

By: **Saqib Akbar**
ukhuwat@gmail.com

Key Words: *Names of prophets, numbers, qur'anic oaths, Ha'I bin Akhtab*

Abstract:

A lot of work has been done on disjointed letters in Arabic and Persian wherein the views of philosophers are of great significance. In Urdu, on the contrary, a little work has been done. Even, some people have considered it a wastage of time to contemplate about them. However, these letters have appeared in the beginning of many chapters in Quran and contain amazing meanings. Keeping in mind the importance of these letters, we have made a little attempt to draw the attention of scholars and intellectuals towards the issue.

In the previous parts of the article, twelve views had been discussed. Now, some other views are presented. The thirteenth view regarding the disjointed letters is that these are the names of the Holy Prophet (PBUH). These letters have been introduced as oaths in fourteenth view i.e. these are oaths taken by Allah almighty. In fifteenth view these letters appear to be the life-time of the nations. On the basis of this view, some have asserted that the Muslim nation is to live till the doomsday. Researchers have however rejected this last view.

THE SIGNIFICANCE OF RELIGIOUS CULTURE IN THE VIEW OF QURAN

By: ***Syed Rameez al Hassan Mosavi***
srhm2000@yahoo.com

Key Words*: Culture, civilization, beliefs, values, Arab society, education and socialization*

Abstract:

The cultural side of human life is very significant. If human culture is lost, other aspects of human life will be affected. Culture is instrumental in the identification of human beings in their collective social life. According to scholars, culture is the acquired, deliberate, and conscious behavior or the mode of action. Culture has, however, not a universally agreed definition. Ideas and beliefs are the most important elements of culture. Any change and alteration in ideas and beliefs pave the way for profound changes in different nations. For example, the Holy Prophet (PBUH) changed the ideas and beliefs of Arabs and, as a result, their culture also got changed. The addition of the word 'Islamic' in words like culture, custom, and norms indicates that these have been inferred from Islam. When a society is ruled by the religious and qur'anic beliefs, that society would embrace Islamic and qur'anic culture and nothing would be happened there against qur'anic teachings. According to Quran, only those can be guardians of human culture who are chosen by Allah. Allah almighty has given predominance to those who have accepted the responsibility of looking after the cultural matters. According to Quran, a pure, refined, and real life can be enjoyed only under the shadow of divine culture. Material life, according to Quran, can be flourished by the faith on God and act upon the religious commands. The promotion of divine culture in a duty in the view of Quran. The major jihad of the experts of religious culture is to promote qur'anic teachings.

ISLAM AND SOCIAL JUSTICE AND EQUITY

By: ***Syed Husnain Abbas Gardezi***
hasnain.gardezi@gmail.com

Key Words: *Justice, justice system of Quran, economic justice, social justice, extravagance.*

Abstract:

Islam is the religion of justice and moderation. Justice is to put things on their proper and right place, and to undertake every task nicely. Allah is just and every deed of Him is in accordance with justice and reason. Physically and structurally, the world is based on the justice system of Allah. Legally, the code of life, laws, and religion given by Allah is also based on justice. In Islam, there is a specific balance in all matters and commands. The justice and balance in Islamic commands actually highlights Islam's being a religion of balance and just. In this article, an attempt has been made to explain the Islamic concept of justice in the light of Quran and the conduct of the infallible imams. This piece of writing also deals with the topic such as worship of god, appreciation and criticism, love and antagonism, expenditures of daily life, family and married life, economic life, distribution of resources, social justice, and equality before law.

AHADITH AND PRINCIPLES OF AHADITH IN NAHJUL BALAGHSH

*By:**Dr. Roshan Ali***
roshanali007@yahoo.com

***Key Words**: Hadith, tradition of the prophet, quotation, practice, qisas, hoddod, narrator of hadith, wisdom.*

Abstract:

Nahjul Balaghah is the collection of Imam Ali's (as) kala'am (words). It is a treasure of matchless wisdom and knowledge and it has been acknowledged throughout all eras. Comprehensive guidance has been given in it for every dimension of human life. There are many ahadith (sayings) of the holy prophet (PBUH) in nahjul balaghah. Imam Ali (as) has mentioned some ahadith of the Holy Prophet (PBUH) in nahjul balaghah by saying "he (PBUH) has said", "he Said to me" "I heard form him", "he was saying" etc. In several places, Imam (as) has described ahadith without referring to the Holy Prophet (PBUH). In some other place, we can find the meanings of ahadith in the words of Imam. In this article, we will try to point out the words and tradition of the holy Prophet (PBUH) in nahjul balaghah. Along it, we will try to present the principles of ahadith that have been given by the imam that includes the type of ahadith, the methods of evaluating ahadith, kinds of the narraters of ahadith and the standing of their narrated ahaditjh.

THE METHODS OF FIGHTING ANXIETY IN THE LIGHT OF QURAN AND HADITH

By: ***Syed Aqeel Haider Zaidi***
aqeel.zaidi1968@gmail.com

Key Words*: Anxiety, restlessness, peace and rest, faith, trust in God, desire, providing with the means of subsistence (razzaqi'at), the Lord, asceticism (zohud), patience, social relations.*

Abstract:

Human being, by their nature, want to lead a peaceful life, away from every sort of pain and hardship. But, sometimes, humans deviate from their pure nature and start to search peace and calmness in another things, ignoring the fact that peace and calmness is actually in faith on god, believe in his promises, struggle in His path, and to follow Islam. It is especially relevant when humans provide ground for anxiety by themselves and when try to pull out themselves from that state of mind. Islam has given very explicit and basic methods and techniques to lead a peaceful life. This article describes some of the basic methods to counter anxiety in the light of Quran and hadith.

THE PHILOSOPHICAL BASIS OF ISLAMIC AND WESTERN EDUCATION AND NURTURE

By: ***Syed Ali Jawwad Hamdani***
alihamadani@gmail.com

Key Words*: Education, Nurture, Philosophical basis, Islam and west*

Abstract:

Education and nurture is one of the chief elements of human development and progress. That is why Islam stresses on the significance of the both. It also provides a complete guidance for all the dimension of human life; particularly education and nurture. Unfortunately, today, the whole system of education and nurture in muslim world is based on western infidel thoughts. Now, it our responsibility to prepare and formulate detailed system of education and nurture according to Islam.So, the objective of this paper is to highlight the differences between Islamic and western of philosophy, basic and universal basis, vis-à-vis education and nurture. The philosophical basis of education and nurture of Islam and west have been discussed in four important respects:

(1) epistemological basis education and socialization;
(2) ontological basis education and socialization;
(3) axiological basis education and socialization.
(4) anthropological basis education and socialization.

The study of such differences is a first step towards figuring out the main reasons behind the increasing gulf between our educated people and Islam, and directing them toward the right way as well as a first strategy for the establishment of an Islamic system of education.

GOOD BEHAVIOUR TOWARDS PARENTS: THE UPLIFTING OF SOUL

By: ***Faheem Abbas***
faheemhashmi76@yahoo.com

Key Words*: Parents, Good behaviour, uplifting, right.*

Abstract:

According to Quran, we have to go back towards Allah. In other words, our destination is Alam-e-malaqoot. If we want to go towards Alam- e- malaqoot, a spiritual world, we have to first get out of this material world. One of the best ways of getting out of this material world and going towardrs the alam- e -malaqoot is the adoption of good behaviour towards parents and be favorable to them. In this article, being good with parents has been discussed in the light of Quran and the Sunnah. It has been explained in this article that to look at parents with love and affection entails reward from Allah. To pray for parents is also a reward-driven deed. I n Qur'anic prayers, it has been taught to adopt good behaviour towards parents. It is instrumental in the easing off the pain and hardship of death.

THE IMPETUS FOR TERRORISM IN PAKISTAN AND THE STRATEGIC ROLE OF MASS MEDIA

By: Muhammad Riaz

Key Words: *Mass media, 9/11, al Qaeda, terrorism, Habeel and Qabeel.*

Abstract:

Mass media is one of the important weapons in contemporary era. The role of mass media behind the controversial phenomena such as of west versus Islam, degradation of Muslims and Islam, civilizational conflict cannot be undermined. The first incident that provided ground for the primary role of mass media was 9/11. On its war on terror the American media support the US government fully.

In this conjuncture, Pakistani media, especially the electronic one, broke the ice and emerged. Many private TV channels were launched; the number of FM radios increased. Initially, the foundation of these channels were laid down on freedom of expression and it was pledged to make media the fourth pillar of the state. But, later, these two motives got secondary importance and the media industry got stuck in competition. In this article, the strategic role of media has been discussed in four points:

(1) mass media treated terrorism as an item for news instead of tackling it seriously;

(2) instead of focusing on real issues, media became used to exaggerating events;

(3) the critical issue of terrorism became a source of competition;

(4) in mutual competition the code of conduct was sidelined.

THE KINGDOM OF LOVE

By: Dr. Sheikh Muhammad Hasnain
sheikh.hasnain26060@gmail.com

***Key Words**: Kingdom, Love, Utopia, Karbala, Justice, Sacrifice, Love, Imam Hussain, Arbaeen.*

Abstract:

The "kingdom of love" is infact, the 2nd part of the Story published in 26th issue of the Quarterly "Noore Marfat", under the tittle of "The Tour of a Heavenly City". The core theme of the story is the claim that it is quite possible to found a kingdom better than Utopia, based upon "love", rather than so called philosophical "wisdom". This article seeks the characteristics of the social behavior of the citizens of such a kingdom. According to the writer, the citizens of the "Kingdom of love" leave together in a quite brotherhood, tolerance, good will and sacrifice. They remain loyal to the kingdom in each conditions and don't break any law, just because they love their king. So seldom social chaos occurs in the kingdom of love.

Anyhow, only someone can become the king of such a state who is infallible leader like Imam Hussain (A.S), possess the patience of Jesus (A.S) and the courage of Socrates. He is someone who sacrificied all his inheritance for the sack of "The Only Allah", in the desert of kabala, the desert of deep grief and patience and still raised the slogan:

"I agree with thy decision and accept thy command."

So the writer invites the builders of social socity to observe the gathering of 140 million pilgrims in Karbala and Najaf on the occasion of 40th of the month of Safar, the anniversary of martyrdom of Imam Hussain (A.S), so that they may find a transcendent sample of human culture and society superior to Utopia.

سہ ماہی **نور معرفت**

ممبر شپ فارم

نام: _____ تعلیم: _____

پیشہ: _____ فون نمبر: _____

پتہ: _____

_____

E-mail: _____

براہ کرم سال _____ کے لئے نور معرفت میرے نام جاری کر دیجئے۔ شکریہ دستخط خریدار: _____

دفتری استعمال کے لئے

برادر/خواہر _____ کی ممبر شپ برائے سال _____ کی درخواست منظور کرتے ہوئے رجسٹریشن نمبر جاری کر دیا گیا ہے متعلقہ ممبر کو مجلّہ باقاعدگی سے ارسال کیا جائے گا۔

رجسٹریشن نمبر: _____ تاریخ اجراء: _____ ممبر ساز: _____

نوٹ: مجلّہ کا 2015ء کے لئے زرِ سالانہ مبلغ:/500 روپے اور فی شمارہ:/130 روپے ہے۔

خط وکتابت کا پتہ:

سہ ماہی نور معرفت/نوری الہدیٰ مرکز تحقیقات/نور الہدیٰ ٹرسٹ (رجسٹرڈ)

سادات کالونی/بارہ کہو اسلام آباد/فون: 051-2231937

www.nht.org.pk, www.nmt.org.pk

E-mail:noor.marfat@gmail.com

خبر مرگ سننے یا موت کو یاد کرنے کی دعا

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَ آلِہٖ وَ اکْفِنَا طُوْلَ الْاَمَلِ وَ قَصِّرْہُ عَنَّا بِصِدْقِ الْعَمَلِ حَتّٰی لَا نُؤَمِّلَ اسْتِتْمَامَ سَاعَۃٍ بَعْدَ سَاعَۃٍ وَ لَا اسْتِتْمَامَ یَوْمٍ بَعْدَ یَوْمٍ وَ لَا اِتِّصَالَ نَفَسٍ بِنَفَسٍ وَ لَا لُحُوْقَ قَدَمٍ بِقَدَمٍ۔ وَ سَلِّمْنَا مِنْ غُرُوْرِہٖ وَ اٰمِنَّا مِنْ شُرُوْرِہٖ وَانْصِبِ الْمَوْتَ بَیْنَ اَیْدِیْنَا نَصْباً وَلَا تَجْعَلْ ذِکْرَنَا لَہٗ غِبّاً۔ وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ صَالِحِ الْاَعْمَالِ عَمَلاً نَسْتَبْطِئُ مَعَہُ الْمَصِیْرَ اِلَیْکَ وَ نَحْرِصُ لَہٗ عَلٰی وَشْکِ اللِّحَاقِ بِکَ، حَتّٰی یَکُوْنَ الْمَوْتُ مَاْ نَسَنَا الَّذِیْ نَاْنَسُ بِہٖ وَمَاْلَفَنَا الَّذِیْ نَشْتَاقُ اِلَیْہِ وَ حَاَمَّتَنَا الَّتِیْ نُحِبُّ الدُّنُوَّ مِنْھَا ۔ فَاِذَا اَوْرَدْتَّہٗ عَلَیْنَا وَ اَنْزَلْتَہٗ بِنَا فَاَسْعِدْنَا بِہٖ زَآئِرًا وَ اٰنِسْنَا بِہٖ قَادِمًا وَ لَا تُشْقِنَا بِضِیَافَتِہٖ وَ لَا تُخْزِنَا بِزِیَارَتِہٖ، وَاجْعَلْہُ بَابًا مِنْ اَبْوَابِ مَغْفِرَتِکَ وَ مِفْتَاحًا مِنْ مَفَاتِیْحِ رَحْمَتِکَ اَمِتْنَا مُھْتَدِیْنَ غَیْرَ ضَآلِّیْنَ ، طَآئِعِیْنَ غَیْرَ مُسْتَکْرِھِیْنَ تَآئِبِیْنَ غَیْرَ عَاصِیْنَ وَ لَا مُصِرِّیْنَ یَا ضَامِنَ جَزَآءِ الْمُحْسِنِیْنَ وَ مُسْتَصْلِحَ عَمَلِ الْمُفْسِدِیْنَ۔

یعنی : اے اللہ ! محمد اور ان کی آل پر رحمت نازل فرما اور ہمیں طویل امیدوں سے بچائے رکھ اور پر خلوص اعمال کے بجالانے سے دامن امید کو کوتاہ کر دے تا کہ ہم ایک گھڑی کے بعد دوسری سانس کے آنے اور ایک قدم کے بعد دوسرے قدم کے اٹھنے کی آس نہ رکھیں، ہمیں فریب آرزو اور فتنہ امید سے محفوظ ومامون رکھ اور موت کو ہمارا نصب العین قرار دے اور کسی دن بھی ہمیں اس کی یاد سے غافل نہ رہنے دے اور نیک اعمال میں سے ہمیں ایسے عمل خیر کی توفیق دے، جس کے ہوتے ہوئے ہم تیری جانب بازگشت میں دیر محسوس کریں اور جلد سے جلد تیری بارگاہ میں حاضر ہونے کے آرزومند ہوں، اس حد تک موت ہمارے انس کی منزل ہو جائے جس کے ہم مشتاق ہوں اور ایسی عزیز ہو جس کے قرب کو ہم پسند کریں۔ جب تو اس کی ملاقات کو وارد کرے اور ہم پر لا اتارے تو اس کی ملاقات کے ذریعہ ہمیں سعادت مند بنانا اور جب وہ آئے تو ہمیں اس سے مانوس کرنا اور اس کی مہمانی سے ہمیں بد بخت نہ قرار دینا اور نہ اس کی ملاقات سے ہم کو رسوا کرنا۔ اور اسے اپنی مغفرت کے دروازوں میں سے ایک دروازہ اور رحمت کی کنجیوں میں سے ایک کلید قرار دے اور ہمیں اس حالت میں موت آئے کہ ہم ہدایت یافتہ ہوں؛ گمراہ نہ ہوں؛ فرمانبردار ہوں اور (موت سے) نفرت کرنے والے نہ ہوں؛ توبہ گزار ہوں خطاکار اور گناہ پر اصرار کرنے والے نہ ہوں۔ اے نیکوکاروں کے اجر وثواب کا ذمہ لینے والے اور بد کرداروں کے عمل و کردار کی اصلاح کرنے والے۔

(صحیفہ سجادیہ؛ دعا نمبر ۴۰)

DECLARATION NO:7334 ISSN2221-1659

QUARTERLY

RELIGIOUS RESEARCH JOURNAL

NOOR-E-MARFAT

آج مسلمانوں کا المیہ یہ ہے کہ ان کا تعلیمی اور تربیتی نظام، اہداف اور طریقۂ کار، اسلام کے سنہری اصولوں، تعلیمات اور بنیادی تصورات سے ہماہنگ نہیں ہے۔ اور یہی تضاد، ان کے تعلیمی اور تربیتی نظام کی جڑیں کھوکھلی کرنے کا باعث بن رہا ہے۔ آج مسلمان نسل کا ایک بہت بڑا حصّہ مسلمان ممالک میں پائے جانے والے ناقص تعلیمی اور تربیتی نظام کی وجہ سے شکست خوردہ اور احساس کمتری کا شکار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ طبقہ مغربی تعلیم کے ساتھ وہاں کی تہذیب، فلسفۂ حیات اور مبانی کو بھی بعینہٖ قبول کر رہا ہے۔ ذرائع ابلاغ کے اس جدید ترین دور میں ہماری تہذیب، ثقافت اور دینی و انسانی اقدار، مغربی تہذیب کی یلغار کی زد پر ہیں۔

ہماری مزید غفلت ہمیں تہذیبی عالمگیریت (Cultural Globalization) کی سیاست کے بھنور میں ایسا لے ڈوبے گی کہ ہم اپنی تہذیب و ثقافت اور اسلامی شناخت سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔ یہاں سے اسلامی تعلیم و تربیت کے موضوع پر بحث کی ضرورت اور اہمیت کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے اور اسلامی اور مغربی تعلیم و تربیت کے فلسفی مبانی کے باہمی مقایسہ کی اہمیت بھی اجاگر ہو جاتی ہے۔ کیونکہ تاریخی طور پر انسانوں کے لئے کسی بھی چیز کی قدر و قیمت کے جانچنے اور سمجھنے کے لئے موازنہ اور مقایسہ انتہائی اہم اور مؤثر طریقہ شمار ہوتا ہے۔ لہذا یہ عین ممکن ہے کہ ہم اس تطبیقی مطالعہ اور مقایسہ کے ذریعے اپنی تعلیمی اور تربیتی نظام کے انحطاط اور تنزلی کی وجوہات کو بہتر سمجھ پائیں اور ان کی روک تھام کے لئے صحیح سمت میں قدم اٹھا سکیں۔

نور الہدیٰ مرکز تحقیقات، نور الہدیٰ ٹرسٹ، محلہ سادات، بارہ کہو، اسلام آباد

Ph:051-2231937 www.nmt.org.pk|www.nht.org.pk